قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2022 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ذرا یاد کرو قربانی

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اُردو دُنیا

ماہنامہ

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:24،شمارہ:08،اگست 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط والتفات قارئین کے خطوط 5

آزادی کا امرت مہوتسو

تحریک آزادی ہند مختصر اشاریہ ادارہ

جدوجہد آزادی میں اردو صحافت کا کردار اسد رضا 8

آزادی کی جنگ اور روہتاس اے کے علوی 11

1857 کی بغاوت میں اردو اخبارات کا کردار امیر حمزہ 13

تحریک آزادی اور اردو فکشن مسرت 16

تحریک آزادی میں اردو زبان کا کردار عبدالسمیع 18

تحریک آزادی اور اردو شاعری مہر فاطمہ 21

مولانا برکت اللہ بھوپالی غلام علی اخضر 24

تحریک آزادی کا جلی عنوان اردو زبان عقیلہ 28

ادب: زاویے اور جہات

شہر آہن کا شیشہ گر: رونق دکنی سیمابی کرامت علی کرامت 30

منٹو سے تعلق سے بدلتے نظریات محمد نہال افروز 32

اردو تبصروں کا ابتدائی دور راہین شمع 36

اردو میں سنسکرت ادب کے تراجم عادل احسان 41

علی گڑھ تحریک، انجمن پنجاب اور جمالیات دانش کمال 44

ساغر صدیقی کی غزل میں سائنسی عناصر محمد عادل 47

عربی ادبیات

ناصر الدین الاسد فیصل نذیر 50

خصوصی گفتگو

نورالحسنین سے انٹرویو ریشا قمر 52

نگر نگر اردو

سیوان میں اردو غزل کا ارتقائی سفر ارشاد احمد 56

کوٹہ کا علمی و ادبی پس منظر محمد فہیم احمد 61

لعل و گہر

ہندی غزل کا بیباک شاعر: دشینت کمار ایم اے کنول جعفری 64

تنویر احمد علوی بحیثیت شاعر عمران احمد 67

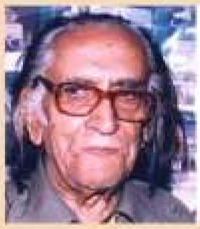

نیا آسماں نئے ستارے

امجد حیدرآبادی کی شعری انفرادیت حارث حمزہ لون 71

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ ادارہ 73

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ ادارہ 83

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 84

ہماری بات

قارئین! اردو محبت کی زبان ہے ۔ اس زبان نے ہر دور میں محبت، اخوت اور بھائی چارے کا پیغام ہی نہیں دیا بلکہ ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کو نئی آواز بھی دی ہے ۔ وطن کی آزادی کی جدو جہد میں اس نے صحافت اور شاعری کے ذریعے عام لوگوں میں وطن سے محبت اور قومیت کا جذبہ بیدار کیا ۔ بہت سے شعرا اور صحافیوں نے کھل کر انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف لکھا ۔ اردو کے مشہور صحافی مولوی محمد باقر کو صرف اس لیے تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا کہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف لکھا تھا ۔ اسی طرح بہت سے صحافیوں اور مجاہدین آزادی کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں ۔ ان لوگوں نے ہر طرح کے مصائب کو برداشت کرنا گوارا کیا لیکن ملک اور مٹی کے تئیں اپنی وفاداری اور ذمے داری پر کبھی آنچ نہیں آنے دی ۔

ہمارا ملک 1947 کو آزاد ہوا لیکن اس کی جدو جہد 1857 سے ہی شروع ہوگئی تھی ۔ برطانوی سامراج کے خلاف صحافیوں نے بیباکانہ انداز میں لکھا اور جذبۂ حریت کی کھل کر حمایت کی ۔ ظفر علی خاں نے 'زمیندار' مولانا حسرت موہانی نے 'اردوئے معلی' مولانا محمد علی جوہر نے 'ہمدرد' اور مولانا ابوالکلام آزاد نے 'الہلال' کے علاوہ اردو کے دوسرے صحافیوں نے اپنے اخبارات کے ذریعہ جدو جہد آزادی کی حمایت کی ۔ ان کے اخبارات کو حکومت وقت نے بند کر دیا اور ان لوگوں پر بے انتہا ظلم و ستم کیے ۔

اردو کے بہت سے شاعروں نے حب الوطنی کا جذبہ جگانے کے لیے نظمیں تحریر کیں ۔ بسمل عظیم آبادی کا یہ شعر

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے   دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بہت مشہور ہوا اور ہر ہندوستانی کے دل و دماغ پر اس شعر نے مثبت اثرات ڈالے ۔ اس شعر کو سنتے ہی ہمارے دلوں میں وطن کی محبت اور اس کی عزت و حرمت کے لیے سب کچھ نچھاور کرنے کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے ۔

سیماب اکبرآبادی نے وطن کی محبت کے نغمے گائے ہیں ۔

وطن پیارے وطن تیری محبت جزو ایماں ہے   تو جیسا ہے، تو جو کچھ ہے سکون دل کا ساماں ہے
وطن میں مجھ کو جینا ہے وطن میں مجھ کو مرنا ہے   وطن پر زندگی کو ایک دن قربان ہونا ہے

اپنے وطن سے محبت کا جذبہ اردو شاعروں میں اس قدر تھا کہ یہ شعر بھی اسی زبان میں کہا گیا ۔

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت   میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

اردو نے جس طرح ملک کی آزادی کی جدو جہد میں اہم کردار ادا کیا اسی طرح آزادی کے بعد بھی اس زبان نے اتحاد، یکجہتی اور گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے ۔ اردو زبان کے سرمائے پر اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس کا اکثر حصہ وطنیت، محبت، بھائی چارہ اور قومی بیداری پر مشتمل ہے ۔ اردو زبان نے آزادی کے حوالے سے جو زریں کارنامہ انجام دیا ہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے ۔

ملک کی آزادی میں تمام طبقات کا اہم کردار رہا ہے ۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی علاقہ ہو جہاں کے لوگوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ نہ لیا ہو ۔ بہت سے گمنام علاقوں خاص طور پر قصبات و قریات میں مجاہدین کی بڑی تعداد رہی ہے مگر ان کا ذکر تاریخ آزادی ہند کے ضمن میں کم ہی آتا ہے ۔ ضرورت ہے کہ آزادی کے 75 ویں برس پر ان گمنام مجاہدین آزادی کو بھی یاد کیا جائے جن کی قربانیوں کو ہم فراموش کرتے جا رہے ہیں ۔ انھوں نے قربانیاں نہ دی ہوتیں تو شاید ہم آزادی جیسی بڑی نعمت سے محروم رہتے ۔

تحریک آزادیِ ہند کے تعلق سے دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی بیش بہا سرمایہ ہے ۔ 'اردو دنیا' کے اس شمارے میں آزادیِ ہند سے متعلق اہم علمی دستاویز کا ایک مختصر اشاریہ بھی شائع کیا جا رہا ہے ۔ ہمیں اپنے ملک کی تہذیب و تاریخ سے واقفیت کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے ۔ تحریک آزادیِ ہند سے متعلق بہت سے اہم گوشے ہیں جن پر آئندہ شماروں میں مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا ۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ اردو دنیا جون کا شمارہ ہاتھوں میں آیا تو بے حد خوشی ہوئی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے واقعی اس کی آبیاری جس جانفشانی سے کی ہے اس کا اندازہ اس کے مضامین کو پڑھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ میں کافی دنوں سے اردو دنیا کا مطالعہ کرتی رہی ہوں اس کے متعلق میرا ربط والتفات کافی پرانا ہے ہاں اگرچہ میں نے اب سے پہلے اپنے اس تعلق کی کیفیت کو باقاعدہ تحریری زبان نہیں دی تھی آج میں اپنے ان خیالات کو بیان کرنے جا رہی ہوں جو اس ماہنامہ کے حوالے سے میرے اندر جذبات کی صورت موجزن ہیں۔

میں اس کا آغاز شیخ عقیل احمد کی اس بات سے کرنا چاہوں گی جو انھوں نے اپنی بات کے ضمن میں اسی شمارے میں لکھا ہے ''ادبی رسائل کی حیثیت ایک روزن کی سی ہوتی ہے نئی معلومات، انکشافات، ایجادات، تحقیقات، علوم وادبیات وغیرہ کے سارے سلسلے اس کھڑکی سے قاری کے ذہن کا حصہ بنتے ہیں اور ان کے شعور وآگہی کو متحرک و مہمیز کرتے ہیں یہ رسائل دراصل ایک سمت نما کی حیثیت رکھتے ہیں جو قاری کو مختلف ادبی جزیروں اور زاویوں سے روبرو کراتے ہیں۔''

بیشک انھوں نے یہ بات صد فیصد درست کہی ہے کہ ادبی رسائل قاری کے ذہن و دل کی نشوونما میں ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں اس سے وہ نہ صرف زبان وقواعد کو بہتر بناتے ہیں بلکہ ذوق کی تعمیر وتشکیل میں بھی مدد لیتے ہیں اور اس کے ذریعے ایک قلمکار اپنے خیالات ونظریات کو اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے اور اپنی جداگانہ سوچوں سے دنیا کو متعارف کرواتا ہے۔ اگر گہرائی سے اردو دنیا کے معیار کا تجزیہ کیا جائے تو ہم یہ کہنے میں شاید غلط نہیں ہوں گے کہ رسالہ اردو دنیا قاری کو ایک ایسی دنیا فراہم کرتا ہے جو درج بالا مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے اور اردو زبان کو اس کے اعلی ادبی معیار کے ساتھ فروغ بھی دے رہا ہے اور ایسا بالکل بھی نہیں ہے کہ اس کے تمام مشمولات صرف ادب اور ادبی عروج وزوال سے متعلق ہوتے ہیں بلکہ یہ وقت کی تبدیلیوں کو قبول کرتے ہوئے ہر طرح کی ایجادات وضروریات جو کہ انسانی زندگی سے وابستہ ہیں ان موضوعات کو وہ اپنے صفحات میں جگہ دیتا ہے اور جب کسی بھی تحریک یا کوشش کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا جاتا ہے تو اس کا عوام کے درمیان قبولیت حاصل کرنا بالکل فطری ہے اردو دنیا کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔

اس شمارے کا سب سے پہلا مضمون زبان کو زندہ رکھنے کے لیے جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے کے نام سے لکھا گیا ہے جس کو مشتاق احمد گنائی نے لکھا ہے جس کو پڑھ کر ان کے چشم کشا نظریات وخیالات کا علم ہوتا ہے انھوں نے اردو ادب کی بقا کی راہ میں درپیش مسائل اور اس کے سد باب کو بھی بیان کیا ہے جسے پڑھ کر خوشی محسوس ہوئی اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

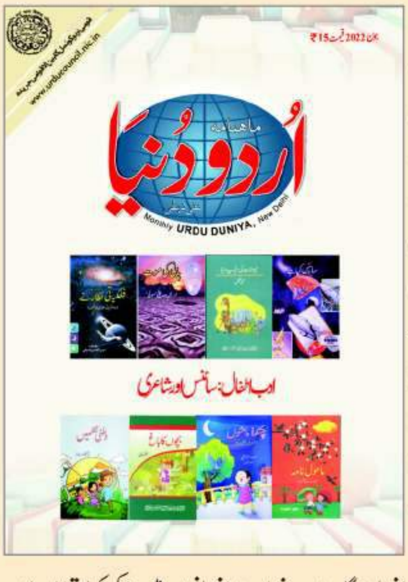

خواتین افسانہ نگار انیسویں صدی کے نصف آخر سے مضمون میں حنا افشاں نے بڑی حد تک عورتوں کے حال زار کی ترجمانی کی ہے جس کا کہ اس عہد سے تعلق رکھنے والی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ذکر کیا تھا اور ان افسانہ نگاروں نے کس طرح نسائی جذبات کو سمجھا اور اسے لفظوں کا پیراہن عطا کیا ان تمام پہلوؤں کو انھوں نے اپنے مضمون میں بیان کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ سفرنامے پڑھ کر کہیں نہ کہیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم تصورات میں بذات خود اس کی سیر کر رہے ہیں مجھے سفرنامہ پڑھنا کافی اچھا لگتا ہے اس شمارے میں جب علامہ سید سلیمان ندوی کے سفرناموں پر ایک نظر کے عنوان سے لکھے گئے مضمون، پر نظر پڑی تو لگا کہ ضرور اس میں میرے لیے بہت کچھ لکھا گیا ہوگا طلحہ نعمت ندوی نے اس مضمون میں علامہ سید سلیمان ندوی کے سفرنامے کی ہیئت پر جس طرح سے واضح الفاظ میں لکھا ہے پڑھ کر بہت اچھا محسوس ہوا اور بیان کی گئی تفصیلات سے کافی کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

اس شمارے میں شائع اگر تمام مضامین کا ذکر کیا جائے تو طوالت کا اندیشہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ مختصر البیانی کے ساتھ اس کے تمام زاویوں کو اپنے لفظوں میں سمیٹنے کی کوشش کروں اس شمارے میں ادب اطفال سے متعلق کئی مضامین شائع ہوئے جس میں سے ہر ایک اپنی جگہ مختلف زاویوں کی عکاسی کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ میں خود

بچوں کے اعلی ادب کے تخلیق کیے جانے کی قائل ہوں جس پر ہمارے یہاں اس طرح کام نہیں کیا جارہا جیسا کہ یہ شعبہ مستحق ہے اگر بچوں کی بچپن سے ہی ذہن سازی کی جائے تو بڑے ہوکران کو معاشرے میں تعمیری کردارادا کرنے میں آسانی ہوتی ہے کیوں کہ ہر دور کے بچے بعد کے آنے والے دور میں قائد اور مصلح کی ذمے داری ادا کرتے ہیں ہمیں بچوں کی شخصیت اوراس کی تربیت کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یہ شیوۂ تغافل ایک ایسا خلا پیدا کرسکتا ہے جس کی تلافی مستقبل کے لیے ایک مسئلہ بن سکتی ہے۔

بچوں میں سائنسی رجحان پیدا کرنے کے لیےاور سائنسی ذہن رکھنے والے بچوں کے لیے ضروری ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو سائنسی حقائق کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہو جو عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ آسان قواعد و بلاغت کے تحت لکھے گئے ہوں تا کہ ادب تخلیق کرنے کا مقصد فوت نہ ہو سکے اور بچے اس سے اپنے رجحان ومیلان کی تسکین کرسکیں۔

ورق گردانی کے دوران نظر یوسف ناظم جہان طنز ومزاح کا لا ثانی ناظم مضمون پر پڑی جس کو قیصر الحق صاحب نے لکھا ہے پڑھ کر یوسف ناظم صاحب کو بطور مزاح نگار جاننے کا موقع ملا اوران کے مزاح کے بنیادی نکات کو بھی سمجھنے کا موقع ملا

جون کے شمارے کے سارے ہی مضامین اپنی جگہ بہترین ادب تخلیق کرنے کی کوشش کے تحت لکھے گئے ہیں چاہے طارق جمیلی، انگریزی شاعری کے منظوم اردو تراجم ہو یا افسانہ نگار ناقد اختر اور ینوی پر لکھا گیا مضمون ہو... اعلی ادب کی تعمیر وتشکیل کے لیے اردو دنیا کی کی جانے والی یہ کوششیں قابل مبارکباد ہیں۔ دعا ہے کہ یہ ادارہ دنیا کے گوشے گوشے میں اردو چراغ کو روشن کرنے میں کامیاب رہے اور اردو دنیا کی تابانی وقت کے ساتھ مزید بڑھتی ہی رہے۔

علیزیے نجف: سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی

ماہنامہ اردو دنیا جون کا شمارہ پڑھنے کا موقع ملا۔ ہر بار کی طرح معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ، علم سے مزین ہے۔ دو مہینے پہلے ایڈیٹر صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ آپ Brain Drain کے نام پر کچھ مضامین لے کر آئیے۔ میں ایک نوجوان ہونے کے ناطے یہ دیکھ کر دھنگ رہ جاتا ہوں کہ آخر اس عمل پر روک تھام کب ہوگی۔ کیوں اعلیٰ اقسام کے دماغ ہمارے ملک سے باہر پڑھنے جاتے ہیں۔ کیا ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہم ایسا ماحول ترتیب دیں جس میں اعلیٰ تعلیم کی گنجائش ہو اور یہ دولت باہر جانے سے بچ جائے؟

سید مصطفیٰ احمد: مدرس حسینی پبلک اسکول، خوشی پورہ، ایچ ایم ٹی، سرینگر، کشمیر

سرورق پر کتابوں کی تصویر ہے سائنس کیا ہے، حیوانات کی دلچسپ دنیا، پانی کی موت، فلکیاتی نظارے، ادب اطفال سائنس اور شاعری کی کتابیں، ماحول نامہ، چندا ماموں، بچوں کا باغ، وطنی نظمیں، کتابوں کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ مدیر شیخ عقیل احمد نے ہماری بات میں ادبی رسائل کی اہمیت وعظمت پر روشنی ڈالی ہے۔ رسائل کا کردار ہمیشہ سے حرکیاتی رہا ہے۔ زبان وادب کو بے شمار فائدے ادبی رسائل سے پہنچے ہیں۔ آج بھی رسائل کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

اس شمارے میں مشتاق احمد گنائی نے اپنے مضمون میں کہا کہ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ٹکنالوجی سے استفادہ کرنا چاہیے، کہ انٹرویو میں کہا گیا ہے اردو زبان کا مستقبل تابناک ہوگا، لیکن حالات مجموعی حیثیت سے مایوس کن ہوتے جارہے ہیں۔ عبدالحق نے اپنے مضمون '1857 کے چند اردو ماخذ' میں 1857 کے واقعات وحالات پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض اہم تاریخی حقائق کا انکشاف ہوا ہے۔ 1857 تا 1947 تاریخ لکھنا باقی ہے۔ مورخین خاموش ہیں۔ ابرار احمد اجراوی نے 'پروفیسر لطف الرحمٰن مشرقی اقدار سے آشنا تنقید نگار' میں ان کی شاعری اور تنقید پر اظہار خیال کیا ہے۔ حنا افشاں نے 'خواتین افسانہ نگار انیسویں صدی کے نصف آخر سے' میں خواتین کی فکشن خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ سرفراز جاوید نے 'کلام نجم الدین شاہ مبارک آبرو'، 'سید سلیمان ندوی کے سفرناموں پر ایک نظر' میں طلحہ نعمت ندوی نے تجزیاتی محاکمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ رضاء الرحمٰن عاکف، آفتاب عالم وغیرہ کے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس رسالے کی اہم خوبی مضامین کی نوعیت ہے جو ایک قاری کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

اس بار کے اداریے 'ہماری بات' میں زبان واملا کی ایک غلطی عجلت میں چلی گئی ہے۔ اسی شمارے میں اس ناچیز کے شائع مراسلے میں 'وجوہات' جمع لفظ کی بجائے صحیح الفاظ 'کے وجوہ' درج کرنا درکار تھا۔ بطور ایک شاعر، ناقد وصحافی جناب سید نفیس دسنوی نے اپنے اعلیٰ وارفع مضمون میں تنقید نگاری کے فن کے محاسن رقم کیے ہیں۔ اس کے تحت حالی سے لے کر پروفیسر کرامت علی کرامت وغیرہ اور مغربی ناقدین میں ٹی ایس ایلیٹ کی تحقیقی، اصولی اور عملی تنقیدی صفات کو بھی بخوبی نشان زد کیا گیا ہے۔ صفحہ 8 پر 'اردو ادب میں غلطی سے مروجہ 'معرکۃ الآرا' لفظ کا تصرف متنازعہ فیہ ہے۔

'معرکۃ الآرا' لفظ (حالانکہ اردو ادب میں یہ غلطی سے مروج ہو چکا ہے)، اس میں 'معرکۃ' میں 'ال' جمع عربی زبان کا لفظ ہے، جب کہ 'آرا' فارسی زبان کا ہے، جو کہ 'آراستن' مصدر سے بنا ہے، جس کا معنی ہے: سجانے یا 'آراستہ کرنے والا ہے۔ اس لفظ میں 'آرا' پر 'ال' لگانا خلافِ اردو قواعد ہے۔ صحیح لفظ 'معرکہ آرا' ہے، یعنی زبردست، پُرزور۔ اسی لاحقے کی دیگر مثالوں میں بزم آرا، حسن آرا، صف آرا، تبسم آرا الفاظ اکثر مستعمل ہوا کرتے ہیں۔'' (پروفیسر غازی علم الدین، مضمون 'غلطی ہائے مضامین: لسانی سیاحت'، ایک فراموش شدہ جریدہ، ص 12)

نفیس دسنوی صاحب کے مقالے میں ص 8 پر اول کالم میں 'اپنے' (تنقید) کی بجائے 'اپنی' صفت لفظ کا استعمال درکار تھا۔ اسی صفحے پر تیسرے کالم کے 'تحت' کی تجزیہ الفاظ کی جگہ 'کے تجزیہ' الفاظ چاہیے تھے۔ اسی پیرا میں آگے 'اپنی بات کو.... کہی جائے' کی بجائے یا تو 'کو' لفظ کو فالتو مان کر ہٹا دیا جائے یا پھر 'کہا جائے' لکھنا درکار تھا۔

جناب رئیس احمد فراہی نے اپنے موقر مضمون میں امروہے کے شہرۂ آفاق شاعر مصحفی کی شاعری کا ایک لاجواب تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس میں اس شاعر کی شاعری پر مولانا محمد حسین آزاد کے امروہے پن کے لگائے غلط الزام کی تلافی نثار احمد فاروقی کی تشریح وجواز سے بخوبی کی گئی ہے۔ مصحفی کی شاعری میں ان کی زبان کی سلاست و نفاست پے در پے منعکس ہوا کرتی ہے، مثلاً ان کا یہ شعر دیدنی ہے:۔''تیرے کوچے اِس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا/کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا۔'' ص 15 پر محولہ چوتھے اور آخری شعر میں 'نگھرے' صفت لفظ کا تصرف نہایت ہی خوبصورت ہے۔ پنجابی زبان کے صوفی کوی بابا فرید نے بھی اپنے ایک سلوک میں انسان کو قبر کی جانب کنایہ کرتے ہوئے یوں مخاطب کیا تھا:۔''اے نگھرے منگھ، آ اپنے گھری آجا۔''

اسی شمارے میں 'اردو صحافت میں زبان کا استعمال' جیسے نایاب موضوع پر جناب محمد حنیف خان کا اعلیٰ وارفع مضمون لائق صد ستائش ہے۔ اردو اخبارات میں زبان کا کس طرح لاپروائی اور بے التفاتی کے ساتھ استعمال ہوا کرتا ہے، اس کی اچھی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

کلی طور پر یہ شمارہ عمیق و دقیق مطالعے سے لبریز مضامین کو شامل کیے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاؤک: کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

تحریک آزادی ہند کے متعلق کتابیں

مختصر اشاریہ

1 آزادی کا سفر 1857 تا1947: سردار محمد اکرم بٹر صاحب، المدینہ لائبریری ٹیم
2 آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی: غلام حیدر، نیوڈیر آرٹ پرنٹرس، نئی دہلی 1987
3 آزادی کی نظمیں: سبط حسن، لکھنؤ1940
4 آزادئ ہند کی جدوجہد میں مسلمانوں کا کردار (1857 تا1947): پروفیسر رفاقت علی خاں، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی
5 آزادئ ہند: مولانا ابوالکلام آزاد، مکتبہ جمال، لاہور 2003
6 اٹھارہ سوستاون: سریندر ناتھ سین: خورشیدہ پروین، پبلی کیشن ڈویژن
7 اٹھارہ سوستاون کی جنگ آزادی: سریندر ناتھ سین، پبلی کیشن ڈویژن
8 اسباب بغاوت ہند: سرسید احمد خاں، مفید عام پریس، آگرہ 1903
9 انقلاب 1857: پی سی جوشی، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی 1972
10 اردو صحافت اور تحریک آزادی: ڈاکٹر سمیع احمد، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2009
11 بہادر شاہ ظفر اور اس کا عہد: رئیس احمد جعفری 1956
12 بہادر شاہ ظفر: امیر احمد علوی، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ 1955
13 بہادر شاہ ظفر کے فرامین، 1857 اخبارات وصحافت، ادارہ مطبوعات، کراچی 1957
14 بہادر شاہ ظفر: اسلم پرویز
15 تاریخ جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: خورشید مصطفیٰ رضوی، الجمعیہ پریس 1959
16 تاریخ بغاوت ہند: مکندلال، مفید خلائق، آگرہ 1860
17 تاریخ تحریک آزادئ ہند: تاراچند، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1985
18 تحریک آزادئ ہند اور مسلمان: سید ابوالاعلی مودودی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ
19 تحریک آزادئ ہند اور مسلمان: محمد احمد صدیقی
20 تحریک آزادی اور اردو نثر: ضیاء الرحمٰن صدیقی، مولانا آزاد پبلیکیشن، جودھپور، راجستھان 2014
21 تحریک آزادی اردو نثر اور مسلم ادبا: ضیاء الرحمٰن صدیقی، راجستھان وقف بورڈ، راجستھان 1997
22 تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ: مصنف و ناشر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن 2003
23 تحریک آزادی میں اردو کا حصہ: معین الدین عقیل، انجمن ترقی اردو 1976
24 تحریک آزادی میں اردو کا حصہ: ناشر نقوی، ہریانہ اردو اکیڈمی، ہریانہ 1988
25 تحریک آزادئ ہند میں مسلم علما اور عوام کا کردار: محمد سلمان منصور پوری، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
26 تحریک آزادئ ہند اور السواد الاعظم: پروفیسر ڈاکٹر محمد سعود احمد، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
27 تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ: مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی
28 جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار: مرتضی اقبال، یوپی ورکنگ جرنلسٹ یونین 2009
29 جنگ آزادی اور انقلابی مجاہدین: ماسٹر رام ناتھ شرما، فریڈم فائٹر میموریل کمیٹی
30 جنگ آزادی اور شعراء ہریانہ: پروفیسر کے سی یادو، ہریانہ اردو اکیڈمی 1991
31 جنگ آزادی کے اردو شعرا: ڈاکٹر محمود الرحمٰن، قومی ادارہ برائے تحقیقات تاریخ وثقافت 1986
32 جنگ آزادی 1857 واقعات وشخصیات: ڈاکٹر محمد ایوب قادری، دار الکتاب
33 جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین، عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی، اعلی پریس، دہلی 1975
34 جہات جہد آزادی: ڈاکٹر معین الدین عقیل، الوقار پبلی کیشنز 1998
35 جنگ آزادی 1857 میں علما کا مجاہدانہ کردار: عطاء الرحمٰن نوری، مکتبہ طیبہ، مالیگاؤں
36 جنگ آزادی 1857 کا مجاہد شاعر (میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی): ڈاکٹر توصیف تبسم، نیشنل بک فاؤنڈیشن
37 جنگ آزادی میں بہار کا حصہ: ضیاء الرحمٰن غوثی، 1979، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی
38 داستان غدر: ظہیر دہلوی، مطبع کریمی، لاہور 1911
39 دہلی اور آزادی: دھرمیندر ناتھ، مترجم انیس مرزا، اردو اکادمی، دہلی 2011
40 علامہ اقبال اور آزادئ ہند: پروفیسر عمر حیات خاں غوری، ذکری انٹرنیشنل پبلی کیشنز، دہلی
41 غدر دہلی کے اخبار: خواجہ حسن نظامی، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی 1923
42 غدر کا نتیجہ: خواجہ حسن نظامی، محبوب المطابع، دہلی 1930
43 غدر کی ادبی تاریخ کا ایک ورق: خواجہ احمد فاروقی، نقوش، شمارہ 20-19
44 غدر کی صبح وشام: خواجہ حسن نظامی، دہلی پریس، دہلی 1926
45 غدر کے چند علما: انتظام اللہ شہابی، نیا کتاب گھر، دہلی
46 قومی محاذ آزادی مسلم شعرائے اتر پردیش: پروفیسر عابدہ سمیع الدین
47 قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان صحافی: پروفیسر عابدہ سمیع الدین
48 قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان: پروفیسر عابدہ سمیع الدین
49 گمنام مجاہد آزادی: شیر علی خاں آفریدی: ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی علیگ، کہکشاں گرافکس، نئی دہلی، 2021
50 لکھنؤ اور جنگ آزادی: ادبی اکیڈمی، لکھنؤ 1957
51 لہو بولتا بھی ہے: سید شاہنواز قادری، کرشن کلکی
52 مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ: عبدالوحید خاں، یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ 1938
53 مسلمانوں کی جدوجہد آزادی: ڈاکٹر معین الدین عقیل، تعمیر انسانیت 1982
54 مسلمانوں کی جدوجہد آزادی، مسائل، افکار اور تحریکات: ڈاکٹر معین الدین عقیل، مکتبہ تعمیر انسانیت
55 مسلم مجاہدین آزادی اور تحریک آزادی میں ان کی خدمات: سید عبید الرحمٰن، گلوبل میڈیا پبلی کیشنز
56 مشاہیر جنگ آزادی: مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، تاجران کتب محمد سعید اینڈ سنز 1956
57 مولانا محمد علی اور جنگ آزادی، ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی، رام پور رضا لائبریری، یوپی 1998
58 ہماری تحریک آزادی اور تخلیقی عمل (سجاد ظہیر کی سیاسی اور ادبی تحریریں تقسیم ہند سے قبل)، احمد سلیم 2007
59 ہمارے مجاہدین آزادی: ضیاء الرحمٰن غوثی، دار التصنیف والتالیف، سمستی پور بہار، 2021
60 ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی قربانیاں: زین العابدین خاں، شوبی آفسیٹ پریس، دہلی 2015
61 ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ: ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی، انجمن ترقی اردو 2008
62 ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ: ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ 1990
63 ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی 1857 میں مسلمانوں کا حصہ: مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ 2008
64 ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری: گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2003
65 ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نظر: ڈاکٹر درخشاں تاجور
66 ہندوستان کی جنگ آزادی امر شہیدوں کی سچی کہانیاں: میوارام گپت، ادارہ شہیدان وطن پرکاشن، بمبئی 1981
67 ہندوستان کی جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین: میوارام گپت، ادارہ شہیدان وطن پرکاشن، بمبئی 1988
68 ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ: پروفیسر عابدہ سمیع الدین
69 ہندوستان کی تحریک آزادی: نین تارا سہگل، این سی ای آر ٹی، دہلی 1973
70 ہنگامۂ سن ستاون اور غالب کا جذبۂ حب الوطنی: گوپی چند نارنگ، صحیفہ، لاہور، اپریل 1970
71 1857 پہلی جنگ آزادی، واقعات وحقائق: میاں محمد شفیع، مکتبہ جمال پبلیکیشنز
72 1857 کی جنگ آزادی کا درخشاں باب: ابرار رحمانی، پبلی کیشن ڈویژن

جدوجہد آزادی میں اردو صحافت کا کردار

اسد رضا

اردوصحافت کی 200ویں سالگرہ سارے ہندوستان میں زور شور سے منائی جارہی ہے۔ اس موقع پر جدوجہد آزادی میں اردوصحافت کے کردار پر روشنی ڈالنا بے حد ضروری ہے۔ اردوصحافت نے انیسویں صدی میں بھی جذبۂ حریت کو اُبھارا اور 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں دہلی اردو اخبار اور دیگر اردو اخبارات نے انگریزوں کے خلاف غلام ہندوستانیوں کو لام بند کرنے میں اہم رول ادا کیا لیکن بدقسمتی سے یہ جنگ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکی لیکن اکثر اردو اخبارات نے انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی اپنی عادت نہیں بدلی۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں 1901 تا 1947 تک اردو کے بیشتر اخبارات تحریک آزادی میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرتے رہے۔ مولانا ظفرعلی خاں کا روزنامہ 'زمیندار'، مولانا حسرت موہانی کا رسالہ 'اردوئے معلّٰی'، بابو دینا ناتھ کا ہفت روزہ 'ہندوستان'، شانتی نارائن بھٹناگر کا ہفت روزہ 'سوراجیہ'، مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبارات 'الہلال' اور 'البلاغ'، مولانا محمد علی جوہر کا روزنامہ 'ہمدرد'، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا روزنامہ 'ہند'، لالہ لاجپت رائے کا 'وندے ماترم'، مہاشے کرشن کا 'پرتاپ'، سوامی پرکاش آنند کا روزنامہ 'بھیشم' اور 'ویر بھارت' وغیرہ جیسے انقلابی اور وطن پرست اخبارات ورسائل ہندوستانیوں کے دلوں میں تحریک آزادی کی لہر پیدا کرتے رہے۔ 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ اردوصحافت ہی کی دین ہے۔ اسی طرح مجاہدین آزادی نے اردو کا یہ شعر پڑھ کر ہی تختۂ دار کو چوما۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

دراصل تحریک آزادی میں اردوصحافت نے قائدانہ کردار ادا کیا کیونکہ یہ گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کی زبان تھی۔ وہ اردو صحافی مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی جنھوں نے اپنے اخبارات، مضامین اور اداریوں سے ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی شمع روشن کی۔ بیسویں صدی کی اولین پانچ دہائیوں میں اردوصحافت نے کس طرح تحریک آزادی میں نئی جان ڈالی، اس کا جائزہ ہم ہر دہائی میں نکلنے والے اخبارات ورسائل کے تذکرے سے کریں گے۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی یعنی 1901 تا 1910 میں بابو دینا ناتھ نے ہفت روزہ 'ہندوستان' جاری کیا تھا جس میں اس وقت کے تمام مجاہدین آزادی کے جذبۂ حب الوطنی سے لبریز مضامین اور اداریے شائع ہوتے تھے۔ انگریزی سرکار کے ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے میں یہ اخبار پیش پیش تھا۔ لہٰذا انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوا۔ 1903 میں مولانا حسرت موہانی نے 'اردوئے معلّٰی' جاری کیا۔ یہ ملک کا پہلا جریدہ تھا جس نے سب سے پہلے انگریزوں سے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ چونکہ مولانا بیباک صحافی تھے لہٰذا انھیں جیل کی سزا بھی کئی بار کاٹنی پڑی اور انگریز سرکار نے 'اردوئے معلّٰی' کو بھی کئی بار بند کیا، اُس کی ضمانت ضبط کی اور ایڈیٹر حسرت موہانی کو سزائیں دیں۔ 1907 میں الٰہ آباد سے بابو شانتی نرائن بھٹناگر نے انقلابی اخبار 'سوراجیہ' نکالا۔ لیکن برطانوی سرکار کے خلاف ایک مضمون شائع کرنے کے الزام میں بھٹناگر صاحب کو دوسال کی سزائے قید دی گئی اور 500 روپے کا جرمانہ کیا گیا۔ اس اخبار کے دوسرے مدیر بابو ہری داس کو بھی انگریز سرکار نے سخت سزا دی۔ سوراجیہ کے تیسرے مدیر نند گوپال داس کو دس سال کی سزائے قید سنائی گئی۔ چوتھے مدیر لدھا رام کو دس سال کے لیے کالا پانی بھیجنے کی سزا دی گئی۔ بالآخر فرنگی حکومت نے تحریک آزادی کے اس ترجمان اخبار 'سوراجیہ' کو بالجبر بند ہی کرادیا۔ 1907 میں ہی بشن نرائن آزاد نے 'آزاد' نام سے ایک اخبار جاری کیا جو فرنگی سرکار کے ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرتا تھا۔ جنوری 1907 میں اس اخبار نے لکھا 'گورنمنٹ کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جتنی سختیاں ہم پہ کی جائیں گی اُتنی ہی نفرت گوروں کے لیے ہمارے دل میں بڑھے گی۔ قومی شہیدوں کے خون کے ایک ایک قطرہ سے ہزار ہزار جاں نثار پیدا ہوں گے۔ قید ہمارے لیے فردوس سے کم نہیں کیونکہ ہم قوم کے لیے صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ قید کی تکلیفیں ہمارے لیے راحت ہیں۔" (نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی، رسالہ 'آزاد'، جنوری 1907، ص 1)

اس پہلی دہائی میں اردو کے دیگر اخبارات وجرائد نے بھی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور صحافیوں نے قید و بند کی صعوبتیں اور ایذائیں برداشت کیں۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی یعنی 1911 تا 1920 میں تو اردوصحافت نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا مجید حسن اور مولانا ظفرعلی خاں وغیرہ جیسے مجاہدین آزادی صحافی اور 'الہلال'، 'البلاغ'، 'ہمدرد'، 'مدینہ' اور 'زمیندار' جیسے عہد ساز اور جذبۂ حریت سے سرشار اخبارات دیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے 13/جولائی 1912 کو اپنا اخبار 'الہلال' جو ہفت روزہ تھا نکالا۔ اس دہائی میں اردو صحافت انقلابی ہوگئی تھی۔ 'الہلال' اور خود مولانا آزاد انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بننے لگے کیونکہ وہ اپنے اخبار میں انگریز حکومت کے جبر واستبداد اور استحصال کی پُرزور مخالفت کررہے تھے اور ان کا لہجہ سخت تھا۔ لہٰذا برطانوی حکومت نے مولانا سے 8/ستمبر 1913 کو پہلی بار دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ لیکن مولانا اپنی تحریروں اور اخبار کے ذریعے جدوجہد آزادی کو نئی توانائی عطا کرتے رہے۔ جب وہ اور ان کا حریت پسند قلم راہ جدوجہد سے نہیں ہٹے تو مولانا کے اخبار سے 16/نومبر 1916 کو دس ہزار کی ضمانت دینے سے انکار کردیا تو 'الہلال' کی پریس ضبط کرلی گئی اور یہ اخبار بند ہوگیا۔ لیکن مجاہد آزادی کا قلم کہاں رکنے والا تھا۔ لہٰذا انقلاب آفریں مولانا آزاد نے ایک نیا اخبار نکالنے کا منصوبہ بنایا اور 'البلاغ' کے نام سے مولانا نے ایک دوسرا ہفت روزہ اخبار 15/نومبر 1915 کو جاری کیا۔ لیکن اس اخبار کے تیور بھی انقلابی اور مجاہدانہ تھے۔ اس اخبار کا ہر مضمون عوام کے جوش آزادی میں اضافہ کرنے والا تھا۔ لہٰذا انگریز سرکار نے پھر جبر کا

مظاہرہ کیا لیکن اخبار کو بند کرنے کی بجائے خود مجاہد آزادی مولانا آزاد کو ہی نظر بند کردیا۔ ان پر کئی طرح کے الزامات عائد کیے گئے۔ اسی دوران انھیں کچھ رہائی ملی تو مولانا نے یکم جون 1927 کو پھر سے 'الہلال' کی اشاعت شروع کردی۔ لیکن آزادی کی حمایت، فرنگی سرکار کے ظلم وستم کی مخالفت پر جوش مضامین اور سچی خبروں کی وجہ سے چھ مہینے بعد ہی انگریزوں نے 'الہلال' کو 9/ستمبر 1927 کو مستقل طور پر بند کرادیا۔ جذبۂ حریت سے سرشار اپنی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد کو تقریباً چھ بار جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ انھیں مختلف برسوں میں انگریزوں نے مختلف شہروں کی جیلوں میں قید رکھا۔

مولانا مجید حسن کا لفت روزہ اخبار 'مدینہ' نے بھی بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستانیوں کو تحریک آزادی میں شمولیت کی ترغیب دی۔ انگریزوں کے جبر وتشدد کی اس اخبار نے جب سختی سے مخالفت شروع کی تو یہ اخبار بھی انگریز سرکار کے عتاب کا نشانہ بنا۔ چونکہ اس اخبار میں اکبر الہ آبادی، مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور علامہ اقبال جیسے صحافی وانقلابی ادیب وشاعر لکھتے تھے۔ لہٰذا فرنگی سرکار نے اس اخبار کے پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کردی۔ اس صورت حال میں اخبار کا نام 17/اگست 1919 کو 'یثرب' کردیا گیا۔ مگر یہ بھی جلد ہی پابندی کا نشانہ بن کر بند ہوگیا۔ بعدازاں یہ اخبار ایک بار پھر 'مدینہ' کے نام سے جاری ہوا۔ جنوری 1917 میں یہ سہ روزہ پھر بند ہوگیا۔ تاہم اس اخبار نے تحریک آزادی کو مہمیز دینے میں قابل قدر رول ادا کیا۔

یہاں یہ تذکرہ بھی برمحل ہوگا کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اردو صحافت کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی تھی کہ اسی دہائی میں پہلی عالمی جنگ 28/جولائی 1914 کو شروع ہوئی جو 11/نومبر 1918 کو بند ہوگئی۔ انگریزوں کی ہندوستانی حکومت بھی اس جنگ میں شامل تھی اور انھوں نے ہندوستانی فوجیوں کو بھی اس جنگ میں جھونک دیا تھا جس کی مخالفت 'زمیندار'، 'ہمدرد' اور دیگر اردو اخبارات نے کی۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ بھی اسی دہائی میں ہوا۔ چونکہ اردو اخبارات پہلی عالمی جنگ میں برطانیہ کی دوغلی پالیسی اور خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے کی سازشوں سے نالاں تھے، لہٰذا اس دہائی میں ہندوستان میں فرنگی حکومت کی مخالفت میں اردو صحافیوں نے بے خوف ہوکر مضامین، رپورتیں، خبریں اور اداریے شائع کیے۔ مولانا محمد علی جوہر کے انگریزی واردو کے اخبار بالترتیب 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' نیز مولانا ظفر علی خاں کا اخبار 'زمیندار' اخبار خلافت 'مدینہ' اخبار نے جہاں جذبۂ حریت پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا وہیں ایسے مضامین، نظمیں اور اداریے بھی شائع کیے جن میں پہلی عالمی جنگ کی مخالفت کی گئی تھی اور ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً فوج میں نوکری کرنے سے روکا گیا تھا۔ اردو صحافت کی آواز کو کمزور کرنے کے لیے انگریزوں نے جہاں جبراً اخبار بند کرانے اور ضمانت ضبط کرنے کے سلسلے کو جاری رکھا وہیں شدھی اور تبلیغ کی تحریکیں چلوا کر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ٹکراؤ پیدا کرنے کی کوششیں اور سازشیں کیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس سلسلے میں ہندو مہاسبھا اور مسلم تنظیموں مثلاً خلافت تحریک کے لیڈروں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی لیکن یہ کوششیں انگریزوں کی سازشوں کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ تاہم اس کے باوجود اکثر ہندو مسلمان متحد ہوکر انگریز حکومت کی مخالفت کرتے رہے۔ یہاں یہ بتانا بھی مناسب ہے کہ جب کسی اخبار کی ضمانت انگریز حکومت ضبط کرتی تھی تو دیگر اردو اخبار اوران کے مدیران کرام اس عمل کی مخالفت بھی کرتے تھے اور ظلم وجبر کے شکار اخبار کی مدد بھی کرتے تھے۔ مثلاً جب فرنگی حکومت نے مولانا محمد علی جوہر کے انگریزی اخبار 'کامریڈ' اور اردو اخبار 'ہمدرد' کی ضمانت ضبط کی اور مزید ضمانتیں طلب کیں تو مولانا آزاد نے نہ صرف اپنے اخبار میں اس کی مذمت کی بلکہ قارئین سے اپیل بھی کی کہ وہ چندہ دے کر مولانا جوہر کے اخبارات کی مدد کریں۔ اس سلسلے میں مولانا رقمطراز ہیں:

'حکام اپنے ضعف کی بندش زبان شکایت کی بندش سے دور کررہے ہیں، ظلم وجور ہو، ستم ہو کچھ بھی ہو مگر ان کی یہی خواہش رہتی ہے کہ عام نظریں ان واقعات کو دیکھیں، عام سماعتیں ان حوادث کو سنیں، علم ودماغ ان نتائج سے اثر پذیر ہوں لیکن نہ زبان پر کوئی لفظ آئے، نہ قلم سے کوئی حرف نکلے۔ امتثال میں اگر تخفیف ہوا تو تعزیر وتعذیب کی پہلی قسط ضمانت سے شروع ہوگی جو اس ہفتے میں کامریڈ وہمدرد (دہلی) سے دو ہزار روپے کی مقدار میں لی گئی ہے۔ قارئین الہلال وزمیندار ومسلم گزٹ کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس مقدار کو اپنے مخصوص چندوں سے فراہم کریں۔ میں اس فنڈ میں ایک روپے نذر کرتا ہوں۔''

(الہلال، 13/اگست 1913)

اسی طرح مولانا ظفر علی خاں کے اخبار 'زمیندار' کو زبردستی بند کرنے اور اس کی ضمانتوں کی ضبطی کی خبر مرادآباد کے اخبار 'مخبر' نے نہایت افسوس اور رنج وغم کے ساتھ شائع کی۔ اس اخبار نے لکھا کہ :

'ملک جس طرح یہ افسوس ناک خبر سن چکا ہے کہ 13/جنوری 1914 کو زمیندار پریس گورنمنٹ پنجاب کے حکم سے ضبط کرلیا گیا ہے اور اس کی چار مشینیں، ایک انجن اور کل سامان متعلقہ سرکاری حفاظت میں لے لیا گیا ہے اور اس کی سابقہ دو ہزار والی ضمانت کی طرح ستمبر کی دوبارہ مدخلہ دس ہزار کی ضمانت بھی بحق سرکار ضبط ہوئی جس سے تخمیناً تمیں پینتیس ہزار کا مالی نقصان بھی غلام قادر خاں مالک پریس کو برداشت کرنا پڑا۔ ساتھ ہی زمیندار کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔'

(مخبر مرادآباد، 23 جنوری 1914)

دراصل اردو صحافی اور اردو اخبارات کے مالکان ومدیران انگریز سرکار کے ظلم وجبر پر خاموش نہیں بیٹھتے تھے جب ایک اخبار پر ظلم ہوتا تھا تو سارے اخبارات اس کی حمایت میں آجاتے تھے لیکن فرنگی حکومت کے سامنے بے بس ہوجاتے تھے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بھی پرانے اخبارات کے علاوہ نئے اردو اخبارات نے بھی تحریک آزادی کی کھل کر حمایت کرکے اور فرنگی حکمرانوں کے جبر کو برداشت کرکے بھی حریت پسندی کا مظاہرہ کرکے یہ ثابت کردیا کہ اردو صحافت اور تحریک آزادی میں چولی دامن کا ساتھ رہا۔ 'تحریک لاہور'، 'پیغام' کولکاتا، کیسری لاہور، تنویر انبالہ، ہمدم لکھنؤ وغیرہ اور ہفتہ وار افغان پشاور سے نکلا لیکن سرکار کی نکتہ چینی کے باعث عتاب کا شکار ہوکر بند ہوگیا روزانہ اخبار 'آزادی' کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ ترقی پسند جے بخاری اس کے مدیر تھے حریت پرستی کی وجہ سے یہ اخبار بھی سرکاری عتاب کا شکار ہوا لیکن مولانا محمد علی جوہر نے اس روزنامہ کی تعریف کی تھی۔ بہرحال بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بھی اردو صحافت حریت کے چراغ روشن کرتی رہی۔

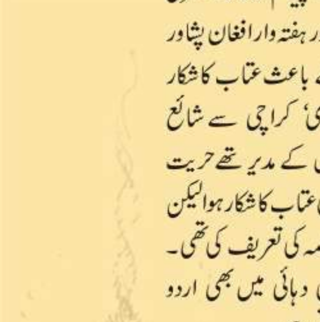

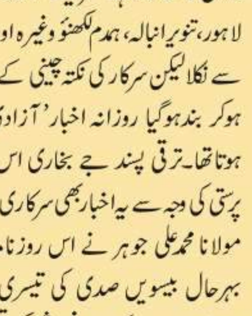

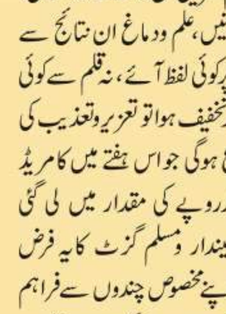

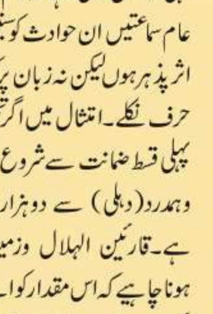

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی 1931 تا 1948 میں تو اردو صحافت اپنے شباب پر تھی اور تحریک آزادی جوش وخروش سے جاری تھی۔ اسی دہائی میں دوسری عالمی جنگ یکم ستمبر 1939 کو شروع ہوئی۔ اس جنگ کی وجہ سے اردو صحافت کو ہندوستان میں فرنگی حکومت کو گھیرنے اور اس پروطن عزیز کو مکمل آزادی کے لیے دباؤ ڈالنے کا سنہری موقع حاصل ہوا۔ اس دہائی میں بمبئ سے روزنامہ 'انقلاب'، پٹنہ سے 'اقدام'، 'نقیب'، 'راج گیر'، روزنامہ 'احسان' لاہور جس میں پہلی بار ٹیلی پرنٹر کا استعمال ہوا اور جسے علامہ اقبال کی سرپرستی حاصل تھی۔ 'ہم زاد' پھلواری شریف سے ہفتہ وار اخبار 'مساوات' بھی کلکتہ سے 'انجام' سہ روزہ 'نوائے وقت'، 'مسلم' پٹنہ سے 'مسلم لیگ' پٹنہ اور

> **اردو صحافیوں نے انگریزوں کو 'ھندوستان چھوڑنے' کے لیے دباؤ ڈالا اور اس تحریک کو آگے بڑھایا۔لھذا فرنگی حکومت نے اس تحریک کی شروعات ھی پر ایمرجنسی ایکٹ کے تحت اردوسمیت تمام ھندوستانی زبانوں کے اخبارات پرسنسرشپ نافذ کردی۔**

ماہنامہ 'بیسویں صدی' روزنامہ 'پشاور' لاہور وغیرہ اسی دہائی کی دین ہیں۔ اس دور میں چونکہ برطانوی حکومت اخبارات کو عالمی جنگ کی وجہ سے اشتہارات بھی کافی دے رہی تھی۔ لہٰذا اردو اخبارات کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ لیکن اردو اخبارات اب مذہب اور دھرم کے نام پر تقسیم ہونے لگے تھے۔ اس دہائی میں بھی اگرچہ بیشتر اخبار حریت پسند تھے لیکن پرتاپ اور تیج جیسے اخبارات انگریزوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ ہندومہاسبھا کی حمایت بھی کرتے تھے۔ اسی طرح کچھ اخبار مثلاً 'مسلم لیگ'، 'نوائے وقت' وغیرہ مسلم لیگ کے حامی تھے لیکن تحریک آزادی میں بھی شریک تھے جبکہ بیشتر اخبار مثلاً 'الجمعیۃ'، 'انقلاب' اور 'ملاپ' وغیرہ درمیانہ روش اختیار کیے ہوئے تھے یعنی ہندو مسلم اتحاد اور تحریک آزادی دونوں کی وکالت کرتے تھے۔ اردو صحافت کی وجہ سے اب انگریز بھی نرم رخ اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ ریڈیو نشریات بھی اسی دہائی میں شروع ہوئیں لیکن آل انڈیا ریڈیو حکومت برطانیہ کا ہی ترجمان بنا ہوا تھا تاہم دوسری عالمی جنگ کی خبروں کی وجہ سے لوگ ریڈیو نشریات کو سنتے ضرور تھے۔ اس دہائی میں بھی برطانوی سرکار ہندوستانی پریس پر عموماً اور اردو اخبارات پر خصوصاً سختی سے نظر رکھے ہوئے تھی۔ صحافیوں کو گرفتار بھی کیا جاتا تھا، ان پر جرمانے بھی کیے جاتے تھے لیکن اردو صحافی انگریزوں کو ملک سے بھگانے کے لیے عوام کو ترغیب دے رہے تھے۔

1941 تا 1947 کے دور میں تحریک آزادی ثمر آور ثابت ہوئی۔ اسی دور میں دوسری عالمی جنگ 2/ستمبر 1945 کو ختم ہوگئی۔ برطانیہ، امریکہ اور روس وفرانس کا اتحاد کامیاب ہوا، جاپان وجرمنی ناکام ہوئے۔ اس دہائی میں بھی ملک کے مختلف صوبوں اور شہروں سے اردو کے نئے اخبارات ورسائل نکلے۔ مثال کے طور پر مہاشے کرشن کے بیٹے ویریندر نے 1941 میں لاہور سے اخبار 'جے ہند' شروع کیا۔ یہ اخبار کانگریس پارٹی کا حامی تھا۔ دہلی 1942 میں روزنامہ 'جنگ' شائع ہونا شروع ہوا۔ 23/جولائی 1944 میں لاہور کا اخبار 'نوائے وقت' روزنامہ ہوگیا۔ 1942 میں پٹنہ سے روزنامہ 'صدائے عام' کی اشاعت شروع ہوئی۔ 1943 کو لاہور سے اخبار 'پربھات' جاری ہوا۔ جبکہ 1941 میں 'ہمالہ' اخبار کی اشاعت شروع ہوئی۔ 1941 میں پھلواری شریف سے مولانا امیرحسن نے روزنامہ 'الہلال' شروع کیا۔ 1945 میں کانگریس پارٹی نے لکھنؤ سے روزنامہ 'قومی آواز' جاری کیا۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔

اردو صحافت اس تحریک میں مزید شدت پیدا کر رہی تھی۔ اسی شدت کا نتیجہ 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کی شکل میں سامنے آیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہی پارٹیاں دوسری عالمی جنگ میں ہندوستان کو جھونکنے کے خلاف تھیں۔ اردو صحافیوں نے انگریزوں کو 'ہندوستان چھوڑنے' کے لیے دباؤ ڈالا اور اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ لہٰذا فرنگی حکومت نے اس تحریک کی شروعات ہی پر ایمرجنسی ایکٹ کے تحت اردو سمیت تمام ہندوستانی زبانوں کے اخبارات پر سنسر شپ نافذ کردی۔ یہ فرمان بھی انگریزوں نے جاری کیا کہ 'ہندوستان چھوڑو' تحریک سے متعلق ہر قسم کی خبروں کی اشاعت سے پہلے اخبارات ان کی جانچ سرکاری افسران سے کرائیں۔ ایسا نہ کرنے پر سخت سزائیں دینے کی تنبیہ کی گئی۔ اس طرح اخبارات کی آزادی پوری طرح چھین لی گئی۔ ظاہر ہے صحافیوں کے ساتھ ساتھ قارئین اور عوام نے اس جبر کی پُر زور مخالفت کی۔ ہندوستانی عوام سڑکوں پر آنے لگے۔ روزنامہ 'پرتاپ' لاہور کے مدیر مہاشے کرشن نے اس سنسر شپ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنا اخبار ہی بند کرنے کا اعلان کر دیا، لیکن انگریزوں نے سنسر شپ نہ صرف جاری رکھی بلکہ مہاشے کرشن اور ان کے بیٹوں کو نریندر اور ویریندر کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں اُنھیں چھوڑ دیا گیا۔ 'ملاپ' لاہور کے مدیر خوش حال چند خورسند اور بیٹے رنبیر کو بھی تحریک آزادی کو بھڑکانے اور انگریز سرکار کی مخالفت کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد انھیں بھی رہا کر دیا گیا۔ اس دور میں اردو اخبارات کی تعداد 500 سے زائد تھی اور یوپی، بہار، پنجاب، بمبئ، مدارس، بنگال، سندھ، سینٹرل پروونسیز (اب مدھیہ پردیش)، دہلی، آسام، اڈیسہ، شمال مغربی سرحدی صوبہ بلوچستان، سندھ، حیدرآباد، اجمیر، میرواڑہ غیرہ سے بڑی تعداد میں اردو اخبارات نکلتے تھے اور عوام کو راہِ آزادی پر لے جاتے تھے۔ انگریز حکومت کی نظر میں بھی اردو اخبارات کی زیادہ اہمیت تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ اردو اخباروں کا ہندوستانیوں پر نسبتاً زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے اخباروں کے تجزیے سے متعلق شعبوں میں اردو کا شعبہ سب سے بڑا تھا۔ اس کا عملہ بھی نسبتاً زیادہ بڑا تھا۔ شعبۂ اردو کا سربراہ انفارمیشن آفیسر ہوتا تھا جبکہ دیگر زبانوں کے شعبے کا انچارج صرف اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر ہوتا تھا۔ اردو ہی کے سب سے زیادہ اخبارات کا تجزیہ سرکار کراتی تھی۔ اردو کے بعد ہی انگریزی اور ہندی کے اخبارات تجزیے کے لیے منگائے جاتے تھے۔ بیسویں صدی میں 1901 تا 1947 جو اخبارات، رسائل اور جرائد منظرعام پر آئے ان کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی۔

بہرحال اردو صحافیوں کی قربانیاں، اردو اخبارات کی تحریک آزادی، نیتاجی سبھاش چندر بوس کی للکار، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں اور تقریریں رنگ لائیں اور 15/اگست 1947 کو ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوگیا۔ لیکن آزادی کی نوید تقسیم ہند کا پروانہ بھی لائی۔ برصغیر ہندوستان دوملکوں پاکستان اور بھارت میں تقسیم ہوگیا۔ اردو اخبارات بھی تقسیم کا شکار ہوئے۔ جہاں 'ملاپ' اور 'پرتاپ' جیسے اردو اخبارات پاکستان سے ہجرت کرکے ہندوستان آگئے وہیں 'جنگ' اور 'ساقی' جیسے اخبارات ورسائل منتقل ہوکر پاکستان چلے گئے۔ اردو کے بہت سے مسلم صحافی پاکستان ہجرت کرگئے۔ آزادی کے بعد چندبرس تک ہندوستان میں اردو زبان اور اردو صحافت کو تقسیم کا خمیازہ بھگتنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ اردو صحافت بھی آگے بڑھی۔

■

Dr. Asad Raza
21/37, 3 EC Road
Dehra Dun - 248001 (Uttrakhand)
Mob.:9873687378

آزادی کی جنگ اور روہتاس

اے کے علوی

ہندوستان میں انگریز استعمار کے خلاف جب جنگ کا آغاز ہوا تو اس میں مختلف علاقوں اور طبقات کے لوگوں نے شرکت کی۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی اور دیگر طبقات کے لوگوں نے آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ کچھ علاقے تحریک آزادی کا اساسی مرکز تھے مگر ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں مجاہدین آزادی کی ایک بڑی تعداد تھی جنھوں نے خاموشی کے ساتھ انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی۔ بہار کے بہت سے علاقوں اور اضلاع میں بھی انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ انہی میں ایک ضلع سہسرام (روہتاس) بھی ہے۔ روہتاس ویدک عہد میں کاروش علاقہ کہا جاتا تھا۔ یہ مشرق مغرب جنوب میں سون ندی اور مغرب جنوب میں وندھیا سلسلۂ کوہ سے گھرا ہوا ہے۔ یہ سرزمین بھی رشی منیوں اور جانبازوں کے علاقے کے طور پر مشہور ہے۔ راجہ ہریش چندر کے بیٹے کا تعلق بھی اس علاقے سے ہے۔ 635 عیسوی میں روہتاس کے حکمراں ادے سین تھے، یہ جانکاری بھبھوا کے قریب منڈیشوری دیوی کے سنگی کتبے سے ملتی ہے۔ گیارہویں صدی میں اس سرزمین پر راج پرتاپ دھول کی حکومت تھی جو تاراچندی اور تترا ہو کے سنگی کتبے سے ثابت ہوتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں شیر شاہ، مان سنگھ، ہیمو اور خرم وغیرہ سے یہ ضلع منسلک رہا ہے۔ اس کو شہرت شیر شاہ سوری کی وجہ سے مل پائی۔ روہتاس بہت تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ادب کے شعبے میں یہاں بھوجپوری، ہندی اور سنسکرت میں کئی شاعر و ادیب ہوئے جن میں ملکی سطح پر راجہ رادھیکا رمن پرشاد سنگھ، شری رام سوروپ پاٹھک اور موسیقی کے شعبے میں گھنا رنگ جی نے اپنا مقام بنایا ہے۔ روہتاس ضلع کا قدیم نام شاہ آباد (آرہ) تھا۔ 10 نومبر 1972 میں اس کی تقسیم ہوئی۔ شاہ آباد کے جنوبی حصے کو روہتاس ضلع کی شکل میں منظوری ملی۔ اس وقت یہاں دو سب ڈویژن تھے، سہسرام اور بھبھوا۔ سون بھدر کے مغربی کول اور کرم ناشا کے مشرقی ساحلی علاقوں کو روہتاس کہا جاتا ہے۔ اس علاقے سے تعلق رکھنے والوں نے بھی ہندوستان کی آزادی کے لیے ہمت و حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہادت دی۔

1857 کے انقلاب میں بھارت کی آزادی کی تحریک میں برطانوی سامراج کے خلاف مخالفت اور جدوجہد میں 80 سال کی عمر میں بابو ویر کنور سنگھ داناپور کے باغی سپاہیوں کی قیادت کرتے ہوئے گرانڈ انگریز جنرل کو لڑائی میں پکڑتے ہیں اور اس جیت کا حقدار اپنے سپاہیوں کو بناتے ہیں۔ بابو ویر کنور سنگھ کے اہم معاون میں چھوٹے بھائی امر سنگھ، بھتیجے رِتو رنجن سنگھ، ہری کشن سنگھ، روہتاس ضلع شیو ساگر بلاک کے بڈّی گاؤں کے نشان سنگھ، روہتاس بلاک اکبرپور گاؤں کے دلاور خاں جیسے لوگ تھے۔ اس علاقے سے تعلق رکھنے والے مجاہدین میں نشان سنگھ، حاجی بیگم، دلاور خان، عبدالقیوم انصاری، جگن ناتھ پرشاد سنگھ، مسیح الزماں انصاری، ننہکو میاں، بابو پہلوان سنگھ، سیتارام دویدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مجاہد آزادی نشان سنگھ 1782 میں پیدا ہوئے۔ 1857 کے انقلاب میں آزادی کی تحریک میں انگریزوں کے خلاف بابو ویر کنور سنگھ کے اہم معاون تھے۔ انھوں نے 1857 میں راناپور چھاؤنی کے باغی سپاہیوں کی قیادت کی۔ آرہ جیل کا پھاٹک توڑ کر جنگ آزادی کے قیدیوں کو آزادی دلائی، کرو یا مرو کا عزم کیا، انگریزوں کے ساتھ آرہ، بی گنج کی لڑائی میں جوہر کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزادی کے لیے لڑے، انھیں موت کے گھاٹ اتارا۔ بابو ویر کنور سنگھ کی شہادت کے بعد نشان سنگھ ڈومرکھار کے قریب کھری گھاٹ کی کاگ شیل نام کی گپھا میں رہ رہے تھے۔ انگریزوں کو پتہ چلتے ہی 5 جون 1858 کو سہسرام کے مجسٹریٹ کال نے انھیں حراست میں لے کر بغاوت کا مقدمہ چلا کر 7 جون 1858 کو گورکچھنی سہسرام میں توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیا اور نشان سنگھ کی شہادت ہوئی۔ آج نشان سنگھ لائبریری اسی مقام پر کامیابی کے ساتھ قائم ہے۔ نشان سنگھ کے نام پر ہائی اسکول، نشان نگر بڈی اور بیدا واقع بڈی روڈ میں نشان سنگھ دروازہ قائم ہے۔

مجاہد آزادی حاجی بیگم ریاست بہار کی پہلی خاتون مجاہد آزادی تھیں۔ جنگ آزادی میں جھانسی کی رانی کے بعد دوسرا مقام حاجی بیگم کا ہی تھا۔ پٹھان ٹولی سہسرام واقع اپنے محل میں رہ کر وہ گھڑ سواری اور تلوار بازی کے کرتب سیکھ کر ماہر ہوگئی تھیں۔ 1857 کی جنگ میں بابو ویر کنور سنگھ کا تعاون کرتی رہیں اور ایک بہن کی طرح راکھی بھی باندھتی تھیں۔ بابو ویر کنور سنگھ، امر سنگھ سہسرام جگدیش پور سے حاجی بیگم کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ سہسرام کے بیکر نام کے انگریز مجسٹریٹ کو معلوم ہوگیا تو وہ رجمنٹ فورس لے کر حاجی بیگم کے محل پر پہنچ گیا اور حملہ کردیا۔ گھمسان جنگ پٹھان ٹولی سے لے کر آدم پور کے میدان تک چلی۔ حاجی بیگم تلوار لیے گھوڑا پر سوار انگریزوں کا مقابلہ کرتی رہیں۔ سیکڑوں انگریز سپاہی مارے گئے۔ انگریز فوج بھاگ گئی اور اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ حاجی بیگم نے بابو ویر کنور سنگھ اور امر سنگھ کو روہتاس کیمور کی پہاڑی ہوتے ہوئے مرزاپور پہاڑی سے محفوظ نکالا اور آزادی کی لڑائی لڑتی رہی۔ دوسری بار انگریزی فوج نے حاجی بیگم کے محل کو لوٹ کر توپ سے اڑا دیا۔ کھنڈر محل کو چھوڑ کر حاجی بیگم خرم آباد چلی گئیں۔ ان کا انتقال یکم جنوری 1859 کو ہوا۔ ان کا مزار پٹھان ٹولی میں ہے۔ اردو کی کتاب میں ان کی زندگی پر مبنی کئی اہم واقعات شامل کیے گئے ہیں۔

مجاہد آزادی دلاور خاں روہتاس بلاک کے اکبرپور ویر کنور سنگھ کے معاون فوج کے اہم جنگجو تھے۔ آرہ فتح میں ان کا اہم کردار تھا۔ انھیں سہسرام میں روضہ روڈ میں پیڑ سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔

مجاہد آزادی عبدالقیوم انصاری 1921 کے 'سہیوگ آندولن' میں سرگرم رہے۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے فروری 1922 کو ڈہری میں انگریزوں نے انھیں گرفتار کر کے سہسرام جیل بھیج دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر راجندر پرساد، سردار ولبھ بھائی پٹیل کے رہتے ہوئے آزادی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ ملک کی آزادی کے بعد بہار کابینہ میں وزیر بنائے گئے۔

مجاہد آزادی جگن ناتھ پرساد سنگھ کی پیدائش 4 جولائی 1914 کو دریگاؤں شیوساگر بلاک میں رَن بہادر سنگھ کے یہاں ہوئی جو ان کے والد تھے۔ پٹنہ کالج کے طالب علم

رہےاور سائمن کمیشن کی مخالفت کرنے پر پٹنہ میں جیل بھی گئے۔ 1942 کی آزاد کرانتی میں حصہ لیا۔ 1944 میں ایک بار پھر گرفتار ہوئے۔ ملک کی آزادی تک سرگرم رہے۔ آزادی کے بعد 1947 سے 1957 تک بہار قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ 1968 سے 1974 تک بہار قانون ساز کونسل کے رکن رہے۔ وزیر بھی رہے۔ ان کا انتقال 17 نومبر 2004 کو ہوا۔

مجاہد آزادی مسیح الزماں انصاری کی پیدائش شیو ساگر تھانہ کے نوڈیہاں (رائے چور) گاؤں میں 1910 میں ایک بنکر خاندان میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ خانقاہ کبیریا میں ہوئی۔ طالب علمی کی زندگی سے ہی حب الوطنی ان کے شہ رگ میں تھی۔ وہ اکثر آزادی کی مجلسوں وغیرہ میں شامل ہوتے رہتے تھے۔ جب سبھاش چندر بوس سہسرام آنے والے تھے، ان کی تقریر کو سننے کے لیے صبح سے ہی حسن خاں سور روضہ کے میدان میں مسیح الزماں حاضر ہوگئے تھے۔ انھوں نے عبدالقیوم انصاری کی تقریر وشائع ہونے والی تحریر کی چرچہ کرنے میں خود کو وقف کردیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے لوگوں میں ان کی پہچان بن گئی۔ یہ عبدالقیوم انصاری کے ساتھ مومن کانفرنس کے اجلاسوں میں شامل ہوتے رہے۔ انصاری صاحب بھی انھیں پٹنہ، کولکاتہ، الہ آباد، رانچی وغیرہ مومن کانفرنس کے اجلاسوں میں ساتھ لے جاتے۔ انصاری صاحب مسیح الزماں انصاری پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ مسیح الزماں صاحب مومن کانفرنس کی تنظیم سے جڑ گئے۔ عبدالقیوم انصاری سہسرام سے اردو کا ایک رسالہ 'افکار' نکالا کرتے تھے جس کے ایڈیٹر وہ خود تھے لیکن پرنٹرو پبلشر مسیح الزماں انصاری تھے۔ اس اردو رسالے کے ذریعے مسلمانوں میں ملک کی آزادی کے تعلق سے بیداری پیدا کی جاتی رہی۔ کچھ ہی برسوں میں اس رسالے نے دھوم مچا دی۔ اس وجہ سے برطانوی حکومت نے پریس ایکٹ کے تحت اس رسالے پر پابندی لگا دی۔ جس سے انصاری صاحب و مسیح بھائی کو رانچی جیل بھیج دیا گیا۔ مولانا آزاد بھی وہیں بند تھے۔ 85 برس کی عمر میں دسمبر 1995 میں مسیح الزماں انصاری کا انتقال ہوگیا۔

مجاہد آزادی ننہکو میاں آزادی کے دیوانوں میں سب سے آگے رہنے والوں میں تھے۔ 'بھارت چھوڑو آندولن' میں گاندھی جی کی آواز پر انھوں نے سرگرم طور پر حصہ لیا تھا۔ 1942 میں جیل جانے کے بعد اس وقت کے سب ڈویژنل مجسٹریٹ ایچ بی مارٹن نے 3 فروری 1943 کو جی آر 1197 میں گرفتار کرکے انھیں چھ ماہ بامشقت قید اور 150 روپے جرمانے کے ساتھ سزا دی تھی۔ حاجی صاحب کے خاندان میں آج کے دن تقریباً دوسو رکن ہیں۔ جن میں ان کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ صدر جمہوریہ ہند کے ذریعے 'تامر پتر' سے نوازے گئے حاجی ننہکو میاں کی پیدائش یکم جنوری 1898 کو ہوئی۔ 15 اگست کو ان کے انتقال کے بعد ضلع انتظامیہ کی موجودگی میں ان کے آبائی مقام سے سرکاری اعزاز اور فوجی دستوں کے توپوں کی سلامی کے بعد چینار ی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

مادر وطن پر انگریزوں کی بربریت اور جابرانہ رویے کو دیکھتے ہوئے ناقابل برداشت طوق غلامی کو نکال پھینکنے کے لیے بابائے قوم مہاتما گاندھی کی آواز کرو یا مرو ''انگریزو بھارت چھوڑو'' کا نعرہ سن کر سربکفن ملک کے لاکھوں کروڑوں مجاہد آزادی نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انھیں سرفروش مجاہدوں میں رہتاس ضلع کے چناری تھانہ کے چالیس مجاہد آزادی جو سپرد خاک ہوگئے، لیکن ان کے نام آج بھی چناری بلاک اور گاندھی چوک پر سنگ مرمر میں کندہ ہیں۔ یہ سبھی جاں فروش 15 اگست 1942 میں ہزاروں تماشہ بین کے ساتھ آزادی کا ترنگا اپنے کندھے پر لے کر مقامی تھانہ پر آزادی کا پرچم لہرایا اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ انگریزو بھارت چھوڑو کے نعرے کی پاداش میں جیل کی سلاخوں میں بند کیا گیا اور ہر طرح سے زدوکوب کیا گیا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دیوانوں کی طرح انھیں بھی انگریز سپاہی گولیوں کا نشانہ بنائے ہوئے بستی اور گاؤں کو مشین گن اور توپوں سے اڑاتے۔ اس وقت کا سماں فراموش نہیں کیا جاسکتا جبکہ چناری کے سرگرم مجاہد آزادی کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ لے کر انگریز گورے گرفتار کررہے تھے۔

چناری کے حاجی ننہکو میاں کو اس کی پاداش میں سہسرام کورٹ کے ایس ڈی او ایچ بی مارٹن نے کیس نمبر 1197 میں چھ ماہ بامشقت اور ایک سو پچاس روپے مالی جرمانہ کی سزا سنائی اور جرمانہ نہیں دینے پر 9 ماہ کی قید سنائی۔ پھر بھی عظیم مجاہد آزادی اور محبّ وطن نے تحریک آزادی جاری رکھی۔ 15 اگست 1947 کو ملک آزاد ہوگیا۔ مجاہدین آزادی کی دلی خواہش پوری ہوئی۔

105 سال کے مجاہد آزادی حاجی ننہکو میاں یوم آزادی 15 اگست 2002 کو ضلع مجسٹریٹ کی دعوت پر گئے اور پرچم کشائی کے وقت ہی انتقال کر گئے۔ سہسرام کے ایس ڈی او کشوری شاہ نے ضلع مجسٹریٹ کے حکم پر ان کے آبائی گاؤں چناری لے کر آئے اور پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ گلپوشی اور توپوں کی سلامی کے بعد ہزاروں عقیدت مندوں نے امارت شرعیہ کے امیر مولانا نظام الدین کی امامت میں نماز جنازہ پڑھی اور سپرد خاک کردیا۔ ننہکو میاں نے جب آخری سانس یوم آزادی کے موقع پر منچ پر لی تھی تب ضلع انتظامیہ کے ذریعے ننہکو میاں کے نام پر پارک بنانے کا اعلان کیا گیا تھا۔

مجاہد آزادی بابو پہلوان سنگھا جینی راجپوت اور زمیندار تھے۔ یہ گڑھ نوکھا کے باشندے تھے۔ مانا جاتا ہے کہ بابو پہلوان سنگھ سنت کوی دریاداس کے شاگرد تھے۔ پہلی جنگ آزادی میں ان کا کردار قابل تعریف رہا ہے۔ انھوں نے ویر کنور سنگھ کی بھرپور مدد کی تھی۔ ان کی موت ممکناً غازی پور میں زمیندار بلونت کے یہاں ہوئی۔

مجاہد آزادی سیتارام دویدی نے بھی 1857 کی جنگ آزادی میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انگریزوں نے انھیں قید کرکے پٹنہ جیل بھیج دیا۔ انھیں وہاں بہت اذیتیں دی گئیں، جس کی وجہ سے ان کی موت ہوگئی۔

1942 کی کرانتی میں روہتاس ضلع کا غیر معمولی کردار رہا ہے۔ یہ انقلاب مہاتما گاندھی کی سرپرستی میں ہوا تھا۔ اس انقلاب میں کئی لوگ شہید ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی شہید ہیں جن کا نام روہتاس کے صفحات پر تو نہیں مگر تاریخ کے صفحات پر ضرور ہیں۔ ان کا تعارف اس طرح ہے:

جگدیش پرساد بچری گاؤں (پیرو) بھوجپور کے باشندے تھے۔ موت کے وقت ان کی عمر تقریباً 20 برس تھی۔

مہنگو رام سہسرام کے تھے جن کی عمر تقریباً 22 برس تھی۔

گیا رام سنگھکو پا گاؤں کے باشندہ تھے۔ موت کے وقت ان کی عمر 30 برس تھی۔

جگن ناتھ رام سہسرام کے باشندہ تھے۔ ان کی عمر 19 سال تھی۔

راماشیش سنگھ سہسرام کے باشندہ تھے۔

ان کے علاوہ جنگ آزادی کی تحریک میں شہید ہونے والوں میں لکشمن سنگھ گونڈ (سپولہ گنج، سہسرام)، لکشمن اہیر (چنورتکیا سہسرام)، تری بھوون مہتو (بھارتی گنج، سہسرام)، سورج دھوبی (سنجھولی)، جھوری کوئری (سنجھولی)، رام چندر سنگھ عرف رندھیر سنگھ (داوتھ) وغیرہ اہم ہیں۔ کچھ ایسے بھی شہید ہیں جو تاریخ کے صفحات میں گمنام ہوگئے ہیں۔

درج بالا شخصیتوں کے علاوہ روہتاس ضلع کے ماتحت بلاکوں میں اور کئی مجاہدوں نے ملک کی آزادی میں اپنا مکمل تعاون دیا ہے۔ ان مجاہد آزادی کو سرکاری اعزاز اور سہولت دستیاب ہے۔

■

Dr. A. K. Alvi
House No: 01, Ward No: 30, Alvi House
Chokhandi, Sasaram - 821115
Distt.: Rohtas (Bihar)

امیر حمزہ

1857 کی بغاوت میں اردو اخبارات کا کردار

اٹھارہویں صدی کے نصف اول سے ہی ہندوستان میں بیرونی در اندازی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ایک طرف نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے تھے تو دوسری جانب مشرقی ساحل سے مغربی تاجرین کی یورش تھی۔ یہیں سے ہندوستانیوں کی زندگی اور ہندوستان کا ماحول بدلنا شروع ہوگیا تھا۔ عوامی زندگی میں احتجاجی گفتگو شروع ہو گئی تھی، مغل حکومت لگاتار کمزور ہوتی جارہی تھی اور انگریز مستقل اپنا قدم مضبوط کرتا جارہا تھا جس سے ظاہری و باطنی بغاوتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ عوامی زندگی میں اس کا اثر آنا لازمی تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ شروع سے ہی اردو شاعری میں احتجاج کی لو نظر آنے لگتی ہے۔ اس احتجاج کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول 1857 تک اور دوم 1857 تا 1947۔ اول الذکر محض احتجاجی ادب میں شمار ہوتا ہے، دوم میں آزادی کی جدوجہد شامل ہوجاتی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ادب کی مروجہ اصناف میں احتجاج ملنے لگتا ہے۔ وہ احتجاج اندرونی و بیرونی دونوں طاقتوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس روایت نے اردو میں شہر آشوب کو فروغ دیا، جس کے موضوعات بدحالی ہی ہوتے تھے جس میں بباطن احتجاج کی لے تیز ہوتی تھی۔ انیسویں صدی کی دو دہائی بعد جب اخبارات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں سیاسی گرفتاریاں، مقدمات اور سزا کی روداد تفصیل سے شائع ہوتی ہیں جس سے اس زمانے کی صحافتی خدمات کا پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کی سرپرستی میں رہتے ہوئے اور آزاد رہ کر بھی اخبارات نے کس طرح سے ہندوستانیوں کو پہلی جنگ آزادی 1857 کے لیے ابھارا۔

1823 تا 1857 کے اردو اخبارات کی بات کی جائے تو اس عہد میں کل 122 اخبارات کے شائع ہونے کا ریکارڈ ملتا ہے، جن میں سے کم وبیش چالیس اخبارات اردو کے ملتے ہیں۔ اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' کلکتہ، مولوی محمد باقر کا دہلی اردو اخبار، سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا سید الاخبار، دہلی سے ہی 'صادق الاخبار' نام سے دو اخبار جاری ہوئے، ایک کے مالک سید جمیل الدین خاں تھے اور دوسرے کے ایڈیٹر شیخ خدا بخش، جو شاید مالک بھی رہے ہوں۔ دہلی ہی سے مولوی کریم الدین کا 'کریم الاخبار' اور رسالہ 'گل رعنا' 1845۔ لاہور سے کوہ نور، مرزاپور سے خیر خواہ ہند، دہلی سے قران السعدین۔ 1847 میں آگرے سے 'اسعد الاخبار'، 1849 میں قطب الاخبار، 1849 میں میرٹھ سے 'مفتاح الاخبار' ایڈیٹر محبوب علی۔ 1849 میں بنارس سے 'باغ و بہار' ایڈیٹر سید اشرف علی۔ 1849 میں اندور سے 'مالوہ اخبار' بہ ادارت دھرم نارائن جیسے اہم اخبار جاری ہوئے۔ ان اخبارات میں سب کی کہانی الگ الگ ہے لیکن ان اخبارات کا کارنامہ یہ رہا ہے کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے لیے انھوں نے مکمل طور پر ماحول بنایا۔ ان کے پاس نہ وسائل تھے اور نہ ہی مکمل طور پر آزاد رہ کر لکھنے کی اجازت حاصل تھی، اس کے باوجود بڑی جرات و بے باکی سے عوامی شعور کو بیدار کیا اور انگریزوں سے آزادی کی روح بیدار کی۔

اس عہد کے اخبارات میں دہلی اردو اخبار کا کارنامہ سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے کیونکہ ملک کی آزادی کے لیے جس صحافی نے اپنی جان قربان کی وہ دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر تھے، ساتھ ہی شہادت کا یہ اعزاز اردو کو ہی حاصل ہوا۔ 1857 تک یہ اخبار تقریباً اپنی بیس سالہ زندگی طے کرچکا تھا جس میں بہت ہی زیادہ متوازن رہ کر مولوی محمد باقر نے صحافتی خدمات انجام دیں۔ مولوی محمد باقر کا تعلق قلعے سے تھا اور قلعے والوں میں محترم بھی تھے۔ غالب، مومن، ذوق وشیفتہ بھی اس اخبار کے قدردانوں میں تھے۔ انگریزوں کے دبدبے سے ہر خاص و عام خائف تھا تو لازمی تھا ایک صحافی اور مؤقر شہری بھی اپنے جذبات کا اظہار کرے اور اپنے قلم سے سلاح کا کام لے۔ جب 10 مئی کو میرٹھ سے بغاوت ہوئی اور وہاں سے سپاہی 11 مئی کو دہلی پہنچے اور پوری دہلی شورش و ہنگامے کی لپیٹ میں آ گئی، مغلیہ حکومت کا علامتی چراغ بھی بجھ گیا۔ ایسے حالات میں ایک ہفتے بعد جب دہلی اردو اخبار کا شمارہ منظر عام پر آتا ہے تو وہ ایک بدلا ہوا مجاہد آزادی کا اخبار نظر آتا ہے۔ شہ سرخی میں انقلاب کی خبر کا عنوان ہوتا ہے 'قل فاعتبروا یا اولی الابصار' اس کے بعد عربی میں ایک مکمل خطبہ آٹھ کتابی سطروں کے برابر ہے جس میں خدا کی قہاریت وغفاریت کا بھی ذکر ہے پھر ڈیڑھ صفحات پر خبر سے پہلے ایک جوشیلی تحریر موجود ہے، جبکہ دہلی اردو اخبار کے 1940 کے شماروں میں کسی بھی خبر پر خطبہ نظر نہیں آتا، جس سے ہم سمجھ سکتے

ہیں کہ وہ بغاوت کی خبر کو کن جذبات سے پیش کررہے تھے۔اس زمانے میں اداریہ لکھنے کا رواج نہیں تھا خبر کے شروع میں ہی مدیر کچھ ردعمل کا اظہار کردیا کرتا تھا، اس خبر کے شروع میں انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''وہ حکام ظاہرالاستحکام جن کے استقلال حکومت وانتظام کے زوال کا نہ ان کو خیال تھا اور نہ کسی غفال کو وہم وگمان کبھی آسکتا تھا ایک طرفۃ العین میں وہ نمایاں ہوگیا۔'' اس تمہید کے بعد 11 مئی کی بغاوت کی پوری تفصیل دی گئی ہے جو کتاب کے کئی صفحات پر مشتمل ہے۔خبر ایسی جزئیات نگاری سے لکھی گئی ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔بغاوت کی خبروں کا یہ انداز 24 مئی کے شمارے میں بھی جاری رہا۔جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی نظم 'تاریخ انقلاب عبرت افزا' بھی چھپتی ہے۔اس کے بعد دو شمارے اور شائع ہوتے ہیں، پھر 12 جولائی سے بہادر شاہ ظفر کی مناسبت سے اس کا نام 'اخبار الظفر' ہوجاتا ہے۔کیونکہ بغاوت کے بعد مولوی محمد باقر مکمل طور پر بہادر شاہ ظفر کے ساتھ آزادی کی لڑائی میں شریک ہوجاتے ہیں بلکہ ان کے معاون کے طور پر سرگرم رہتے ہیں، جس میں مال گزاری کے خزانے کو بہ حفاظت لانے کی خوشی میں بہادر شاہ ظفر نے ان کے اخبار کا نام اخبار الظفر کردیا تھا۔اس نام سے دس ہی شمارے نکلے تھے کہ مولوی محمد باقر نے 16 ستمبر کو جام شہادت نوش فرمایا۔

دہلی اردو اخبار کے بعد 'سید الاخبار' (جاری 1837) کو دہلی کا مؤقر اخبار مانا جاتا ہے۔مالک تو سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں تھے لیکن اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالغفور کو بنایا گیا، کیونکہ سید محمد خاں سرکاری ملازم تھے، لازم ہے کہ سرکار میں رہتے ہوئے وہ سرکار کے خلاف لکھنے سے رہے اس لیے انھوں نے ایڈیٹر منتخب کیا۔مولوی عبدالغفور کا تعلق قانون داں حضرات سے اچھا تھا اس لیے ان کا یہ اخبار وکیلوں میں بھی مقبول تھا۔یہ 1848 تک جاری رہا۔ 1846 میں بھائی کے انتقال کے بعد سرسید نے ہی ذمے داری سنبھالی اور بقول حالی'' سید الاخبار کا اہتمام برائے نام ایک اور شخص کے سپرد تھا،مگر زیادہ تر سرسید خود اس کے مضامین لکھا کرتے تھے۔'' اخبار کا مزاج کیا تھا وہ آپ سرسید کی بصیرت سے ہی اندازہ لگا سکتے ہیں بلکہ تہذیب الاخلاق کی جھلک اس اخبار میں دیکھ سکتے ہیں جس میں سماجی اور تاریخی مواد شائع ہوتا تھا۔

بنارس سے 1852 میں بابو کاشی داس متر 'آفتاب ہند' ہفتہ واری اخبار جاری کرتے ہیں۔اس اخبار کی بھی کوئی الگ خصوصیت نہیں تھی۔کمپنی کے ساتھ بھی تھا اور ہندوستانی ہونے کا فرض بھی ادا کرتا، اس لیے انگریزی حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ آتا تو اس کو کام میں ضرور لاتا۔ یہ عام خبروں میں نہیں بلکہ ان خبروں میں ہوتا جہاں معاملہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مابین ہوتا جیسے شکاری انگریز کی گولی سے ایک ہندوستانی مرگیا۔عدالت نے اس پر انگریز کو صرف ایک سال کی قید محض کی سزا دی جس پر رپورٹنگ کرتے ہوئے اخبار خبر کے اخیر میں لکھتا ہے''صاحب جج بہادر نے ان کے حق میں یہ حکم صادر فرمایا کہ تین مدعا علیہ رہائی پاویں و مسٹر مسلی صاحب ایک برس تک بلامحنت مقید رہے اور مجرم کو یہ تسلی دی گئی ہے تم کو قید میں کچھ تکلیف نہ ہوگی سیر کتب بخوبی کیا کرو... اس کو عدالت شاہی کہتے ہیں کہ جس میں جانِ رعایا جاوے اور دادخواہ داد نہ پاوے ... اگر کسی ہندوستانی سے ایسا جرم سرزد ہوتا تو بیشک سزا کو پہنچتا...'' اخبار کے آخری دو جملے ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے میں معاون ہورہے ہیں جو اخبارات وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔

اس عہد میں کئی ایسے اخبارات نکلے جن کے مالکان انگریز تھے یا بظاہر وہ اخبارات انگریز حامی تھے لیکن ان اخبارات نے بھی انگریزوں کے خلاف ہندوستانی عوام کو بھڑکانے میں مدد کی۔جیسے اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' جسے انگریزوں نے اپنے مفاد کے لیے نکالا تھا۔یہ اخبار کبھی اردو اور کبھی فارسی میں نکلتا رہا۔اس اخبار میں وطن دوستی کے گہرے جذبات پر مواد شائع ہونے لگا۔مزید یہ کہ اس اخبار نے پنجاب کی سکھ ریاست پر انگریزوں کے حملے کے ارادے کی خبر کو بہت پہلے شائع کردیا تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستانیوں میں مزید بے چینی پھیلی اور انگریزوں سے تنفر بھی بڑھا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار مشکل سے چھ برس پورا کرسکا اور بند ہوگیا۔انگریزوں کی سرپرستی میں نکلنے والا ایک اخبار 'کوہ نور' بھی تھا جو 14 جنوری 1850 کو لاہور سے شائع ہوا۔اس کے مالک ہرسکھ رائے تھے۔یہ مجاہدین آزادی کی پکڑ دھکڑ، املاک کی ضبطی، مکانوں کے انہدام، مقدمات نیز سزاؤں کی خبریں بڑی تفصیل سے شائع کرتا تھا۔اس کا بھی اثر الٹا ہوا کہ انگریز دشمنی کی چنگاری کو مزید بھڑکایا گیا۔'کوہ نور' کے مالک ہرسکھ رائے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اخبار کی پالیسی سے اس قدر بیزار ہوئے کہ علاحدگی اختیار کرلی اور اپنا الگ سے اخبار نکالا جس میں بہت ہی شدت سے انگریزوں کی مخالفت کی اور گرفتار کرلیے گئے۔ 1851 میں سیالکوٹ سے 'ریاض الاخبار' نکلنا شروع ہوا۔اس کے مالک منشی دیوان چند تھے جنھیں انگریزوں کی حمایت حاصل تھی۔ مذکورہ اخبار کے علاوہ انھوں نے چشمۂ فیض، خورشید عالم، ہمائے بے بہا، نورعلیٰ نور اور وکٹوریہ پیپر بھی جاری کیا۔ان سب کے نام سے ہی ظاہر ہورہا ہے کہ انھیں انگریزوں کی حمایت حاصل تھی، لیکن قارئین کا نتیجہ انگریز مخالف کے طور پر سامنے آتا تھا۔ پنجاب سے ایک اخبار 'پنجاب پنچ' مولوی کریم الدین سنبھلی نے جاری کیا تھا۔یہ رومن رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔اخبار کے ایک شمارے میں انھوں نے انگریز کی سرپرستی کا اظہار بھی کیا ہے جو کچھ اس طرح ہے''انھیں ایک شریف، سخن پرور اور نہایت فیاض حاکم کی امداد حاصل ہے''۔اخبارات کے علاوہ اس زمانے میں کئی رسائل بھی نکلے جن میں ایک 'خیر خواہ ہند' ہے جو 1837 میں مرزاپور، بنارس سے جاری ہوا تھا۔اس کے ایڈیٹر ایک پادری آر، سی ماتھر تھے۔اس میں عیسائی تبلیغ کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔غدر سے پہلے ان اخبارات کا رول دیگر کے مساوی تھا یعنی انگریزوں کے خلاف کچھ بھی ہاتھ لگ جاتا تو اس سے ہندوستانیوں کے دل میں نفرت پیدا کرنے کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے اور بظاہر کمپنی کے طرفداروں میں بھی شمار ہوتے تھے۔ الغرض اس قسم کے اور بھی کئی اخبارات ہوں گے جنھیں انگریزوں کی سرپرستی حاصل رہی ہوگی لیکن قارئین کے مدنظر وہ بھی خبروں کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ جس سے انگریز دشمنی میں اضافہ ہی ہو۔عتیق صدیقی اس عہد کے اخبارات اور خبروں کے متعلق اپنی کتاب 'ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں' میں لکھتے ہیں:

'' 1857 کے اوائل کے ہندوستانی اخباروں میں عموماً اور اردو اخبارات میں خصوصاً انگریزوں اور ایرانیوں کی خبریں اس کثرت سے شائع ہوتی تھیں کہ جس کا کوئی حدوحساب نہیں تھا۔ان خبروں کا مواد اور ان کے پیش کرنے کا انداز اعلانیہ انتہائی انگریز دشمنانہ ہوتا تھا۔''

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''ہندوستانی اخبار نویسی کی ابتدائی تاریخ کا اگر (بہ) غائر مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی اخبار نویسی کا مزاج ابتدا ہی سے باغیانہ تھا۔انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستانیوں نے فارسی، بنگلہ، اردو، ہندی اور انگریزی اخبار جاری کرنا شروع کیے۔ یہ سیدھے سادے معصوم سے اصلاحی اخبار ہوتے تھے۔ان میں خبریں بھی ہوتی تھیں مگر بظاہر غیر سیاسی قسم کی۔لیکن ان کے

انداز بیان اور ان کے مواد کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی گہرائی میں غم و غصے کے دبے ہوئے طوفان نظر آئیں گے۔''

اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی اور اخبارات نکلنے سے پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف ماحول بن چکا تھا، لیکن انگریزوں نے اپنے موافق ماحول سازی کے لیے اخبارات جاری کیے جس کے خریدار وہ خود ہوا کرتے تھے اور کچھ معزز افراد، اس سے ماحول تو بنا نہیں بلکہ کمپنی کی خبروں سے کمپنی کے خلاف ہی ماحول بنتا گیا۔ جب اخبارات کا اضافہ ہوا اور عام ہندوستانی خرید کر پڑھنے لگے تب اخبار کی نوعیت بدلنے لگتی ہے اور ہندوستانی نمائندگی غالب آجاتی ہے، جس کی پاداش میں مالکان پر طرح طرح کے ستم ڈھائے جاتے ہیں جن میں سے 'دہلی اردو اخبار' کا ذکر ہو چکا ہے، دیگر چند اخبارات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

'صادق الاخبار' دہلی سے شائع ہوتا تھا جس کے مدیر مولوی جمیل الدین تھے۔ اس اخبار کا مقصد ہی جنگ آزادی کی بھرپور حمایت تھی جس کے ضمن میں انگریزوں کے خلاف تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ جس میں اشاروں کنایوں میں انگریزوں کو نیست و نابود کرنے کی ترغیب بھی ہوتی تھی۔ حب الوطنی کے معاملے میں اس قدر متشدد تھے کہ انگریزوں سے ذرہ برابر بھی ہمدردی گوارا نہیں کرتے، انہی رویوں کے باعث وہ عتاب کا شکار ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ تین سال قید کی سزا کاٹی نیز جائیداد بھی ضبط کر لی گئی۔

'گلشن نو بہار' عبدالقادر کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ یہ اگرچہ فارسی میں تھا لیکن اس میں اردو میں بھی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ مدیر نے اخبار ایکٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے باغیانہ مضامین چھاپنا شروع کر دیے، اودھ جب انگریزوں کے قبضے میں آگیا اس کے بعد جو حالات اودھ کے ہوئے اس پر شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ انگریزوں نے کارروائی کی، اخبار بند کروا دیا اور چھاپہ خانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔

منشی نولکشور کے 'اودھ اخبار' کا ذکر بھی ناگزیر ہوگا جنہوں نے اردو صحافت کو نئی راہ دی۔ یہ اخبار بظاہر انگریز دشمنی میں تو شامل نہیں تھا لیکن خبروں میں جب بھی موقع ملتا تو کوئی رعایت نہیں کرتا تھا۔ اس اخبار نے انگریز سرکار کی بد انتظامیوں پر کھل کر نکتہ چینی کی، نوابوں اور بادشاہوں کی عیاشیوں کے خلاف بھی لکھا، گویا کہ اس نے معاشرتی اور سیاسی شعور پیدا کیا۔ انگریز دشمنی کا یہ حال تھا کہ انگریزوں کو آستین کا سانپ لکھتا۔ مجاہدین آزادی کی خبروں کو تفصیل سے شائع کرتا جیسے اندور کے مجاہد آزادی سعادت خاں، پونہ کے مجاہد آزادی رام پرشاد، رام پور کے مجاہد آزادی نیاز احمد اور امیر خاں کی گرفتاری، چلائے گئے مقدمات، قید باصعوبت اور پھانسی کی سزا کی خبروں کو تفصیل سے شائع کرتا جن سے عوام میں انگریزوں کے خلاف بے چینی مزید بڑھتی۔

اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی اور اخبارات نکلنے سے پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف ماحول بن چکا تھا، لیکن انگریزوں نے اپنے موافق ماحول سازی کے لیے اخبارات جاری کیے جس کے خریدار وہ خود ہوا کرتے تھے اور کچھ معزز افراد، اس سے ماحول تو بنا نہیں بلکہ کمپنی کی خبروں سے کمپنی کے خلاف ہی ماحول بنتا گیا۔ جب اخبارات کا اضافہ ہوا اور عام ہندوستانی خرید کر پڑھنے لگے تب اخبار کی نوعیت بدلنے لگی ہے اور ہندوستانی نمائندگی غالب آجاتی ہے، جس کی پاداش میں مالکان پر طرح طرح کے ستم ڈھائے جاتے ہیں جن میں سے 'دہلی اردو اخبار' کا ذکر ہو چکا ہے، دیگر چند اخبارات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ سے ایک فارسی اخبار 'سلطان الاخبار' 1835 میں رجب علی سرور (صاحب فسانۂ عجائب نہیں) کی ادارت میں شائع ہوا، اس اخبار کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، کیونکہ اس کا رویہ اس زمانے کے دیگر فارسی اخباروں کے بالکل برعکس تھا۔ اکثر فارسی اخبار سرکار انگلشیہ کی پالیسیوں پر عمل درآمد کرتے تھے، لیکن اس نے شروع سے ہی علَم بغاوت بلند کیا۔ اپنے پہلے شمارے میں چھوٹی بڑی اٹھارہ خبریں شائع کرتا ہے، جس میں دوسری خبر 'خبر عدالت صدر کلکتہ' ہے، انگریزوں کی ناانصافی کی عبرت انگیز مثال بھی ہے۔ یہ خبر چھاپنا یقیناً بڑی ہمت کا کام تھا۔ رجب علی سرور کا یہ رویہ بعد کے شماروں میں بھی ملتا ہے جہاں وہ انگریزوں کے ذہنی و جسمانی ظلم و ستم کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے متعلق عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

''رجب علی لکھنوی پر زور قلم کے مالک تھے۔ لیکن ان کو فکر و نظر کی وہ بلندی نہیں ملی تھی جو رام موہن رائے کے حصے میں آئی تھی۔ وہ کھلی دوستی اور کھلی دشمنی کے قائل تھے۔ وہ خود تو حسینی نسب تھے، لیکن قلم کا انداز چنگیزی تھا۔''

اس عہد میں برصغیر سے اردو اخبارات جاری ہوئے، جنوب میں اردو اخبارات کا مرکز مدراس رہا۔ وہاں سے اردو کا پہلا اخبار 'اعظم الاخبار' 1848 میں جاری ہوا۔ یہ اخبار مسلمانوں میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید علوم کی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیتا ہے، جس سے مسلمانوں کی معیشت مضبوط ہو سکے۔ مدراس سے ہی ایک ہفتہ وار اخبار 'تیسیر الاخبار' 1849 میں جاری ہوتا ہے جس کے مالک حکیم عبدالباسط عشق تھے۔ دیگر اخباروں کی طرح اس کا بھی پہلا کالم انگریزوں کی خبروں کے لیے مختص ہوتا تھا۔ 1849 میں 'آفتاب عالم تاب' اور 1852 میں 'جامع الاخبار' ہفتہ واری جاری ہوتے تھے۔ ان اخبارات سے انگریزوں کی مداخلت اور ہندوستانیوں کے ساتھ معاملات کا بھی ذکر ملتا ہے۔

غدر کے سال کے اخبارات کے متعلق عتیق صدیقی لکھتے ہیں ''اس وقت ہمارے سامنے 1857 کے، جنوری سے ستمبر تک کے، مختلف اردو اخباروں کے جستہ جستہ شمارے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے آسمان پر 1857 کے اوائل ہی سے بغاوت کے بادل جمع ہونے لگے تھے اور ساتھ ہمارے اخباروں کا لہجہ تلخ حد تک تند و تیز ہونے لگا تھا۔''

الغرض اخبارات کی اس چھوٹی سی جماعت نے وہ بھرپور قربانی دی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ہے، انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی کا بگل بجانا ان ہی کا کارنامہ تھا۔ دیگر زبانوں کے اخبارات کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اردو اخبارات ذہن و دل کی تشکیل میں پیش پیش رہے۔ کیونکہ اردو کا مزاج ہی دیگر ہے۔ بقول ظ۔ انصاری:

''مزاج اس زبان کا بہر حال سوداوی ہے اسے گرمی جلدی چڑھتی ہے اور موسم بھی گرم ہو (کسی سیاسی یا ہنگامی مسئلے پر) تو اس کے بدن سے پسینے کے فوارے اور بھپکے چھوٹتے ہیں۔ ......گرم مزاجوں کو اس زبان کی صحافت راس آئی ہے۔ آتی ہی ہے۔ جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو کا منظر ہماری زبان کی صحافت میں الٹا چل رہا ہے۔ یہاں اخبار کے میدان کارزار میں توپ نکالی جاتی ہے۔''

■

Dr Amir Hamzah
Madarsa Mohallah
P.O Nawad. Via. Bishsungarh
Distt. Hazaribagh- 825312 (Jharkhand)
Mob.: 8877550086

مسرت

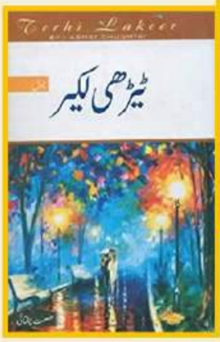

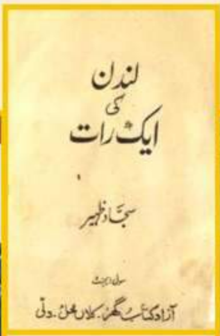

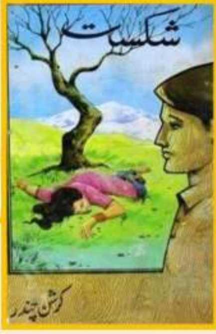

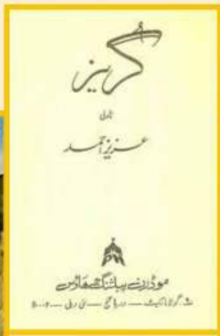

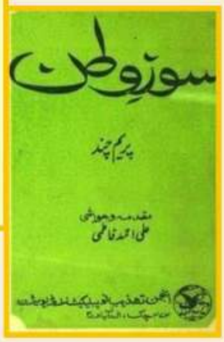

تحریک آزادی اور اردو فکشن

1857 کی ناکام بغاوت نے ہندوستانیوں کے دلوں میں خوف وہراس پیدا کردیا اور انگریزوں نے مکمل طور پر ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ان حالات سے ادب بھی اچھوتا نہیں رہا۔ جنگ آزادی میں اردو فکشن نے بھی مثبت کردار ادا کیا۔ اردو ناول نگاروں کے یہاں بھی آزادی کی تڑپ دکھائی دیتی ہے۔ اردو افسانوں کے ساتھ ساتھ اردو ناولوں میں بھی آزادی کی کسک اور ظالم و جابر حکومت کے خلاف شدید غم وغصہ اور احتجاج نظر آتا ہے۔

اردو افسانوں اور اردو ناولوں میں تحریک آزادی کے زیراثر ناول نگار ہندوستانیوں کے شعور کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اردو ناولوں میں چند ایک ایسے ناول ہیں جو اردو کا شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ افسانوں کے ذریعے بیشتر ادیبوں نے اپنے خیالات کا اظہار تحریک آزادی کے جذبے سے مغلوب ہوکر کیا ہے۔ آزادی سے قبل بھی چند ایک افسانے اور ناول منظر عام پر آئے جن میں قوم کے تئیں بیداری اور غلامی کی زنجیروں سے آزادی کا جذبہ موجود رہا۔ پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ 'سوز وطن' (1908) میں حب الوطنی کی جھلک نظر آتی ہے۔ سوز وطن پانچ کہانیوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ ہے جس میں 'دنیا کا سب سے انمول رتن'، 'شیخ مخمور'، 'میرا وطن ہے'، 'صلہ ماتم'، 'عشق دنیا' اور 'حب وطن' شامل ہیں۔ 'سوز وطن' کے بیشتر افسانوں میں بغاوت اور حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ہے۔ 'یہی میرا وطن ہے' میں ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنے دیس سے دور دوسرے ملک میں طویل مدت تک رہا ہے اور اب اپنے وطن واپس آیا ہے۔

'عشق دنیا' اور 'حب الوطنی' میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ سوز وطن کی تمام کہانیوں میں وطن کے تئیں عقیدت اور احترام کا جذبہ نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک وطن سے محبت ہی سچی عقیدت کی نشانی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

جوان مرد کی آواز مدہم ہوگئی۔ اعضا ڈھیلے ہوگئے۔ خون اس کثرت سے بہا کہ اب خود بخود بند ہوگیا۔ رہ رہ کر ایک آدھ قطرہ ٹپک پڑتا تھا۔ آخر کار سارا جسم بیدم ہو گیا۔ قلب کی حرکت بند ہوگئی۔ اور آنکھیں مند گئیں۔ دلفگار نے سمجھا اب کام تمام ہوگیا کہ مرنے والے نے آہستہ سے کہا۔ ''بھارت ماتا کی جے'' اور اس کے سینے سے آخری قطرہ خون نکل پڑا۔

ایک سچے محبّ وطن اور دیس بھگت نے حب الوطنی کا حق ادا کردیا۔ دلفگار اس نظارے سے بیحد متاثر ہوا۔ اور اس کے دل نے کہا بیشک دنیا میں اس قطرہ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہوسکتی۔ اس نے فوراً اس رشک لعل رمانی کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس دلیر راجپوت کی بسالت پر عش عش کرتا ہوا عازم وطن ہوا۔ اور وہی سختیاں جھیلتا ہوا بالا آخر ایک مدت دراز میں ملکہ اقلیم خوبی اور در صدف محبوبی کے در دولت پر جا پہونچا۔ اور پیغام دیا کہ دلفگار سرخرو و کامگار لوٹا ہے اور دربار گہر بار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے اسے فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا۔

ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ کریں:

''وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔''

(افسانہ: دنیا کا سب سے انمول رتن)

اس افسانے میں حب الوطنی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ وطن پر مر مٹنے والا ہی دراصل سچا محبّ وطن اور قوم پرست ہوتا ہے۔

پریم چند نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناولوں میں بھی حب وطن کے جذبے کو پیش کیا ہے۔ گئو دان، میدان عمل اور گوشۂ عافیت میں انھوں نے تحریک آزادی کے جذبے کو اول مقام پر رکھا ہے۔ پریم چند کا زمانہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بہت سی سیاسی تحریکات جنم لے چکی تھیں۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں سیاسی مکر وفریب، محنت کش عوام، مزدور طبقہ اور معاشی طور پر پست طبقات کے لوگوں کی نشان دہی کی ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری سے متاثر ہوکر ستیہ پال آنند لکھتے ہیں:

''پریم چند نے تحریک آزادی کے تین ادوار دیکھے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے پہلے برس یعنی 1901 میں لکھنا شروع کیا اور 1936 میں اپنی موت کے آخری دن تک باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ اس لمبے عرصے میں انھوں نے تیرہ ناول اور لگ بھگ تین سو افسانے لکھے۔ ان میں سے کئی افسانے اب تک اردو میں شائع نہیں ہوئے۔ 36 برس کے اس سفر میں پریم چند نے جو لکھا اس کا اگر بنظر غور مطالعہ کیا جائے تو اس عہد کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کی صحیح تصویر مل سکتی ہے۔ ہماری آزادی کی تحریک کے یہ تین ادوار سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں۔

(تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مرتب: ناشر نقوی، 1988، ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ، بالی گرافر پریس، فرید آباد، ہریانہ)

پریم چند کی ناول نگاری کا زمانہ سیاسی انتشار اور سماجی سطح پر بہت سی تبدیلیوں کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے بیشتر ناولوں کے کردار آزادی کی حمایت

کرتے ہیں اور آزادی کے گیت گاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے بعد پریم چند کا دور ختم ہوگیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام 1935 میں ہوا اس کے ایک سال بعد پریم چند اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اس زمانے میں تحریک آزادی کی لڑائی اپنے عروج پر تھی۔ اس دور میں بہت سے ادیبوں اور فکشن نگاروں نے اپنی نگارشات میں تحریک آزادی کے جذبے کو فروغ دیا۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، مرزا سعید، اپندر ناتھ اشک، عزیز احمد، رشید اختر ندوی، رشید جہاں، فضل حق قریشی، اشرف صبوحی، انصار ناصری وغیرہ کے نام ابھر کر سامنے آئے۔ ان تمام فکشن نگاروں کے یہاں ذہنی خلفشار، معاشی بحران، طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے۔ ذہنی الجھنوں کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے موضوعات کے اردگرد ان کے ناول گھومتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے ناول 'ٹیڑھی لکیر' میں بھی اس نوع کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ کرشن چندر کے ناول 'شکست'، سجاد ظہیر کے ناول 'لندن کی ایک رات' اور عزیز احمد کے ناول 'گریز' میں دبا دبا احتجاج اور سیاسی رسا کشی واضح انداز میں سامنے آتی ہے۔

عصمت چغتائی کے ناول 'ٹیڑھی لکیر' میں حب الوطنی کا جذبہ موجود ہے۔ اس ناول میں بہت سی عبارتیں وطن پرستی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایک نسائی کردار کو بٹلر سے عشق ہوگیا ہے لیکن اسے انگریزوں سے نفرت بھی تھی:

''تم ان عمارتوں کے لیے خود سے لڑ رہے ہو، پر ہمیں بھی بارود کی جگہ جھونک رہے ہو۔'' اس نے انتہائی زہریلے انداز سے کہا کہ بٹلر جو پرشوق نگاہوں سے تصویروں کو دیکھ رہا تھا کھسیانہ ہوگیا اور اس کا منہ اتر گیا۔ (ناول: ٹیڑھی لکیر)

کرشن چندر نے گو کہ فطرت کی منظرکشی کی ہے لیکن تحریک آزادی کے جذبے سے مملو ان کے ایک دو افسانے بھی منظر عام پر آئے۔ ترقی پسند تحریک کے زیراثر طبقاتی کشمکش، استحصال اور غلامی کے خلاف بغاوت، عدم مساوات جیسے موضوعات زیر بحث آئے۔ آزادی کے متوالوں نے اس ضمن میں بھی اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں فکر وشعور اور کمال فن کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ 'دو فرلانگ لمبی سڑک' کرشن چندر کا اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ طنزیہ لہجے میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں پورے ملک کی مجموعی سیاست اور حالات کی منظرکشی کی گئی ہے اور معاشرے کی صورت حال کا بیان واضح انداز میں سامنے آیا ہے۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ 'آخری کوشش' ان کا نمائندہ افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ احمد علی کے افسانے 'ہماری گلی'، اور 'میرا کمرہ' سعادت حسن منٹو کا 'نیا قانون' اہمیت کے حامل افسانے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ابراہیم جلیس، اختر اورینوی، حسن عسکری، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک اور خواجہ احمد عباس کے نام افسانہ نگاری کے میدان میں نظر آتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے اہم افسانوں میں شرابی، سوراج کے لیے، اور 'نیا قانون' میں تحریک آزادی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ 'نیا قانون' اس دور میں لکھا گیا جب ہمارا ملک انگریزوں کے زیر اقتدار تھا۔ منگو کوچوان جو اس افسانے کا اہم کردار ہے اس کو انگریزی حکومت سے چڑ تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس کا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ منگو کوچوان اگرچہ پڑھا لکھا نہیں ہے پھر بھی وہ انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کو ایک دن معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں نیا قانون آنے والا ہے جس سے ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوجائے گا۔ 'نیا قانون' کا اقتباس ملاحظہ کریں:

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے،

''سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا... یا ہر چیز بدل جائے گی؟''

''ہر چیز تو نہیں بدلے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندستانیوں کو آزادی مل جائے گی؟''

دوسرا اقتباس ملاحظہ کریں:

''وہ بے حد مسرور تھا، خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں... سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔''

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ وہ اس کو ایسی 'چیز' سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ 'نیا قانون...!' وہ دن میں کئی بار سوچتا، یعنی کوئی 'نئی چیز!' اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ ساز آ جاتا۔ جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدابخش سے اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی 'نئے قانون' کا درخشاں وتاباں ہونا ضروری تھا۔ (افسانہ: نیا قانون)

منٹو کے خیالات دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے برعکس تھے۔ ان کے افسانوں میں جہاں طوائف اور کوٹھے والیاں اہم کردار ہیں وہیں انھوں نے حب الوطنی کے لیے جدو جہد کو افسانوں میں ظاہر کیا ہے۔ منٹو کی کہانیوں کو نکارا گیا، ان پر مقدمہ چلایا گیا لیکن انھوں نے افسانوں کو اپنے جذبات کے لیے منتخب کیا۔ ان کے بیشتر افسانے زوال اقدار کا نوحہ پیش کرتے ہیں۔ انسانیت اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات سے مملو ان کا افسانہ 'سوراج کے لیے' بے چین کر دینے والی کہانی ہے۔:

''رات کی رانی اور چمبیلی کی ملی جلی سوندھی سوندھی خوشبو، شام کی ہلکی پھلکی ہوا میں تیر رہی تھی، بہت سہانا سماں تھا، بابا جی کی آواز آج اور بھی میٹھی تھی۔ غلام علی اور نگار کی شادی پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرنے کے بعد انھوں نے کہا: یہ دونوں بچے اب زیادہ تندہی اور خلوص سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کریں گے۔ کیونکہ شادی کا صحیح مقصد مرد اور عورت کی پرخلوص دوستی ہے۔ ایک دوسرے کے دوست بن کر غلام علی اور نگار یکجہتی سے سوراج کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔ یورپ میں ایسی کئی شادیاں ہوتی ہیں جن کا مطلب دوستی اور صرف دوستی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ قابل احترام ہیں جو اپنی زندگی سے شہوت نکال پھینکتے ہیں۔''

دوسرا اقتباس ملاحظہ کریں:

''جلیانوالہ باغ کی خنک فضا دیر تک تالیوں کے بے پناہ شور سے گونجتی رہی۔ شہزادہ غلام علی جذباتی ہوگیا۔ اس کے کشمیری چہرے پر سرخیاں دوڑنے لگیں۔ جذبات کی اسی دوڑ میں اس نے نگار کو بلند آواز میں مخاطب کیا،'' نگار! تم ایک غلام بچے کی ماں بنو... کیا تمہیں یہ گوارا ہوگا؟''

نگار جو کچھ شادی ہونے پر اور کچھ بابا جی کی تقریر سن کر بوکھلائی ہوئی تھی، یہ کڑک سوال سن کر اور بھی بوکھلا گئی۔ صرف اتنا کہہ سکی: ''جی..؟ جی نہیں۔'' (افسانہ: سوراج کے لیے)

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو فکشن نے عوام کو بیدار کرنے اور ان کو متحرک رکھنے میں اہم رول ادا کیا جس کی وجہ سے ہندوستانی عوام میں تحریک آزادی کے لیے جوش و جذبہ پیدا ہوا اور ان کے خیالات میں پختگی آئی۔

■

Musarrat
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

عبدالسمیع

تحریک آزادی میں اردو زبان کا کردار

اردو زبان ھی کی صحافت اور نظم و نثر نے ایوان فرنگی کی بنیادیں ھلا دی تھیں اور حکومت انگلستان کی نیند حرام کر دی تھی۔آخری مغل بادشاہ بھادر شاہ ظفر جن کی قیادت میں 1857کی جنگ آزادی کا بگل بجا اور آزاد ملک ھندوستان کے پھلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اردو زبان کے شیدائی تھے اردو زبان کے اشعار،اقوال اور نعرے مجاھدین آزادی کی رگوں میں جوش وولولہ بھر دیتے تھے اور وطن کی محبت سے سرشار ھوکر مسکراتے ھوئے تختۂ دارپر چڑھ جانے اور سر کٹانے پر آمادہ کر دیتے تھے۔

تحریک آزادی اور اردوزبان کا مضبوط واٹوٹ رشتہ ہے۔تحریک آزادی میں اردو کا کردارمجاہدانہ اور نمایاں رہاہے۔اردو زبان کی ترقی وترویج میں تحریک آزادی کے متوالوں نے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ اردو زبان ہی کی صحافت اور نظم ونثر نے ایوانِ فرنگی کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور حکومت انگلستان کی نیند حرام کردی تھی۔آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر جن کی قیادت میں 1857 کی جنگ آزادی کا بگل بجا اور آزاد ملک ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اردو زبان کے شیدائی تھے اردوزبان کے اشعار،اقوال اورنعرے مجاہدین آزادی کی رگوں میں جوش وولولہ بھر دیتے تھے اور وطن کی محبت سے سرشار ہوکر مسکراتے ہوئے تختہ ٔدار پر چڑھ جانے اور سر کٹانے پر آمادہ کر دیتے تھے۔بزرگ مجاہد آزادی مہر چند آہوجہ کے یہ الفاظ کتنے سچے ہیں:

''ہم مجاہدین آزادی کی جس زبان نے فرنگی حکومت کی بنیادوں میں زلزلے ڈالے وہ زبان صرف اردو تھی۔بلکہ یہ بھی میرا ایمان ہے کہ اردو نے دوسری زبانوں کے مقابلہ میں حب الوطنی کے جذبوں کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی۔آزادی کی داستان سناتے ہوئے مجھے اکثر یہ شعر یاد آتا ہے ؎

اپنے محبوب سے جب پیار کیا تھا میں نے
کاسۂ سر میں لہو بھر کے دیا تھا میں نے

اردو کو کل بھی ایک تحریک سمجھتا تھا اور آج بھی ایک تحریک سمجھتا ہوں ہمالہ کی بلندیوں سے گنگا وجمنا کی مچلتی لہروں تک اردو کی وسعتیں پھیلی ہوئی ہیں۔آزادی اور انقلاب کی جب مجھے یاد آتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ بنکے بابو،روی ٹھاکر،لوک مان تلک، بال، پال اور لال جیسے قدآور مجاہدین آزادی نے جب لوگوں کو کرانتی امر ہے سمجھانا چاہا تو عوام پورے طور پر نہ سمجھ سکے لیکن جب سردار بھگت سنگھ اور وتیکشور دت نے اسمبلی ہال میں اردو کے دو لفظ 'انقلاب زندہ اباد، للکارے تو ہندوستانیوں کو انقلاب کے معنی معلوم ہوگئے۔''

(تحریک: مہر چند آہوجہ،مشمولہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ،مرتب: ناشر نقوی، ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ 1988،ص 8-7)

انگریزوں کے ظلم واستبداد کی روداد اردو کے تمام شعرا اور ادبا نے بیان کی ہے اردو اخبارات کے اکثر مدیران حضرات بڑی بیباکی اور جرأت کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کے بارے میں لکھتے۔اسی جرم کی پاداش میں مولانا محمد باقر کو اپنی جان گنوانی پڑی۔جیل کی سلاخوں کے پیچھے تو اس قدر صحافی گئے جن کے تذکرے کے لیے پوری کتاب درکار ہے۔ان اخبارات میں شائع ہونے والی آزادی کے جذبہ سے بھرپور نظموں نے بھی انقلابی جذبات کو ابھارا اور نوجوانوں کو ہر طرح کی قربانی دینے پر آمادہ کیا،رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خاں جیسے مجاہدین سرفروشی کی تمنا اور جذبہ لیے تختۂ دار پر چڑھ گئے اور مجاہدین آزادی کا جوش جنوں اور آزادی کی پیاس بڑھا گئے۔اس طرح تحریک آزادی پورے ملک میں پھیل گئی اور بالآخر انگریزوں کو اس ملک سے جانا ہی پڑا ان اخبارات کے مدیر ہندو مسلم دونوں تھے ان مدیروں اور ذمے داروں میں مہاشہ کرشن،ساغر نظامی، دیا نارائن نگم، ڈاکٹر مکند لال، جوش ملیح آبادی، رائے گنیش لال، سیماب اکبر آبادی، منشی ایودھیا پرشاد، عزیز حسن بقائی، دیوان سنگھ مفتوں، عبدالرزاق ملیح آبادی، راجہ رائے سنگھ وغیرہ شامل ہیں۔ڈاکٹر چندر شیکھر لکھتے ہیں:

آزادی کا امرت مہوتسو

اردو شاعری جنگ آزادی کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ ابتدائی شاعری میں انگریزی سامراج کا تسلط ان کا ظلم وستم اورتباہی و بربادی کو بیان کیا گیا ہے بعد میں حب الوطنی کے جذبات اورسامراجی قوت کے خلاف بغاوت کی چنگاری بھڑکائی گئی ہے۔ اردو شاعری کی تقریباًتمام اصناف میں جنگ آزادی اور انقلاب کا ذکر بڑے جوش وولولے سے ملتا ہے سنجیدہ اور مزاحیہ وطنزیہ دونوں قسم کی شاعری میں تحریک آزادی کے جذبات کاذکر ہوا ہے

''تحریک آزادی اور اردو زبان کا اس میں حصہ دو مختلف عناصر قرار دینا، تحریک آزادی کی تاریخ کے ساتھ ناانصافی کا پہلو ہوگی۔ یہ قول اس بات پر مبنی ہے کہ اگر برطانوی حکومت نے فارسی زبان کو منسوخ کر کے اردو زبان کو فروغ دینے اور ایک طور پر سرکاری زبان بنانے کا رادہ کیا تو اس سے فارسی زبان کا مستقبل تو ضرور ہندوستان میں تاریک ہوگیا مگر اردو زبان کو جو ترقی ایک صدی سے کم عرصہ میں حاصل ہوئی وہ شاید دنیا کی کسی زبان کو اتنے کم عرصے میں نہ ہوئی ہوگی۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں نے اگر یورپ میں تعلیم حاصل کر کے انگریزی زبان سیکھ کر ملت کو ایک راہ پر گامزن کیا تو اس قوم اور ملت کو یکجا کرنے کا سہرا اردو زبان کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ اردو زبان ہندوستان کے تمام لوگوں کی مشترکہ زبان رہی ہے۔ تحریک آزادی کی اگر زبان تھی تو وہ دراصل اردو تھی۔''

(تحریک آزادی اور اردو ادب: ڈاکٹر چندر شیکھر مشمولہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مرتب ناشر نقوی ہریانہ اردو اکادمی، ص118)

اردو کے افسانہ نگار پریم چند کے افسانوں میں حب الوطنی اور ہندوستانیوں کے مسائل کی عکاسی بخوبی ملتی ہے ان کے کئی افسانوں پر پابندی اور افسانوی مجموعوں کی ضبطی اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریزی حکومت ان کی تحریروں سے خائف تھی۔ پریم چند کے پہلے افسانہ 'دنیا کا انمول رتن' میں وطن کی آزادی کی خاطر بہائے گئے خون کے قطرے کو ہی انمول رتن قرار دیا گیا ہے۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنھوں نے اپنی تحریروں اور اشعار کے ذریعے انگریزوں کے ہندوستانیوں پر مظالم کو بیان کیا ہے اور اپنے مضامین اور اشعار میں آزادی کے جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ان ادبا اور شعراء نے انگریزی استبداد کے خلاف جہاد کیا اور جانی و مالی ہر طرح کی قربانیاں پیش کر کے سرخرو ہوئے ان لوگوں نے نہ صرف قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں بلکہ جانوں کے نذرانے بھی پیش کیے۔ ان کے اشعار پر پابندی لگی اور ان کی جذبۂ آزادی سے سرشار تحریریں، کتابوں اور اخبارات ورسائل کو ضبط بھی کیا گیا۔ مگر سامراجی قوت کے سامنے مجاہدین اردو نے سر تسلیم خم نہیں کیا بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سردار بھی یہی کہتے رہے۔

سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں

اردو شاعری جنگ آزادی کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ ابتدائی شاعری میں انگریزی سامراج کا تسلط ان کا ظلم وستم اور تباہی و بربادی کو بیان کیا گیا ہے بعد میں حب الوطنی کے جذبات اور سامراجی قوت کے خلاف بغاوت کی چنگاری بھڑکائی گئی ہے۔ اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں جنگِ آزادی اور انقلاب کا ذکر بڑے جوش وولولے سے ملتا ہے سنجیدہ اور مزاحیہ وطنزیہ دونوں قسم کی شاعری میں تحریک آزادی کے جذبات کا ذکر ہوا ہے مختلف صوبوں، علاقوں، مذاہب، ذاتوں، فرقوں سے مجاہدین آزادی کا تعلق تھا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

جیسے سیکڑوں اشعار جذبۂ وطنیت اور آزادی کی آگ کو شعلہ زن کررہے تھے۔

حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، پنڈت برج نارائن چکبست، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مجاز، کیفی اعظمی، اختر الایمان، پنڈت آنند نرائن ملا وغیرہ نے اپنی شاعری اور تن من دھن سے تحریکِ آزادی کو توانائی اور زندگی بخشی۔ جنگ آزادی میں اردو زبان نے تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اور ہمیشہ اردو زبان انگریزی سامراج سے نبرد آزما رہی ہے۔ علی سردار جعفری نے صحیح لکھا ہے:

''اردو والوں نے آزادی کی جدو جہد کو قومی دائرے تک محدود نہیں رکھا اس کے دائرے مابین قومیت ملائے اور اس طرح عوام میں ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور بیدار کیا۔ اردو ادب نے جس طرح ملک کو آزاد کرانے میں اہم رول انجام دیا اسی طرح وہ پندرہ اگست 1947 سے لے کر آج تک ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہے۔''

(ہندوستان میں اردو کا ماضی حال اور مستقبل ڈاکٹر محمد نعمان مشمولہ جنگ آزادی میں اردو کا حصہ، مرتب اقبال بیدار، بزم اقبال پبلیکیشنز گلشن اقبال بھوپال، 1998، ص57)

اردو نثر کی تمام اصناف ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز ومزاح، خودنوشت وسوانح اور صحافت نے تحریک آزادی میں اہم رول نبھایا ہے۔ پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری وغیرہ کے ناولوں میں براہِ راست اور بالواسطہ طور پر تحریک آزادی کی جدوجہد اور کوششوں وقربانیوں کے نمونے ملتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاروں نے آزادی کے جذبات واحساسات، قدر وقیمت اور آزادی کی ضرورت واہمیت پر کافی افسانے لکھے ہیں۔ پریم چند، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، احمد علی، عصمت چغتائی وغیرہ کے افسانوں میں تحریک آزادی کا جذبہ اور جوش وولولہ صاف طور پر نظر آتا ہے۔

طنز ومزاح کے باب میں اودھ پنچ سے کون ناواقف ہوگا اس اخبار کے قلمکاروں نے طنز ومزاح کے پیرائے میں تحریک آزادی کے بارے میں اہم مواد پیش کیا ہے۔

ڈرامہ براہِ راست احساسات وجذبات کو مہمیز کرتا ہے اس صنف کے ذریعے بھی آزادی کو موثر بنانے کی سعی کی گئی ہے۔ تحریک آزادی کی کوششوں اور سعی پیہم کو جن ڈراموں کے ذریعے بڑھاوا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح کے ڈراموں میں مولانا ظفر علی خاں کا ڈرامہ 'جنگ روس وجاپان'، امراؤ علی کا ڈرامہ 'البرٹ بل'، محشر انبالوی کا ڈرامہ 'غریب ہندوستانی'، اصغر علی نظامی کا ڈرامہ 'قومی دلبر'، نیر انبالوی کا ڈرامہ 'وطن'، محمد دین تاثیر کا 'لیلائے وطن'، شمس لکھنوی کے ڈرامے 'حب الوطن اور مادر وطن'، محی الدین عزم کا 'دیس کی پکار'، دل لکھنوی کا 'شہید وطن'، محمد مجیب کا ڈرامہ 'آزمائش' وغیرہ کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

اردو نثر کی تحریک آزادی میں خدمات کے بارے میں پروفیسر ضیاء الرحمان صدیقی رقمطراز ہیں:

''انگریزوں نے اپنے نو آبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے جن تصورات کو فروغ دیا ان میں قومیت

کا شعور بھی تھا، جو ہندوستان کے حق میں آزادی کی نعمت کا مقدمہ ثابت ہوا۔ ہندوستان میں قومی شعور کی بیداری کے ساتھ جنگ آزادی میں تیزی اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

تحریک آزادی کے فروغ اور قومی شعور کی بیداری میں اردو زبان و ادب نے عموماً اور اردو نثر نے خصوصاً ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا اور آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی۔''

(تحریک آزادی اردو نثر اور مسلم ادبا، ڈاکٹر ضیا الرحمٰن صدیقی، راجستھان وقف بورڈ جے پور 1997، ص 7)

تحریک آزادی کے سلسلے میں قابلِ قدر اور وقیع مواد، خطبات و تقاریر، خودنوشت وسوانح سے آزادی کے مقاصد ونصب العین کے بارے میں بھی ملتا ہے۔ مکتوبات اور خطوط کے ذریعے بھی تحریک آزادی کی جدو جہد کی گئی اور جنگ لڑی گئی۔ تحریک ریشمی رومال کا مرکزی نکتہ خط ہی تھا، بہت سے مجاہدین آزادی کے خطوط ومکاتیب مجموعے کی شکل میں مرتب ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں جن سے ان خطوط کی اہمیت وافادیت اور ضرورت کا پتہ چلتا ہے۔ ان مکاتیب نے تحریک آزادی میں مجاہدین اور سرفروشانِ آزادی کو منصوبہ، جذبہ، حوصلہ، ولولہ اور عزمِ مصمم عطا کیا۔

خطبہ و تقریر انسانی جذبات واحساسات کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں۔ تحریک آزادی کی جدوجہد یا ہندوستانیوں کی تعلیم وتربیت اور فلاح وبہبود کی خاطر انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے، ان کے جلسوں میں جو تقریریں ہوئیں اب ان کے مجموعے مرتب ہو کر شائع ہوگئے ہیں۔ اردو زبان وبیان کی سلاست کے ذریعے مقررین مجاہدین آزادی میں جوش عمل اور جذبہ وولولہ پیدا کردیتے تھے۔ کانگریس، مجلس خلافت، مسلم لیگ، جمعیت علمائے ہند، مجلس اتحاد مسلمین، تحریک ریشمی رومال، مجلس احرار، خدائی خدمت گار وغیرہ کے اجلاس یا کانفرنسوں میں اردو زبان میں تقریریں ہوتی تھیں۔ عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، بہادر یار جنگ، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ کی اردو تقریریں اور صدارتی خطبات طبع ہو چکے ہیں جو مجاہدین آزادی اور اکابرین دوسری زبانوں میں خطاب کرتے اور ان کی تقریر کا ترجمہ اردو زبان میں کیا جاتا تھا ایسے اکابرین وآزادی کے متوالوں میں موتی لال نہرو، سبھاش چندر بوس، پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی، راجندر پرشاد، سروجنی نائیڈو، سردار پٹیل، جے پی کرپلانی، دیش بندھو، گوپال کرشن گوکھلے وغیرہ شامل ہیں۔ گاندھی جی کی تقریروں کا اردو ترجمہ شدہ مجموعہ 'قوم کی آواز'، گوپال کرشن گوکھلے کی تقریروں کا مجموعہ 'گوکھلے کی تحریریں'، جواہر لال نہرو کے خطبات صدارت کا اردو مجموعہ 'ہندوستان کا اتحاد'، سبھاش چندر بوس کی تقاریر کا اردو مجموعہ 'سبھاش بابو کی تقریریں' وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔

تحریک آزادی کے دور میں آپسی رابطہ اور پیغام کے ارسال وترسیل کا اہم ذریعہ خطوط تھے۔ اردو ادب میں خطوط غالب کی اہمیت وافادیت مسلم ہے ان خطوط میں بھی 1857 کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کا بہترین نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مجاہدین آزادی اپنے منصوبے، پلان یا کسی کو اپنا ہم خیال بنانے یا آزادی کی کوششوں اور جدوجہد کے اقدام سے آگاہ کرنے کی خاطر خطوط لکھا کرتے تھے۔ یہ خطوط ہندوستانیوں کے سیاسی وقومی مسائل، قوم وملک کے لیے جدوجہد اور آزادی کے عزائم سے بھرپور ہوتے تھے۔ قومی وسیاسی سرگرمیوں اور آزادی کی کوششوں کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ علی برادران، سید سلیمان ندوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبدالماجد دریابادی، حسرت موہانی، عبیداللہ سندھی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد مدنی، ابوالکلام آزاد وغیرہ کے خطوط اس سلسلے میں اہمیت کے حامل ہیں۔ مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور محمد علی جناح کے درمیان جدوجہد کے سلسلے میں جو مراسلت ہوئی اس کا اردو ترجمہ نظامی پریس بدایوں سے 1938 میں شائع ہوا، دو اور ترجمے حیدرآباد اور ممبئی سے شائع ہوئے ان کا نام 'قائدین کے خطوط جناح کے نام' اور 'گفتگوئے مصالحت' ہے۔ گاندھی جی اور بی سی جوشی کے درمیان ہونے والی مراسلت کا اردو ترجمہ 'گاندھی جوشی خط و کتابت' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔

مختلف اداروں، تحریکوں اور جماعتوں کے دفتری کام کاج، اندراجات، منشور ومنصوبے، مقاصد اور کارروائیاں اردو زبان میں ہوتی تھیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل رقمطراز ہیں:

''سیاسی جماعتوں میں سے جنھوں نے اپنے مقاصد اور نصب العین کی تکمیل اور اپنے خیالات ونظریات کی تشہیر کے لیے اردو زبان کا سہارا لیا ان میں مجلس خلافت، جمعیۃ العلمائے ہند، جمعیۃ العلمائے اسلام، آل پارٹیز کانفرنس، مجلس احرار اسلام، خدائی خدمت گار، شیعہ پولٹیکل کانفرنس اور خاکسار تحریک قابل ذکر ہیں۔

مجلس خلافت کا زیادہ تر کام اردو میں ہوا۔ اس کے اجلاس کی تمام تر کارروائیاں عام طور پر اردو میں ہوتی تھیں۔ اس کی جانب سے شائع ہونے والا تحریکی ادب عام استفادے کے خیال سے اردو میں شائع کیا جاتا۔ اس نے اپنے مقاصد کی مقبولیت اور تشہیر کے لیے اردو روزنامہ خلافت بھی جاری کیا جو تحریک خلافت کے دوران بہت مقبول تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں تک یہ جاری رہا۔ مجلس خلافت کا منشور اس کے کتابچے اور اسناد ودستاویزات اور خطبات وقراردادیں سب اردو میں مطبوعہ ہیں۔''

(تحریک آزادی میں اردو کا حصہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 1976، ص 766-67)

اردو زبان وادب کا رشتہ تحریک آزادی سے اٹوٹ ہے اور اس کا کردار ناقابل فراموش ہے اردو مجاہدین آزادی کی مشترکہ وراثت اور روایات کی ضامن ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد گنگا جمنی تہذیب، آپسی محبت ومؤدت اور اخوت و بھائی چارگی کا ذریعہ ہے، جہد مسلسل، سعی پیہم کی عمدہ مثال ہے ملک وقوم کو اتحاد کے دھاگے سے جوڑے رہنے والی زبان ہے۔

اردو زبان و ادب کا رشتہ تحریک آزادی سے اٹوٹ ہے اور اس کا کردار ناقابل فراموش ہے اردو مجاہدین آزادی کی مشترکہ وراثت اور روایات کی ضامن ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد گنگا جمنی تہذیب ،آپسی محبت ومؤدت اور اخوت و بھائی چارگی کا ذریعہ ہے ، جہد مسلسل ،سعی پیہم کی عمدہ مثال ہے ملک وقوم کو اتحاد کے دھاگے سے جوڑے رہنے والی زبان ہے۔

■

Dr. Abdus Samee
B N Degree College
Hardoi - 241124 (UP)
Mob.:9170389242

مہر فاطمہ

تحریک آزادی اور اردو شاعری

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کو عربی، فارسی یا ایرانی لسانی وثقافتی عوامل نے کم وبیش متاثر کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی یعنی ہندو، بدھی، جینی اور بھکتی وادی افکار وتصورات سے بھی اردو تہذیب وثقافت اور اردو شعر وادب کا دامن مالا مال ہے، بقول حسن عسکری اردو زبان سے عظیم تر کوئی چیز ہم نے ہندوستان کو نہیں دی، اس کی قیمت تاج محل سے ہزاروں گنا زیادہ ہے، ہمیں اس زبان پر فخر ہے، ہمیں اس کی ہندوستانیت پر فخر ہے، اور ہم اس ہندوستانیت کو عربیت یا ایرانیت سے بدلنے کے لیے قطعی تیار نہیں ہیں، اس زبان کے لب ولہجے میں، اس کے الفاظ اور جملوں کی ساخت میں ہماری بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں۔ اور ہم نے مانجھ مانجھ کر اس زبان کی ہندوستانیت کو چمکایا ہے۔

بھکتی تحریک اور تصور کے سائے میں پنپنے والی قدروں کے بغیر اردو تہذیب بے معنیٰ ہوکر رہ جاتی ہے۔ تاریخ اور ادب کا ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم بھی بخوبی واقف ہے کہ اردو جدید ہند آریائی زبان ہے، جو کھڑی بولی، ہریانوی اور برج بھاشا سے مل کر تیار ہوئی۔ یہ خالص ہندوستانی پیداوار ہے اور قومی یکجہتی کا منہ بولتا ثبوت ہے، گنگا جمنی تہذیب کی علامت کے طور پر کوئی دوسری زبان اردو کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتی، اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کی معتبر ڈکشنری فرہنگ آصفیہ جس میں 59000 الفاظ ہیں، جس میں سے پچاس فیصدی الفاظ ہندوستانی، پچیس فیصدی الفاظ ہندی اور فارسی اور پچیس فیصدی عربی اور دیگر کے میل سے بنے ہیں۔

اردو ادب میں رستم و اسفندیار کی داستان کے ساتھ ساتھ کرشن اور ارجن کے واقعات بھی موجود ہیں، شیریں اور لیلیٰ کی محبوبانہ دلنوازیوں کے ساتھ ساتھ شکنتلا اور رادھا کے والہانہ عشق کا بھی بیان نفسی طمانیت کا سامان بنتا ہے۔ یوسف و زلیخا اور بلقیس و سلیمان کے ساتھ ساتھ رام وسیتا، کرشن ورادھا بھی اردو شاعری اور قصہ گوئی میں اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہیں، اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ہماری گنگا جمنی زبان بھی ہے اور گنگا جمنا کی طرح اس کے دھارے دوسری زبانوں سے الگ بھی بہتے ہیں، پھر سنگم پر ایک بھی ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی جانوروں، پرندوں، پہاڑوں، موسموں، جنگلوں، درختوں، پھلوں اور پھولوں کے دلکش مناظر اردو شعر وادب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ اردو ادب کی وہ کون سی صنف ہے جس کے خمیر میں ہندوستانی اثر موجود نہیں ہے۔ شاعری میں قصائد، غزلیات، مثنویات، مراثی، شہر آشوب، رباعیات، قطعات، گیت، دوہے اور دیگر منظومات غرض ہر صنف کی رگوں میں ہندوستانی مٹی، دریا، پہاڑ، سمندر، جنگلات، گاؤں اور شہر وغیرہ کا لہو رواں دواں ہے۔

اردو نظم کی ابتدا ہی فطری مناظر، ہندوستانی رسم و رواج اور حب الوطنی ہوتی ہے، خسرو سے نظیر تک صرف نظموں کے عنوان پر ہی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہندستانی رنگ و آہنگ اور ہندوستانی ثقافت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا تو اردو نظموں میں حب الوطنی کے باقاعدہ ترانے گائے جانے لگے۔ اقبال، جوش، فیض، چکبست، سرور جہان آبادی، تلوک چند محروم اور جمیل مظہری، کس کس کا نام لیا جائے۔

اقبال نے بال جبریل کی ابتداء ہی بھرتری ہری کے شعر سے کی ہے، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز آخری زمانے کے مجموعے ہیں، یہ دونوں مجموعے اخوت انسانی اور حب وطنی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ بندگی نامہ ہندوستانی تلمیحات و اشارات سے پر ہے۔ جاوید نامہ میں شیو جی کو دوست کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ کیا اس کے بعد یہ کہنے کا جواز باقی رہ جاتا ہے کہ اقبال ہندوستانی تہذیب یا مشترکہ تہذیب یا اقدار سے منحرف ہو گئے تھے۔

وہیں چکبست کی نظموں پر نظر ڈالیں تو حب وطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔ ان کی نظم خاک وطن سے ایک بند۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے

وہیں نظیر کے یہاں ہولی، دیوالی، عید، میلے ٹھیلے اور کرشن وغیرہ پر بے شمار نظمیں گنگا اور جمنی تہذیب کی عکاسی کرتی ملتی ہیں، نظم ہولی سے ایک بند۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم، شیشے، جام، جھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

بالکل یہی دور میر و مرزا کا بھی ہے جس میں فارسی ادب کی طرف خاص توجہ دی گئی، اس عہد کا تاریخی و تہذیبی سطح پر امتیازی رویہ بھی تھا لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، میر کی مثنویات اور سودا کے قصائد میں دیکھیے تو ہندوستانی روایت، دہلوی تہذیب اور تاریخی حسیت کا پرتو اس میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ مثنویاں تو خیر تہذیب و تمدن کی بھرپور عکاسی کرتی ہی ہیں، سحر البیان، گلزار نسیم وغیرہ میں ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ میر یا مصحفی کی مثنویاں ہوں یا مرزا شوق کی زہر عشق، ہندوستانی تہذیبی اقدار شعوری یا لاشعوری طور پر پیش کرتی ہیں۔ جگہ جگہ میلوں ٹھیلوں کا ذکر ہوتا ہے، اپنے اپنے عہد کی طرز معاشرت، محلات کی زندگی، عوامی رہن سہن، شادی بیاہ کی تقاریب و رسومات اور زیورات و ملبوسات، غرض کہ مختلف اقسام کے کھانوں تک کا ذکر مثنویوں میں موجود ہے۔ ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے مثنویوں کو تہذیبی دستاویزات کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ مگر حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم مرثیوں کی طرف نظر کرتے ہیں جن میں ہندوستانی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے، جبکہ یہ مرثیے واقعات کربلا سے متعلق ہیں۔ نہایت مشہور شعر ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

عرب کے ریگستان میں اتنی اوس کا کہاں گزر، یہ صرف ہندوستانی موسم ہے جہاں کچھ مہینے زبردست اوس گرتی ہے اور ہر طرف سرسبز و شادابی ملتی ہے۔ قصیدے کی بات کریں تو سودا، ذوق، غالب، محسن وغیرہ کا قصیدہ دیکھیے ہر ہر لفظ سے ہندوستانی شان و شوکت ٹپکتی ہے۔ مثلاً، سودا کے نعتیہ قصیدے کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

یعنی کفر اسلام کے لیے بطور تمغہ ہے اور اس کی دلیل یہ دی کہ تسبیح کے دانے جو سلیمانی پتھر کے ہیں ان میں باریک باریک دھاریاں ہیں اور دھاری سے استعارتاً زنار مراد لیا جاتا ہے جو کفر کی نشانی ہے۔ اس دھاری کو تسبیح کے دانوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ جہاں جہاں اسلام کا وجود ہوگا وہاں وہاں کفر ثابت ہے۔ اس سے بڑھ کر باہم ربط کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

محسن کاکوروی نے پانچ قصیدے لکھے اور پانچوں قصیدے نعتیہ ہیں۔ لامیہ قصیدے کی ابتدا یوں ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پر لاتی ہے صبا گنگا جل

ان کے قصیدوں کو پڑھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ حضور عرب کے ریگزاروں میں نہیں بلکہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

اردو غزل کی بات کریں تو غزل ہے ہی سراپا الفت و محبت، انسان دوستی، مذہبی رواداری، سیکولرزم، جمہوری اور تہذیبی قدروں کی امین، ترجمان اور پاسبان۔ غزل میں ابتدا ہی سے یہ رنگ نمایاں ہے۔ خسرو کا شعر ہے۔

یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم بہ برد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

ذرا ولی کا رنگ دیکھیے۔

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری تک اس کو پچاتی جا

یا میر کہتے ہیں:

اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

جہاں ان کلاسیکی شعرا نے ہندوستانی عناصر، گنگا جمنی تہذیب اور مقامی زبانوں کے الفاظ کا استعمال فنکارانہ طور پر کیا ہے وہیں جدید شاعروں کے یہاں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

سن ری سکھیا، رس کی گگریا، کل گاؤں کے میلے میں
دور دیس کا ایک پردیسی تجھ پر تن من ہار گیا

یوں ہردے کے شہر میں اکثر تیری یاد کی لہر چلے
جیسے اک دیہات کی گوری گیت الاپے شام ڈھلے
دور افق پر پھیل گئی ہے کاجل کاجل تاریکی
پاگل پاگل تنہائی میں کس کی آس کا دیپ جلے

غرض یہ کہ حقیقت پسندی ہو یا پھر رومانوی دور کی حسن پسندی، اشتراکیت پسند ادبی رجحانات ہوں یا انقلاب پسند رویے، آزادی کے نغمے ہوں یا کسان اور مزدور تحریکوں سے وابستہ نعرے ہوں یا ادبی شعری اظہار کی روشیں ہوں، ہر جگہ تہذیب کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ آخر میں چند بند۔

زبان وہ دھل کے جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے

زبان وہ دھل کے جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے

یہ کیسی باد بہار ہے جس میں شاخ اردو نہ پھل سکے گی
وہ کیسا روئے نگار ہوگا نہ زلف جس پر مچل سکے گی
ہمیں وہ آزادی چاہیے جس میں دل کی بینا ابل سکے گی

چلے ہیں گنگ و جمن کی وادی میں ہم ہوائے بہار بن کر
ہمالیہ سے اتر رہے ہیں ترانۂ آبشار بن کر
رواں ہیں ہندوستاں کی رگ رگ میں خون کی سرخ دھار بن کر

ہماری پیاری زبان اردو
ہمارے نغموں کی جان اردو
حسین، دل کش جوان اردو

ظاہر ہے کہ اس لمبی تمہید کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستان میں Diversity اتنی زیادہ ہے اور جہاں مختلف قسم کی تحریکیں چل رہی ہوں وہاں ادب ان سے متاثر نہ ہو، ایسا ممکن نہیں۔ انسانیت کی ناقدری، ناانصافی، رنگ اور نسل کا امتیاز جیسے مسائل جہاں موجود ہوں، وہاں ادیب چپ کیسے رہ سکتا ہے؟ حب الوطنی، سماجی مسائل اور ترقی، جنگ اور امن، رنگ اور نسل، یہ ایسے موضوعات ہیں، جن سے کسی نہ کسی سطح پر ہمارا تعلق ضرور رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دنیا دوسری عالمی جنگ سے نبرد آزما تھی تب ساحر لدھیانوی نے کہا تھا۔

بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روح تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

وغیرہ وغیرہ۔ اب ظاہر ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک ایک ایسی داستان کا درجہ رکھتی ہے، جو شہیدان وفا کے خون سے گوناگوں رنگین نظر آتی ہے۔ جس میں ایک رنگ اردو کا بھی ہے۔ جب بھی تحریک آزادی کی بات چھڑے گی تو 'اردو' کا تذکرہ ضرور ہوگا کیونکہ اس کے

تذکرے کے بغیر تحریک آزادی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ اردو زبان نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ جب ہمارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا تو اس دوران سرزمین ہند نے اپنی کوکھ سے جہاں بے شمار مجاہدین آزادی کو جنم دیا وہیں بے شمار شاعر، ادیب اور صحافی بھی پیدا کیے۔ اردو شعرا نے وطن کی محبت میں نہ جانے کتنے ترانے گائے۔ انقلاب زندہ باد اور آزادی پائندہ باد جیسے نعرے لگائے۔ ان کی شعر و شاعری اور شعلہ بار تقریروں سے تمام ہندوستانیوں بالخصوص مجاہدین آزادی کو عزم و حوصلہ اور طاقت و توانائی عطا کرنے، عوام کو بیدار کرنے، اس کے اندر سیاسی شعور پیدا کرنے، ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے، انگریزوں کے ظلم کی داستان بیان کرنے اور انسانوں کی پیدائش وفطری آزادی کا نعرہ بلند کرنے کا کام نہایت کامیابی سے کیا۔

اردو شاعری یعنی غزل ہو کہ نظم دونوں میں اس کی عکاسی بھرپور ملتی ہے۔ غزل میں اس کے نقوش اس قدر واضح نہیں کیونکہ غزل میں رمز و ایما اور اشاروں کنایوں سے کام چلایا جاتا ہے۔ مثال پیچھے بھی گزر چکی ہے۔ اردو غزل میں آزادی کے تعلق سے پروفیسر کوثر مظہری کا مضمون تحریکِ آزادی اور اردو غزل ہے۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے اس موضوع کے حوالے سے بہت سے شاعروں اور ان کی شاعری پر بات کی ہے۔ غالب، شیفتہ اور مجروح کے اشعار پیش کیے۔ تحریک آزادی کے دوران تخلیق ہونے والا زندانی ادب، اس میں حسرت کی 'نکاتِ سخن' بھی ہے۔ یہ ان کے رسالے 'اردوئے معلیٰ' میں پہلے قسط وار شائع ہوئی پھر بعد میں متروکاتِ سخن، معائبِ سخن، محاسنِ سخن، اور 'نوادرِ سخن' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ انہی کے مشہور زمانہ اشعار ہیں۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

حسرت کے تعلق سے پروفیسر کوثر مظہری نے اپنے مضمون میں بڑی اہم بات لکھی ہے:

''حسرت کی غزلوں میں تحریک آزادی اور انقلاب کے جو عناصر ملتے ہیں ان میں بہت زیادہ درشتگی کے بجائے ایک طرح کی دھیمی لے ملتی ہے، اس لیے اس میں سوز و گداز کی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے۔

رہتی ہے روز اک ستم تازہ کی تلاش
بے چین ہے وہ فتنہ دوراں میرے لیے
ہوتی ہے روز بارش عرفاں مرے لیے
گویا بہشت عشق ہے زنداں مرے لیے

سیاست میں جس طرح حسرت عملی طور پر شریک رہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کے تجرباتِ شعری میں تصنع اور آورد کے بجائے برجستگی اور آمد نظر آتی ہے، ورنہ ہوتا یہ ہے کہ بہت سے شعرا اپنے زمانے کی اتھل پتھل پر بھی ایک اچٹتی نظر ڈالنے کو بطور فرض کفایہ کے ادا کرتے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح تصوف کے مضمون کو بیشتر شعرا نے صرف 'برائے شعر گفتن' کے طور پر برتنے پر اکتفا کیا۔''

(مضمون بعنوان تحریکِ آزادی اور اردو غزل، پروفیسر کوثر مظہری، ادبی میراث)

اس طرح غزلوں میں اشاروں کنایوں میں اس مضمون کو باندھا گیا۔ کیونکہ غزل اشاروں کنایوں کا ہی فن ہے غالب نے کہا تھا نا کہ۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مجروح نے غزل کے روایتی اور مستند لب و لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے تحریکِ آزادی اور انقلاب کے موضوع کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن، جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاوں کی زنجیر نہ دیکھ
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اب جہاں تک نظم کی بات ہے تو ترقی پسند شاعروں نے اس موضوع کو اپنی نظموں میں خوب خوب نبھایا۔ اس ضمن میں خاص طور پر علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجاز، فیض اور کیفی اعظمی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

انگریزوں کے خلاف جوش ملیح آبادی کے جذبات کا طوفان آتش فشاں کی طرح پھٹا پڑتا ہے۔ اس سے، ان کے سینے کے اندر کے طوفان، جلن اور تپش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کیوں ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شائد کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

انگریزوں کے خلاف جوش کے تیور ان کی نظم 'نعرہ شباب' میں دیکھنے کے لائق ہے۔

دیکھ کر میرے جنوں کو نازفرماتے ہوئے
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے
تیرے جھوٹے کفر و ایماں کو مٹا ڈالوں گا میں
ہڈیاں اس کفر و ایماں کی چبا ڈالوں گا میں
پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا
ولولوں سے برق کے مانند لہراتا ہوا
موت کے سائے میں رہ کر، موت پر چھایا ہوا
کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

مجاز نے بہت کم عمر پائی اور کم عمری میں رومان سے انقلاب کی طرف رخ کیا۔ اپنی والہانہ شاعری اور مشاقی کی بدولت نوعمری میں ہی اپنی شناخت قائم کرلی۔ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ جدوجہد آزادی جیسے جیسے تیز ہوتی گئی ویسے ویسے اردو شاعری کے تیور بھی نکھرتے گئے۔ اس مرحلے پر بھلا وہ پیچھے کیسے رہ سکتے تھے۔ مجاز کی نظم 'انقلاب' سے ان کے تیور کی مثال ملاحظہ کیجیے۔

آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
کوہ و صحرا میں زمیں سے خون ابلے گا ابھی
رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی
سرکشی کی تند آندھی دم بہ دم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی
خون کی ہولی کی جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی

وغیرہ۔ اسی طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جن پر پہلے بھی بات کی جاتی رہی ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ تحریک آزادی کے تعلق سے یہ بات بھی ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' اور 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، وغیرہ بھی اردو کی دین ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

■

Mehar Fatima
C- 206, Saranya Sarovar Apartment
Hugdur Main Road, Whitefield
Banglore- 560066 (Karnatka)
Mob.: 9555949032

حریت کے پرستار مجاہد آزادیٔ ہند
مولانا برکت اللہ بھوپالی

غلام علی اخضر

تمام مذاہب اور فلسفے اس بات پر متفق ہیں کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لہٰذا آزادی اس کا پیدائشی حق ہے۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کا جذبہ اور خواہش انسان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں اور دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جب اور جہاں جابر حکمرانوں یا طاقتور اقوام نے انسانوں کے کسی کمزور گروہ یا کسی پسماندہ خطے کو ملک گیری کی ہوس میں غلام بنایا تو وہاں جذبۂ حریت سے سرشار ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے تحریروں، تقریروں اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی تحریک چلا کر اپنی آزادی کی بازیافت کی۔ اور آزادی کے لیے اپنی اس جدوجہد میں نہ انھوں نے اپنے خاندان کی پروا کی نہ اپنی جان کی۔ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں بھی ایسے بے شمار نام ہیں جنھوں نے آزادی کو اپنا نصب العین بنا کر ایسی تحریکیں چلائیں کہ انگریزوں کے نو آبادیاتی نظام کی چولیں ہل گئیں اور وہ لوگ جو فخر سے کہتے تھے کہ ہماری سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا وہ سر نیہوڑا کر ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ان آزادی کے متوالوں کی ایک طویل فہرست ہے جن کی محنت، جدوجہد اور جاں نثاری سے ہندوستانیوں کا اپنی آزادی کے لیے دیکھا ہوا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ انگریز ہندوستان میں تاجر بن کر آئے تھے لیکن اپنی شاطرانہ چالوں سے انھوں نے اندر ہی اندر مغلیہ سلطنت کو گھن کی طرح کھانا شروع کر دیا اور پھر ایسا وقت آیا جب پورا ملک تاجِ برطانیہ کے زیرِ نگیں ہو کر برطانوی نو آبادیاتی نظام کا حصہ بن گیا۔ حکومت پر قابض ہوتے ہی ہندوستانی رعایا کی حمیت تار تار ہونے لگی اور غلامی کا طوق ان کے گلے میں پڑ گیا۔ ہندوستان انگریزوں کے آنے سے قبل سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور اسی شہرت نے بعض یورپی اقوام جیسے انگریزوں، فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کی توجہ اور حرص اپنی جانب منعطف کی۔ ملک گیری کے اپنے ناپاک ارادوں میں انگریز کامیاب ہوئے اور حاکم بن کر انھوں نے سونے کی اس چڑیا کو ہر جانب سے نوچنا شروع کر دیا۔ لیکن تاریخ اس کی بھی گواہی دیتی ہے کہ انگریزوں کے برسرِ اقتدار آتے ہی ہندوستانی غیرت اور قومی حمیت جوش میں آ گئی تھی اور ہزاروں جیالوں نے آزادی کا حسین خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان عاشقانِ آزادی میں ایک اہم نام ہے برکت اللہ بھوپالی جو اپنے نام سے پہلے انھیں دیے گئے اعزازی سابقے 'مولانا' کے ساتھ مولانا بھوپالی نام سے مشہور ہوئے۔ انھیں ممتاز ترین مجاہدینِ آزادی میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی صلاحیتوں، زبان دانی، سیاسی تحریکوں اور آزادیِ وطن کے لیے کیے گئے ان کے کاموں کی فہرست ناقابلِ یقین حد تک طویل ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ مولانا بھوپالی کے والد ماجد بہت بڑے عالم تھے اور ان کا آبائی وطن اتر پردیش کا بدایوں تھا لیکن اٹھارہ سو ستاون کی تحریکِ آزادی کے نتیجے میں جو قتل وغارت اور تباہی ہوئی اس کی زد میں آ کر انھیں بدایوں چھوڑنا پڑا اور وہ ریاست بھوپال کے سیہور میں آ کر قیام پذیر ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی علمیت کا شہرہ بھوپال تک پہنچ گیا اور نواب سکندر جہاں بیگم نے ان کو بھوپال بلا لیا۔ بھوپال میں ہی سات جولائی اٹھارہ سو چون کو عبدالحافظ محمد برکت اللہ کی ولادت ہوئی۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم بھوپال میں ہی حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے جبل پور اور ممبئی گئے۔ دورانِ طالب علمی انھوں نے انگریزوں کے ظالمانہ طرزِ حکومت کا احساس کر لیا تھا اور ان کے دل و دماغ میں آزادی کی خواہش بڑی شدت سے پرورش پانے لگی تھی۔ انھوں نے جلد ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ اس جابر اور طاقتور حکومت کے خاتمے کے لیے صاحب اقتدار کی زبان پر عبور حاصل کرنا، اس کی پالیسی کے خدوخال کو سمجھنا اور اس سے باخبر رہنا نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ وطن کی آزادی کی تحریک بین الاقوامی سطح پر چلائیں گے اور اس کے لیے فضا ہموار کرنے کی غرض سے غیر ممالک کا سفر کریں گے۔ اس ارادے نے انھیں ایک ایسی بین الاقوامی شخصیت بخشی جس نے اپنے ملک کی آزادی اور قوم وملت کی فلاح و بہبود کے لیے سفر اختیار کیا اور ایشیا اور یورپ کے چپے چپے کو اپنے مقصد کی حصول یابی کے لیے کھنگال ڈالا۔ انھوں نے ملک کی سربلندی و سرفرازی کے لیے غیر معمولی کارہائے نمایاں انجام دیے اور ایک سیکولر نظام کا خاکہ اس وقت پیش کیا جب ہندوستانی عوام کے لیے یہ نظام قطعی اجنبی تھا۔ انھوں نے عمر عزیز کے 45 سال اس منصوبے میں صرف کیے۔ اقوام عالم کا دورہ کیا تاکہ وطن کی آزادی کے تمام وفا شعاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع جا کیا سکے۔ 1915 میں تو انھوں نے افغانستان جا کر وہاں پہلی جلا وطن حکومت ہندوستان قائم کی۔ راجہ مہندر پرتاپ اس عبوری حکومت کے صدر اور خود مولانا بھوپالی وزیرِ اعظم نامزد کیے گئے۔ اس واسطے سے ان کو ہندوستان کا پہلا وزیرِ اعظم بھی لکھا جاتا ہے۔ وہ جہاں بھی گئے انھوں نے اپنی تحریکِ آزادی کی سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لیے سربراہانِ ملؤ مملکت اور دیگر سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ جن مشہور رہنماؤں سے اس سلسلے میں وہ ملے ان میں قیصر ولیم دوم، عامر حبیب اللہ خان، محمد رشید غازی پاشا، لینن اور ہٹلر شامل تھے۔

لندن میں گیارہ سالہ قیام کے دوران پروفیسر برکت اللہ بھوپالی نے بہت تجربے حاصل کیے اور اپنے مشن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ روز و شب کام کرنے لگے۔ مولانا تحریر و تقریر کے غازی تھے۔ وزیر اعظم گلیڈسٹون کی تقریر کے جواب میں مولانا نے 22 دسمبر 1996 میں ایک بے باک اور معرکۃ الارا خطاب کیا، اور دل کھول کر انگریزی حکومت کے دوہرے رویے کو اجاگر کیا، جس سے پورے لندن میں کھلبلی مچ گئی۔ اخبارات کے صفحات اس تقریر کی جادو بیانی اور حقیقت کشائی کے ذکر سے سیاہ ہو گئے یعنی پریس کی دنیا میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ مولانا نے 1857 سے ہندوستانیوں پر ہو رہے مظالم کی تفاصیل کو طشت از بام کر دیا۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ جس جمہوری نظام کے برطانوی حکومت گن گاتی ہے، وہ انگلستان میں تو روز و شب پروان چڑھ رہا ہے اور اپنے شباب پر ہے مگر ہندوستان میں اس کا وجود تک نہیں۔ 1905 میں مولانا نے ایک مضمون مجاہد آزادی حسرت موہانی کے رسالے 'اردوئے معلیٰ' کے لیے بھیجا جس میں انھوں نے ہندوستان کی بدحالی اور فرنگی

ملک کی خوش حالی کے راز افشا کر دیے۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوستانی اقتصادیات اور معیشت کے لیے فرنگی ایسا ہے جیسے خون چوسنے والی جونک۔ ملک کی فلاح کے لیے فرنگی زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ ہندوستانی معاشی نظام کا مستقل گلا گھونٹا جارہا ہے۔ انگریز صرف اپنے فائدے کے رسیا ہیں۔ ہندوستانی مصنوعات پر ٹیکس انگلستان کے کارخانوں کی رعایت کرتے ہوئے لگایا جاتا ہے۔ ہندوستانی پیداوار کو معمولی دام پر خرید کر بیرون ممالک میں اچھی قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تفصیل سے ذکر کیا کہ ایک خوش حال ملک میں کیسے غربت نے ڈیرا جمایا اور انگریزی مشینری اور کارخانوں نے ہندوستانی صنعت وحرفت کو کیسے برباد کیا۔ یہی نہیں انگلستانی پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانی اشیا کے انگلستان پہنچنے پر اس پر 70 سے 80 فیصد کسٹم ڈیوٹی لگے گی، جب کہ انگریزی سامانوں کا ہندوستان آمد پر ایسا نہیں تھا، اس نے صنعتی کاروبار کو برباد کردیا۔ دنیا جدید طرز سے کھیتی باڑی کرکے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدے اٹھانے لگی تھی مگر ہندوستانی کسانوں کو سوچی سمجھی سازش کے تحت پرانے ہی انداز پر کاربند رکھا گیا۔ مزید یہ بھی لکھا کہ خارجہ پالیسی کے نام پر ہندوستان سے سالانہ تیس کروڑ روپیہ انگلستان بھیج دیا جاتا ہے۔ اعلیٰ عہدوں پر انگریز ہی فائز ہوتے ہیں، ہندوستانیوں کو معمولی ملازمتیں ملتی ہیں۔ ایک موٹی رقم خرچ کرکے سول سروس امتحان کے لیے مجبوراً لندن جانا پڑتا ہے۔ یہ وہ سارے وجوہ تھے جس سے ہندوستادن بہ دن تنزل کی سمت رواں تھا۔

مولانا ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ ان کا ہمیشہ عقیدہ رہا کہ اگر ہندی عوام فرنگیوں سے آزادی چاہتی ہے تو پہلے اپنے درمیان کے فاصلے کو ختم کرکے سب ایک صف میں کھڑے ہوں۔ ایک دوسرے کے لیے ہر وقت ہر مشکل میں ساتھ دینے کے لیے تیار رہیں۔ انھوں نے پیغام دیا کہ انگریزوں کی حکمت عملی ہے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ ''لہٰذا جب تک ہندوستان کے تمام باشندے متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف راہ بغاوت پر گامزن نہ ہوں گے اہل ہند کے لیے منزل آزادی تک پہنچنا مشکل ہے۔''

مولانا جہاں ایک اچھے اور بااثر مقرر تھے وہیں ایک اچھے انقلابی صحافی بھی تھے۔ اسی انقلابی اور باغیانہ انداز نے انھیں ایک جگہ ٹکنے نہیں دیا۔ لندن میں مختلف اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوئے۔ انھوں نے ایک میگزین بھی جاری کیا۔ شروع میں تو اصلاحی مضامین پر زور دیا لیکن جوں ہی اس کی زمین وسیع ہوئی آزادیِ ہند کے مقصد کے تحت لکھے گئے مضامین کو شائع کرنا شروع کردیا۔ آخر ان کے روپے سے تنگ آکر انگریزی حکومت نے انھیں لندن چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ پھر امریکہ میں Farind نامی رسالے میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے جن میں وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے آواز بلند کرتے تھے۔ وہ ''اردوئے معلّٰی'' میں سیاسی مضامین بھیجتے۔ یوں تو اردو معلّٰی ادبی رسالہ تھا مگر مولانا حسرت موہانی کی جبلت میں سیاسی گرمی ہونے کے وجہ سے یہ رسالہ بھی سیاسی مشتملات سے آزاد نہ رہ سکا۔ مولانا برکت نے قسطنطنیہ سے ہفتہ وار اخبار 'الخلافت' جاری کیا۔ شروع میں تو اعتدال کی راہ اختیار کی مگر پھر اپنے اصلی رنگ وروپ میں آگئے اور انگریزوں کے ظلم وستم کے کارنامے بے پردہ کرنا شروع کردیے۔ خارجہ پالیسی کے تحت اس اخبار پر کچھ پابندیاں عائد ہوگئیں جو مولانا کو گوارہ نہ تھیں اور وہ قسطنطنیہ کو خیرباد کہہ کر قاہرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں بھی ایک اخبار جاری کیا جس میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کالم شائع ہوتے تھے۔ اخبار نے اپنی زمین اس قدر وسیع کرلی کہ عرب ممالک اور ایران میں اس کو بڑے پیمانے پر پڑھا جانے لگا اور یہاں سے کافی آمدنی اخبار کو آنے لگی، مگر مولانا کے لہجے کی تیزی اور گھن گرج کی وجہ سے حکومت مصر سے بھی روانگی کا حکم مل گیا۔

اب مولانا نے جاپان کا رخ کیا اور جب وہاں پہنچے تو ہندوستانی جلاوطن 'بم پارٹی' کے کچھ افراد یہاں پر موجود تھے، جن کی سرپرستی وسربراہی کا کام راش بہاری بوس انجام دے رہے تھے۔ شروع شروع میں مولانا یہاں کے مقامی رسائل میں اپنے مضامین بھیجتے رہے، جسے معیاری اور معلوماتی ہونے کی وجہ سے سراہا جاتا تھا۔ مولانا نے یہاں 'اسلامک فریٹرنٹی' کی بنیاد رکھی۔ جب اس تنظیم کا دائرہ وسیع ہوا تو انھوں نے سیاسی سرگرمیاں شروع کردیں اور اپنی تحریروں سے برطانوی سامراجیت کے خلاف ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر آنے کی کھلے طور پر تلقین کرنے لگے۔ یہ ہفت روزہ انگریزی، جاپانی اور اردو زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اس کی پہنچ بڑھتے بڑھتے برما، لنکا، ملایا، جاوا، اور انڈو چائنا تک پہنچ گئی۔ اس اخبار کو بھارت تک بھی خفیہ طریقے سے پہنچایا جاتا تھا۔ لب و لہجے کے تیکھے پن کی وجہ سے یہاں بھی حسب سابق معاملہ پیش آیا۔ مولانا نے جب جاپانی شاہ سے ملاقات کی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا 'پروفیسر صاحب آپ کا وزن جاپان کی زمین برداشت نہیں کرسکتی ہے۔' 1911 میں بھی مولانا یہاں سے اپنے مقصد کو فوت ہوتا دیکھ کر رخصت ہوگئے اور فرانس کا رخ کیا۔ 1912 میں پیرس سے بھارت کی آزادی کے لیے 'انقلاب' اخبار نکلتا تھا لیکن وہ کچھ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ مولانا نے وہاں پہنچ کر اس کی ادارت کا بیڑا اٹھالیا۔ فرانسیسی زبان سے ان کی واقفیت نے جلد ہی اسے مقبولیت بخش دی۔ یہاں سے بغاوت کا اثر یورپ اور افریقن ممالک تک پہنچنے لگا۔ 1913 میں غدر اخبار کا اجرا ہوا جس کی تقریب میں 15000 ہزار ڈالر جمع ہوئے۔ 1914 میں غدر اخبار نے ہندوستانیوں میں ایک بغاوت کا جوش پیدا کردیا تھا۔ اس نے پیغام دیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ فرنگی تسلط سے آزاد ہوا جائے۔ پیرس سے مولانا نے ہفت روزہ 'الاصلاح' بھی نکالا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی صدرنگ شخصیت اور گوناگوں خصوصیات کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ دور بینی اور دور اندیشی کی باکمال صفات سے بھی مزین تھے۔ ہندوستان کی معاشی تباہی کا اندازہ ابھی ایشیا کے افراد پر صحیح طور سے کھلا بھی نہ تھا کہ مولانا نے بدیسی مال سے ہونے والی مضرت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ بدیسی مال کی خرید و فروخت سے ہونے والے نقصانات سے لوگوں کو مسلسل آگاہ کرتے رہے۔ بعد میں مہاتما گاندھی نے 1905 میں سودیسی تحریک کا آغاز کیا جس سے برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ شروع ہوا۔ اسی تحریک کا اثر تھا کہ لالہ ہردیال دہلوی نے جو غدر پارٹی کے اہم ارکان میں سے تھے آکسفورڈ یونی ورسٹی کا وظیفہ واپس کردیا۔ 1908 میں ایک کلاس جاری کرکے اس بائیکاٹ کی مہم کو اور تیز کیا گیا۔

حب الوطنی کا تقاضا کیا ہے۔ مولانا اپنے مضمون 'ہندو مسلماں در ہندوستاں' میں لکھتے ہیں کہ مسلمانان ہند پر دو فریضے عائد ہوتے ہیں ایک وطنی اور دوسرا دینی۔ وطنی فرض یہ ہے کہ مادر وطن کے لیے جان و مال کی قربانی کے لیے ہمیشہ تیار رہا جائے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جو شخص محبِ وطن نہ ہوا وہ انسانیت سے خارج ہوگیا۔

دوسرا دینی تقاضا یہ ہے کہ تمام عالم انسانیت کو دوست جانو، ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرو اور ہندو مسلم اتحاد قائم رکھو۔ ہندو اور مسلم کو اس حالت میں دیکھنا چاہتے تھے کہ معاشی طور پر سب اس قدر مضبوط ہوں کہ وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آسکیں۔ وہ اس بات کے بھی داعی تھے کہ اگر ہندوستانی مسلمان اپنی کامیابی چاہتا ہے تو ہندو بھائیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملاکر ساتھ چلے کہ یہ کامیابی کا سب سے بڑا نسخہ ہے

مولانا نے ایک کتاب 'الخلافت' نام سے بھی تالیف کی تھی۔ جس کا پہلا ایڈیشن 4/اگست 1924 کو شائع ہوا۔ جلدی ہی اس کتاب نے اپنے قیمتی مواد کی وجہ سے شہرت حاصل کرلی۔ یہاں تک کہ 1925 میں دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔

مولانا زندگی بھر مختلف تحریکوں سے وابستہ رہے اور ہر تحریک کا مقصد بھارت کو انگریزی حکومت سے آزادی دِلانا تھا۔ 'شیخ الہند تحریک' کے اعلیٰ مقاصد، مستقل مزاجی اور نیک ارادے نے مولانا کو کافی متاثر کیا اور وہ اس کا حصہ بنے بغیر نہ رہ سکے۔ اس تحریک نے آزادیِ ہند کے لیے بہت ساری قربانیاں دیں۔ اس نے ہندی عوام کی صحیح تربیت کی اور انھیں راہِ مستقیم پر گامزن کیا۔ شیخ الہند تحریک نے عوام الناس اور خواص کو فرنگی سامراجیت سے آزاد ہونے کے راستے دکھائے۔ اس تحریک کے روح رواں شیخ الہند محمود حسن دیوبندی تھے۔ شیخ الہند کا نام مجاہد آزادی کے بڑے رہنماؤں میں شامل ہے۔ اس دور اندیش رہنما کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ملک اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتا جب تک کہ عوام وخواص کو صحیح تربیت اور صحیح راہ نہ دکھائی جائے۔ ایسے ہی مقصد کے لیے مولانا بھوپالی جب جاپان میں تھے وہاں قیام پذیر جلاوطن انقلابیوں کے ساتھ مل کر 'انقلابی پارٹی' کی بنیاد رکھی۔ اس کی شاخین کئی ملکوں میں قائم کی گئیں۔ 'شنگھائی' میں متھرا سنگھ کی سرپرستی میں تو 'ہانگ کانگ' میں بھگوان سنگھ کے زیرِ نگرانی کام چلنے لگا۔ انقلابی سپہ سالاروں کا ایک بڑا گروپ امریکہ میں جمع ہوا جن میں قابل ذکر نام لالہ ہردیال کرشن جی ورما اور مولانا برکت اللہ کے ہیں۔ یہاں پر 'انڈین ایسوسی ایشن آف پسفیک کوسٹ' کی بنیاد رکھی گئی۔ یہی تحریک بعد میں 'غدر پارٹی' کے نام سے مشہور ہوئی۔ امریکہ اور کناڈا میں جو لوگ مقیم تھے ان میں اکثریت انگریز حکومت کے مخالفین کی تھی۔ چند ہی ایسے افراد تھے جو باغی الذہن اور مشتعل نہ تھے، لیکن مولانا اور لالہ جی کی پُرمغز اور سحر انگیز تقریر نے ان کے دلوں میں بھی آزادیِ ہند کی روح پھونک دی۔ اس تحریک کا دائرہ امریکہ اور کناڈا کے علاوہ میکسیکو، فلیپائن، آسٹریلیا، ملایا اور جاوا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس گروپ کی سربراہی میں ایک شعلہ بیاں اور شعلہ انگیز اسلوب سے بھرا 'غدر کی گونج' نام سے نظموں کا مجموعہ شائع کیا گیا تاکہ لوگوں میں فرنگی حکومت کے خلاف اشتعال پیدا کیا جاسکے۔ اس تحریک کی سخت پیامی نے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف سخت شورش پیدا کی۔ اس کی اپیل تھی کہ غدر لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ تقسیم کیا جائے۔ 'انڈو جرمن مشن' کے ذریعے سے ہندوستان پر فرنگیوں کے خلاف حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا، جو آزادیِ ہند کی تاریخ میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا اس کا اہم حصہ تھے۔ جرمنی سے وفد روانہ ہوا، مولانا نے ہی اس کے لیے راہ ہموار کی اور زبردست خاکہ تیار کیا۔ انقلابیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک گروپ کے سرپرست خود مولانا ہوئے اور دوسرے کی قیادت راجہ مہندر پرتاب نے سنبھالی، جس میں جرمن افسران بھی شامل تھے۔ مولانا کی ٹیم جرمنی سے روانہ ہوکر جہاں ٹھہری تھی وہیں ان کی مصر کے سابق بادشاہ عباس حلمی سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں عباس حلمی معزولی کی زندگی بسر کررہے تھے۔ انھیں برطانیہ نے جرمنی سے دوستی کے سبب معزول کردیا تھا۔ مولانا نے حلمی کو یقین دلایا کہ ہم نے جو پالیسی تیار کی ہے اور جس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے اس سے اب ہندوستان اور مشرق وسطیٰ فرنگیوں سے آزاد ہوکر ہی رہے گا، جس کی آزادی میں مصر کی آزادی بھی پنہاں ہے۔ اگر ہندوستان اور مشرق وسطیٰ سے برطانوی ظالم و جابر حکومت کا خاتمہ کردیا جائے تو کئی ممالک آزاد ہوجائیں گے اور وہاں امن و امان قائم ہوجائے گا۔

1919 میں ''ایشیائی آزادیِ گانگریس کا انعقاد کیا گیا۔ جس کا مقصد ایشیا سے برطانوی حکومت کا مٹانا تھا۔ اس کو 'یونین فاردی فریڈم آف دی اورینٹ' کا نام دیا گیا۔ مولانا اس میں بھی شامل تھے۔ دسمبر 1920 میں ہاکو میں اسی مقصد کے لیے ایک سبھا منعقد کی گئی، جس میں کئی ایشیائی لیڈروں اور آزادی کے دیوانوں نے شرکت کی۔ مولانا بھی اس پرگرام میں شریک ہوئے۔ مولانا آزادیِ ہند کے لیے تحریک پیدا کرنا اور تحریکات میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے اور زندگی کا نصب العین بھی۔ جس کی وجہ سے مولانا کو دربدر اور جلاوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ مولانا جہاں رہتے وہاں کی حکومتی خارجہ پالیسی میں اپنے مقصد اور تحریک اور بے باکی کی وجہ سے کانٹا بن جاتے اور یہ کانٹا حکومتوں کے حلق میں چبھنے لگتا جس کی تکلیف کا خمیازہ مولانا کو اٹھانا پڑتا، اور پھر وہ وہاں سے ملک بدر کردیے جاتے۔

قدرت نے مولانا کو ایسے خمیر سے تیار کیا تھا کہ ان میں خوف و ہراس کا نام ونشاں نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مولانا حق بیانی اور ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے میں ذرہ بھر بھی خوف نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی اس کام سے کبھی قدم پیچھے ہٹایا۔ ان کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات حکومت برطانیہ کے لیے شعلۂ جوالہ ہوا کرتی تھی۔ مخالفین کے دلوں میں ان کی ہر بات تیر ونشتر سے لگے زخم سے کم نہ ہوتی تھی۔ لندن میں اپنی تقریر کی وجہ سے قابل گرفت گردانے گئے۔ اس کے باوجود مولانا نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا اور اپنا مشن اور وژن جاری رکھا۔ غدر فوجیوں کے سامنے کی گئی ایک تقریر کا اثر ایسا تھا کہ مجاہدین اور بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ سب نے عہد اور حلف اٹھایا کہ ہم اس وقت تک انگریزوں کے خلاف علم بلند رکھیں گے جب تک ہمارے اندر جان ہے۔ مولانا نے دوران تقریر کہا کہ اب ہمارے صبر کا پیمانہ چھلک چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ اس بدیسی حکومت کو زیر کر کے خاک چٹائی جائے۔ اس نے ہمارے سکون کو غارت کردیا ہے لہٰذا سکون چاہیے تو صف آرا ہوکر ان پر ٹوٹ پڑو۔ 1917 میں ہندوستانی باغیوں پر مقدمہ درج ہوگیا جس میں مولانا کے ساتھ بھگوان داس، رام چندر جی اور امام الدین وغیرہ ملزم ٹھہرائے گئے۔ اس مقدمہ میں ابتدا میں 105 اشخاص کو گرفتار کیا گیا تھا۔ امریکی سرکاری وکیل 'جان پرسٹن' اس مقدمے کے وکیل تھے اور ان کی مدد کے لیے سیز اینتی Mrs. Annete مقرر کی گئیں۔ الزام تھا کہ ملزمان باغیوں کے لیے فنڈ اور مفت ہتھیار مہیا کرتے ہیں، اس مہم کا مرکز سان فرانسسکو ہے اور اس کی شاخیں مختلف ملکوں میں ہیں جن میں میکسیکو، چین، جاپان اور بٹاویا کے نام قابل ذکر ہیں۔ انقلابیوں کی جانب سے 9 وکلا مقرر کیے گئے۔ مقدمے کی سماعت فیڈرل کورٹ جج مسٹر ڈبلو، دان دلیٹ کے اجلاس میں شروع ہوئی۔ اس مقدمے کی خبر اخبار 'سان فراسکو ایگزامیز' میں 23 نومبر 1917 کو شائع ہوئی تھی۔ وجدی الحسینی اس حوالے سے اپنی کتاب 'انقلابی سوانح: برکت اللہ بھوپالی' کے صفحہ 183 پر لکھتے ہیں:

''رپورٹ میں یہ ہے کہ ملزم برکت اللہ بھوپالی نے اپنی چرب زبانی سے ہندوستانی قیدی فوجیوں کو جرمنی کی فوج میں شامل ہونے کا مشورہ دیا اور غدر پارٹی نے باغیانہ لٹریچر قیدیوں میں ہوائی جہاز سے برسایا اور تقسیم کیا۔ اس منصوبے میں یہ پلان طے ہوا کہ ہندوستان پر دونوں طرف سے ہلّہ بول دیا جائے، رنگون، برما، بٹاویہ کے انقلابیوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اور جرمنی جہازوں سے ہتھیار مختلف مقامات پر اتارے گئے۔ مگر یہ منصوبہ راز فاش ہوجانے پر ناکام ہوگیا۔ دوران مقدمہ ملزموں نے مزید افشائے راز کی کوشش کی۔ جس پر انقلابی ملزم رام سنگھ نے رام چندر کو گولی ماردی، یہ دیکھ کر امریکی مارشل جیمز ہالو نے رام سنگھ کو گولی ماردی۔ اس مقدمہ میں انتالیس انقلابی سزایاب ہوئے۔''

مولانا جہاں بھی پناہ لیتے وہاں یہ دیکھتے ہی کہ وہاں کی حکومت ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے یا ہورہی ہے، فوراً اس کے دربار تک رسائی حاصل کرنے میں لگ جاتے، اور اپنے منصوبے کا چٹھا ان کے سامنے پیش کردیتے تھے۔ اسی کی ایک کڑی آزادیِ ہند کے پروانوں کی قیصر جرمن سے ملاقات ہے۔ مولانا کیوں کہ جرمن زبان پر دسترس رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے ہی اس ملاقات کی رہنمائی کی۔ اسی ملاقات کا حاصل اور منصوبے کی عمل آوری تھی کہ جرمنی اور برلن کمیٹی کے درمیان معاہدہ طے پایا۔ مولانا اپنی جماعت کے ساتھ جوں ہی قیصر جرمنی ولیم ثانی کے دربار میں حاضر خدمت ہوئے ولیم نے خود آگے بڑھ کر اس وفد

کا استقبال کیا۔ ولیم نے اس ملاقات میں دل کھول کر ہندوستانی مجاہدین کی حمایت کی اور ان کی کوششوں کو عزت بخشی، جس کے ثبوت کے لیے ولیم کے اس وفد کے سامنے اظہار کیے گئے خیالات ہی کافی ہیں:

''ان چند سالوں کے اندر ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہونا چاہیے اور آپ ہندوستانیوں کو اس سے بہتر سنہری موقع کبھی ہاتھ نہیں آسکتا کہ اپنے اوپر لدے ہوئے اس بوجھ غلامی کو اٹھا کر پھینک دیں۔ ان سفاکوں اور جابروں کے ہاتھ کاٹ ڈالیں، جو تقریباً دوسو برس سے آپ کی قوم کے خون سے ہاتھ رنگتے چلے آرہے ہیں۔

(برکت اللہ بھوپالی، مصنف: ایم عرفان، صفحہ: 145، ناشر: عفان پبلی کیشنز، بھوپال۔ایم پی، تاریخ طباعت: جون 1969)

7 مئی 1917 کو مولانا برکت اللہ نے اپنے دوستوں کے ساتھ روسی وزیر اعظم کامریڈ لینن سے ملاقات کی۔ اس ملاقاتی وفد میں راجہ مہندر پرتاب، مولوی عبدالرب، مسٹر آچاریہ، مسٹر دلیپ سنگھ گل اور ملازم ابراہیم وغیرہ شامل تھے۔ راجہ صاحب نے خود اس ملاقات کے بارے میں مفصل حال قلم بند کیا ہے۔ یہاں پران ہی کے الفاظ میں رقم ہے:

''میں نے کہا قدرت آپ کو محنت کشوں کی خدمت گذاری کے لیے استعمال کررہی۔ انھوں نے جواب دیا''یہ آپ کا خیال ہے۔

''میں نے اپنی اجناس کی کاپی جاری کرنے والی تجویز ان کے سامنے پیش کی کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ وہ گیہوں، چاول، مکھن کوئلہ وغیرہ کے نوٹ چھاپے جنہیں چاندی اور سونے کے سکوں کے بجائے رائج کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا اس پر غور کروں گا۔''اس کے بعد وہ میرے احباب کی جانب مخاطب ہوئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں۔ پروفیسر دوزینا نیکی نے انھیں روسی زبان میں کچھ سمجھایا۔ انھوں نے ہم سب سے ایک ایک دودو سوالات کیے۔ جب انھوں نے ابراہیم سے ایک سوال کیا تو اس نے روسی زبان میں جواب دیا۔ لینن اس کی ٹوٹی پھوٹی روسی زبان سن کی بے حد خوش ہوئے او ربڑی مسرت سے کہا''اُو۔ تم روسی زبان بولیتے ہو!''

''ہم تقریباً 20 منٹ تک کامریڈ لینن کے پاس ٹھہرے اور رخصت کے وقت انھوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ پھر ہم چلے آئے۔''

(برکت اللہ بھوپالی، مصنف: ایم عرفان، صفحہ 222، ناشر: عفان پبلی کیشنز، بھوپال۔ایم پی، تاریخ طباعت: جون 1969)

اسی مضمون کے فٹ نوٹ میں راجہ جی لکھتے ہیں کہ ''...اخبار از دستیا نے ایک مختصر سی خبر یہ شائع کی کہ اس ملاقات کے دوران برکت اللہ نے لینن کو افغان حکومت کی جانب سے غیر سرکاری طور پر یہ پیغام پہنچایا تھا کہ وہ برطانوی سامراج کے خلاف افغانی جدوجہد میں اس کی امداد کریں۔

(مصدر سابق۔ انقلابی سوانح: مولانا برکت اللہ بھوپالی۔ تالیف: سید عابد علی وجد الحسینی۔ شائع: مدھیہ پردیس اردو اکادمی، بھوپال۔ سنہ اشاعت: 1986)

مولانا 1904 میں ترقی یافتہ جاپان میں داخل ہوئے۔ وہ جہاں بھی جاتے وہاں سے نکلنے والے اخبارات اور رسائل کا ضرور پتہ لگالیتے اور اس میں اپنے مضامین بھیجتے۔ یہاں وارد ہونے کے بعد انھوں نے ایک مضمون لکھا۔ جب جاپانی زبان میں وہ مضمون شائع ہوا تو مولانا کی ہر چہار جانب سے تعریف ہوئی۔ یہاں تک کہ جاپان کے شاہ سے ملاقات کی دعوت مل گئی۔ مولانا سے شاہ اس قدر متاثر ہوا کہ آپ کی خدمت میں 100 پونڈ نذرانہ پیش کیا۔ مزید نتیجہ برآمد ہوا کہ تیسرے دن ٹوکیو یونی ورسٹی سے پروفیسری کا عہد پیش ہوگیا اور مولانا اردو کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ یہاں پر بھی مولانا نے اپنے اصل مقصد کو ضائع نہ ہونے دیا۔ لیکن مولانا پر برطانوی حکومت کے خلاف زہر افشانی کی پاداش میں پابندیاں عائد کردی گئیں۔ مزید یہ کہ مولانا کو ٹوکیو یونی ورسٹی کے عہدے سے برطرفی کا نوٹس آگیا اور انھیں اپنے عہدے کو الوداع کہنا پڑا۔ جاپان میں مولانا کا تقریباً پانچ سال قیام رہا۔ 1912 میں وہاں سے فرانس پہنچے۔ جب جنگ آزادی کے عظیم ہیرو حکیم اجمل خان بغرض علاج پیرس آئے تو مولانا سے ملاقات کی۔ حکیم صاحب کے مولانا سے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا برکت اللہ کے پیرس قیام کا مقصد یہ تھا کہ روسی حکومت افغانستان کی فوج کی مدد کرے۔ یہ مدد اس وقت ہو جب افغان فوج ہندوستان میں قائم فرنگی حکومت پر یلغار کرے۔ مولانا نے لوزان کانفرنس کے بعد فرانس کے دارالحکومت پیرس کو اپنا مسکن بنایا۔ قیام پیرس کے دوران آزادیِ ہند کے لیے کام کرتے رہے اور یہاں بھی سرگرم ہندوستانیوں کا ایک گروپ تیار کیا۔ 1927 میں بلجیم کی عالمی کانفرنس میں غدر پارٹی کے سرکاری نمائندے کے طور پر شامل ہوئے اور یہیں پنڈت نہرو سے ان کی ملاقات ہوئی۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی نے امریکہ میں 27 ستمبر 1927 کو اس دارفانی کو الوداع کہا۔ جوں ہی مولانا کی رخصت کی خبر نشر ہوئی تو یورپ وایشیا میں ان کے مداحان اور رفقا نے غم میں کاروبار تک بند کردیے۔ ہر طرف ماتم کا عالم بپا تھا۔ راجہ مہندر سنگھ لکھتے ہیں کہ مولانا کے مذہبی عقیدے کے مطابق ان کی آخری رسم پوری کی گئی۔ تجہیز و تکفین میں ان کے وارثین اور قریبی دوست تھے جن میں ہندو، مسلم، سکھ سبھی مذاہب کے لوگ شامل تھے۔

اس عظیم انقلابی شخصیت کو فراموش کیے جانے کے درد نے سب سے پہلے جس شخص کو بے چین کیا وہ تھے ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد۔ یوں تو مولانا بھوپالی کے کارہائے نمایاں کے بے شمار تذکرے موجود تھے مگر یہ سب مختلف مضامین اور رسائل میں بکھرے پڑے تھے۔ اس مجاہد کے کچھ بکھرے ہوئے تذکرے اور مواد مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفت روزہ 'سچ' لکھنؤ، منشی شاکر نکہت سہسوانی کے 'مدینہ' ڈاکٹر پی ایس منگل مورتی کے 'دشوانی' الہ آباد، گوپال سنگھ کے 'انقلاب' لاہور، راجہ مہندر پرتاپ کی 'میری پچپن سالہ داستان حیات'، ظفر حسن کی 'آپ بیتی' خواجہ حسن نظامی کے سفرنامہ مصر وشام وحجاز میں تھے۔ مولانا پر کوئی وقیع اور مستقل کام نہ ہوسکا تھا۔ مولانا آزاد نے چتر نرائن مالویہ، سعیداللہ خان رزمی اور مولانا طرزی مشرقی کو متوجہ کیا، اور شاکر علی خان کے اشارے پر یہ کام ایم عرفان صحافی کو سونپا گیا۔ ایم عرفان نے عرق ریزی اور دیانت داری کے ساتھ اس کام کو انجام دیا۔ 1988 میں ڈاکٹر گومتی کو مولانا برکت اللہ پر زبان ہندی میں خدمات کی وجہ سے برکت اللہ یونی ورسٹی نے ڈاکٹریت کی ڈگری سے نوازا۔ 1988 میں ہی مولانا کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے بھوپال یونی ورسٹی کو 'برکت اللہ یونی سٹی' کے نام سے منسوب کردیا گیا۔

کتابیات

1. برکت اللہ بھوپالی، مصنف: ایم عرفان، صفحہ: ناشر: عفان پبلی کیشنز، بھوپال۔ایم پی، تاریخ طباعت: جون 1969۔
2. انقلابی سوانح: مولانا برکت اللہ بھوپالی۔ تالیف: سید عابد علی وجد الحسینی، شائع: مدھیہ پردیس اردو اکادمی، بھوپال۔ سنہ اشاعت: 1986
3. بھوپال تحریکاتِ آزادی کے آئینہ میں، مصنف: سید عابد علی وجدی الحسینی، کلاسیکل پرنٹرس دہلی۔ سنہ اشاعت: 1986
4. مسلم دیس بھگت، مصنف: رتن لال بنسل، شائع: ہندوستان کلچر سوسائٹی الہ آباد، سنہ اشاعت 1949
5. مشاہیر بھوپال، از: ملارموزی، اہتمام: نصیرالدین انصاری صدر جمعیۃ الانصار، بھوپال چھاؤنی۔ (ریختہ ڈاٹ کام)
6. ہندوستان کی جنگ میں بھوپال کا حصہ اور شاکر علی، مرتبہ: نصرت بانوروحی، مطبع: ہندوستان آفسیٹ پل بوگدا بھوپال۔ 23
7. جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین، مرتبہ ضامن علی خاں۔ مطبع: بھارت آفسیٹ دہلی6، سنہ اشاعت: 1991

■

Ghulam Ali Akhzar
Hose No 458/1, Street No 37,
Near Post Office, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 7275989646

تحریک آزادی کا جلی عنوان اردو زبان

عقیلہ

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو زبان وادب نے انتہائی اہم رول ادا کیا ہے۔ یاد رہے کہ زبان کا تعلق کسی مذہب یا کسی قوم سے نہیں ہوتا۔ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے جس زبان نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کو ایک صف میں کھڑا کردیا وہ اردو زبان ہی تھی۔ اس زبان کے شعرا صحافی اور ادبا نے اپنی ذمے داری کو سمجھتے ہوئے اسے ادا کرنے کی کوشش بھی کی۔ شعرا بھی ملک وقوم کی بدتر ہوتی ہوئی حالت سے بے خبر نہ تھے۔ جب انھوں نے ملک میں غیر کو حاکم بنے دیکھا تو کف افسوس ملتے رہ گئے۔ یہ دور اردو غزل کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ ایسے میں شعرا نے تغزل کے پردے میں انگریزی حکومت کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ اس زمانے میں بعض شعرا نے انگریزوں کو گلچیں اور صیاد کا نام دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ بطور مثال سودا کا شعر ملاحظہ فرمائیے۔

صبا سے ہر سحر مجھ کو لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ! گلچیں نے کس بلبل کا دل توڑا

اسی طرح مظہر جان جاناں بھی ملک کی حالت دیکھ کر تڑپ گئے۔ وہ اپنے دل کا حال کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

شاعروں نے غلامی اور اس سے پیدا ہونے والی گھٹن کو بہت پہلے ہی محسوس کرلیا تھا۔ اپنے انھیں احساسات و محسوسات کو شاعری کے ذریعے عوام تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں میر کے یہ چند اشعار پیش ہیں۔

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

آگے چل کر یہ رنج وغم بغاوت کی شکل اختیار کرلیتا ہے اب شعرا میں اتنا حوصلہ آگیا کہ وہ برطانوی حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بات کہہ سکیں۔ جب ہندوستانیوں نے اس بات کو محسوس کرلیا کہ یہ حاکم نہیں لٹیرے ہیں اور ہمارے ملک کو تباہی و بربادی کے راستے پر گامزن کررہے ہیں تو ظالم حکمراں کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ اب ڈھکے چھپے لفظوں کی جگہ للکار نے لے لی۔ 1857 کے بعد ہندوستانی عوام نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ غیر ملکی اقتدار کو اپنے ملک سے بھگانا ہے اور کسی بھی طرح آزادی حاصل کرنی ہے۔ پہلی جنگ آزادی ناکام ضرور ہوگئی تھی مگر اس ناکامی نے لوگوں کو جوش اور حوصلے سے بھر دیا تھا۔ انگریزی حکومت بھی اس بات سے باخبر ہوگئی تھی کہ جب تک ہندو مسلم کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہیں، اس ملک پر حکومت کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا انھوں نے 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی پر عمل کیا۔ ادھر ہمارے ملک کے دانش مند حضرات ان کے ناپاک منصوبے کو ناکام کرنے کے لیے قومی یکجہتی پر زور دینے لگے۔ اس طرح اردو شاعری میں فلسفیانہ نظریات، عشقیہ تصورات اور دیگر موضوعات کی طرح قومی یکجہتی کے تصورات بھی شامل ہوگئے۔

انجمن پنجاب لاہور میں ہونے والے جلسوں اور مشاعروں نے قومی یکجہتی کے نظریات کو ایک نئی رفتار اور قوت بخشی۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، چکبست اور مولانا الطاف حسین حالی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس انجمن میں ایسی نظمیں پڑھی گئیں، جن کی بنیاد حب الوطنی اور قومی یکجہتی تھی۔ حالی کی نظم 'حب وطن' اس کی بہترین مثال ہے۔ جو حالی کی وطن سے غیر معمولی محبت اور انسیت کا پتہ دیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

اسی طرح چکبست کی شاعری اپنے وقت کے سیاسی موضوعات سے لبریز تھی۔ حب الوطنی کے جذبات وخیالات کو انھوں نے بڑے ہی مؤثر انداز سے پیش کیا۔ انھوں نے ان سیاسی لیڈروں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا، جو برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج کرتے رہے اور کبھی ہار نہیں مانی۔ بال گنگا دھر تلک سے چکبست خاص متاثر تھے۔ ان کی موت سے پورے ملک میں غم کی لہر دوڑ گئی تھی۔ چکبست انھیں کچھ اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

تھا نگہبان وطن دبدبۂ عالم ترا
نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
نیند سے چونک پڑے سن لیا جو نام ترا
بندۂ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

انقلابی شاعری کی بات ہو اور جوش ملیح آبادی کا ذکر نہ ہو کیونکہ جوش کے لب ولہجے میں وہ گھن گرج ہے جو جنگ کے میدان میں سپاہی کی آواز میں ہوتی ہے۔ جوش صرف برطانوی حکومت کو للکارتے نہیں ہیں بلکہ اپنے ہم وطنوں کو بغاوت کے لیے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اکساتے بھی ہیں۔

شاید جوش کے انھیں خیالات کی بنا پر انھیں شاعر انقلاب کا لقب دیا گیا۔ ان کے یہاں ایسی نظموں کی کثرت ہے جو عوام میں جوش اور ولولہ بھردے۔ زنداں، 'شکست زنداں کا خواب'، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام اور انقلاب اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ جوش کی نظم کے کچھ اشعار جو اس موقعے پر مجھے یاد آرہے ہیں۔ جس میں وہ نہ صرف برطانوی حکومت کو ملک چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں بلکہ صاف صاف لفظوں میں انھیں دھمکاتے بھی ہیں اشعار ملاحظہ ہوں۔

خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

علامہ اقبال بھی اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ ان کے ابتدائی دور کی نظمیں حب الوطنی، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کی بہترین مثالیں ہیں۔ انھوں نے آنے والے خطرے سے ہندوستانیوں کو باخبر کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ تمہاری فلاح اتحاد میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

علامہ اقبال کو اپنے وطن ہندوستان سے بہت محبت تھی۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام 'بانگ درا' میں ایسی نظمیں کثیر تعداد میں موجود ہیں جو خالص وطن کی محبت میں لکھی گئیں۔ وہ اپنے ملک کی حالت زار دیکھ کر آنسو بہاتے ہیں 'تصویر درد' میں ان کے یہ آنسو دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ 'ترانہ ہندی' لکھ کر اقبال نے قومی شعرا کی فہرست میں اپنا نام درج کیا۔ 'ترانہ ہندی' کو آج بھی قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے۔ اسے خاص موقعے پر بڑی شان سے پڑھا جاتا ہے۔

ان شعرا کے علاوہ ایسے کئی شعرا ہیں جنھوں نے اپنی جان کی فکر نہ کرتے ہوئے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور انھیں ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی تاکید بھی کی حسرت موہانی، مجاز لکھنوی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مخدوم وغیرہ یہ ایک لمبی فہرست ہے جن کے نام اور کارنامے ان چند صفحات میں پیش نہیں کیے جاسکتے۔ بعض شعرا کو باغیانہ شاعری کی بدولت قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ لیکن ان کا حوصلہ کبھی کم نہ ہوا۔

نظم کی طرح عوام کو بیدار کرنے میں اردو نثر نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ ادیبوں نے ایسی کہانیاں تحریر کیں جنھیں پڑھ کر عوام نے غیر کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے ایسے ناولوں اور افسانوں پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا۔ جو عوام کے خون کو گرمادے۔ منشی پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ، سوز وطن جو 1908 میں شائع ہوا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی جسے انگریزی حکومت نے ضبط کیا۔ لیکن پریم چند کے حوصلے اس حادثے کے بعد مزید بلند ہوئے اور انھوں نے اپنا کام جاری وساری رکھا۔ جس کے نتیجے میں میدان عمل اور چوگان ہستی جیسے ناول وجود میں آئے۔ ان کے علاوہ اردو ڈراموں نے بھی انگریزوں کے ظلم و ستم کی داستانیں بیان کیں۔

اسی طرح اردو اخبارات نے حوصلہ اور جوش پیدا کردیا کہ وہ انگریز کے سامنے اپنی بات کہہ سکے۔ ہندوستانیوں کو احساسِ کمتری سے نکالنے والے یہ اخبارات ان کا سب سے طاقتور ہتھیار بھی بنے۔ انگریز حکومت کو اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا اس لیے وہ اسلحے کو دبانا اور کچلنا چاہتے تھے۔ مگر ایسا کر نہ سکے۔ کئی صحافیوں کو قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں، کچھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بعض کو ایسی دردناک سزائیں دی گئیں کہ سن کر روح کانپ جائے۔ لیکن یہ آزادی کے متوالے تھے اپنی دھن میں پکے، سزا اور اذیتیں برداشت کیں مگر راستہ نہ بدلا۔ انھیں نہ موت کا خوف تھا نہ پکڑے جانے کی فکر، انھوں نے اپنا مقصد حیات آزادی مقرر کرلیا اور پھر سکون سے نہ بیٹھے۔ ڈنکے کی چوٹ پر حکومت سے بغاوت کی۔ ان صحافیوں نے خبروں کی آڑ میں ہندوستانیوں میں غیرت جگائی، ان میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کر دیا کہ وہ سر کٹانے کے لیے تیار ہوگئے 'کلکتہ کا جام جہاں نما' اردو کا پہلا اخبار تھا۔ جس نے ملک کی سرگرمیوں سے باخبر کیا۔ اس کے بعد اردو زبان میں اخباروں کا سلسلہ جاری ہوا۔ جنھوں نے چنگاری کو آگ میں تبدیل کرنے کا کام انجام دیا۔ دہلی کا 'اردو اخبار' حسرت موہانی کا 'اردوئے معلّٰی' 'مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' اور 'البلاغ' 'پیسہ اور زمیندار وغیرہ بھی اہم اخبارات تھے۔ جس کے ذریعے عام آدمی تحریک آزادی میں شامل ہوتا گیا اور اس تحریک میں جان ڈالتا گیا۔

1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے ظلم کا پہاڑ صحافیوں پر بھی ٹوٹا تھا۔ محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر جو انقلاب زمانہ میں سچی اور حقیقی رپورٹنگ کر رہے تھے۔ انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ اسے اردو زبان کا شرف سمجھیے کہ محمد باقر اس زبان سے وابستہ تھے اور اپنا فرض ادا کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ یہ پہلے ہندوستانی صحافی تھے جنھوں نے ملک کی خاطر جام شہادت نوش کیا۔

'پیسہ اخبار' بھی اردو صحافت میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مدیر محبوب عالم انگریزوں سے سخت ناراض تھے اور ان کے خلاف بے خوف لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے اخبارات زمیندار، ہمدرد زمانہ وغیرہ اخبارات بھی اپنی ذمے داری اچھی طرح نبھا رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کا نام بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اردو کے مشہور شاعر، کامیاب مجاہد آزادی اور ذمے دار صحافی تھے۔ 1903 میں علی گڑھ سے حسرت موہانی نے 'اردوئے معلّٰی' نکالا۔ یہ رسالہ ادبی اور سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھا۔ وہ انگریزوں سے پوری طرح آزادی چاہتے تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ آزادی اور وطن سے متعلق جو جذبات انھیں بے چین رکھتے ہیں وہی جذبات ان کے ہم وطنوں میں بھی منتقل ہو جائیں اس کے لیے انھوں نے صحافت کا راستہ اختیار کیا اور کئی بار جیل بھی گئے۔ 1908 میں 'اردوئے معلّٰی' میں 'مصر میں انگریزوں کی پالیسی' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا حالانکہ یہ مضمون مولانا حسرت نے نہیں لکھا تھا۔ اس کے باوجود انھیں دو سال کی قید اور پانچ ہزار جرمانے کی سزا ہوئی۔ لیکن مولانا کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ جرمانہ ادا کرسکیں۔ لہٰذا حکومت نے ان کا کتب خانہ نیلام کر دیا۔ اتنا کچھ برداشت کرنے کے بعد بھی مولانا حسرت کی ہمت میں ذرّہ برابر کمی نہ آئی۔ بلکہ انگریزوں کے خلاف نفرت اور غصے میں مزید اضافہ ہوگیا۔ رہائی کے بعد ایک بار پھر مولانا نے 'اردوئے معلّٰی' نکالا۔ لیکن مالی تنگی اور حکومت کی ناراضگی کے سبب اسے جلد بند کر دیا گیا۔ مولانا حسرت موہانی انگریزی حکومت کے خلاف جلسوں میں پر جوش تقریریں بھی کرتے تھے۔ جس کی بدولت انھیں قید بھی ہوئی بہر حال انھیں کئی مصیبتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن آزادی کی تحریک میں وہ برابر شریک رہے۔

تحریک آزادی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اہم رول ادا کیا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اگر مولانا آزاد نہ ہوتے تو ملک کو آزادی نہیں ملتی لیکن ہاں! اتنا ضرور ہے کہ اس تحریک کی رفتار اور سرگرمیوں کو کچھ کمی ضرور واقعہ ہوتی۔ مولانا آزاد کی خدمات تحریک آزادی میں سنہری حرفوں سے لکھنے کے لائق ہیں۔ ان کی بدولت مسلمانوں نے جنگ آزادی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ سرسید کی طرح مولانا آزاد بھی قوم کے خیر خواہ تھے۔ لیکن انھوں نے سر سید احمد خاں کی طرح مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا وفادار بننے کی صلاح نہیں دی۔ بلکہ انھیں اس حکومت کے خلاف کھڑا ہونے کا درس دیا۔ مولانا آزاد کو اپنے ملک وقوم سے بہت ہمدردی تھی اور یہی جذبہ انھیں کم عمری میں ہی صحافت کی طرف لے آیا۔ محض بارہ سال کی عمر میں "گلدستہ نیرنگ عالم" شائع کیا۔ ان کا تعلق تقریباً ایک درجن اخبارات سے رہا۔ ان کے سب سے مشہور و مقبول رسالے 'الہلال' اور 'البلاغ' بھی اہم ہیں۔ الہلال 1912 میں شائع ہوا لیکن جلد ہی اسے بند کرنا پڑا۔ 1915 میں البلاغ نکالا لیکن یہ اخبار محض پانچ مہینے بعد بند ہوگیا۔ 1927 میں الہلال ایک بار پھر جاری کیا۔ دراصل مولانا آزاد ان رسالوں کے ذریعے تحریک آزادی کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کی مدد سے قومی تحریکات کی وضاحت کی اور اس بات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ وطن سے محبت ایمان کا لازمی جز ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمان مل کر آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزی حکومت کو ان اخبارات سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ انھوں نے اس پر طرح طرح کے جرمانے اور پابندیاں عائد کیں اور آخر 1927 میں ہمیشہ کے لیے بند کرنا پڑا۔

مختصر یہ کہ تحریک آزادی میں اردو زبان نے قربانیاں دیں۔ 'انقلاب زندہ باد'، 'سرفروشی کی تمنا'، جیسے پر جوش ولولہ خیز اور خون کو گرما دینے والے نعرے اسی زبان کی دین ہیں۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کی بدولت اردو کے کئی صحافیوں، شعرا اور ادیبوں کو طرح طرح سے ستایا گیا، انھیں اذیتیں دی گئیں۔ کئی لوگوں کو کالا پانی کی سزا ہوئی اور بعض لوگوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کے باوجود بھی ان مجاہدین نے ہار نہیں مانی۔

اردو میں ایسی لاتعداد تحریریں موجود ہیں جن میں عام آدمی کو آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ غرض اس زبان میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزادی کے متوالے بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک تہائی حصہ قید میں گزارا اور محمد باقر جیسے جانباز بھی موجود ہیں۔ جنھوں نے حق کی خاطر اپنی جان نچھاور کردی۔

■

Aqeela
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007

کرامت علی کرامت

شہرِ آہن کا شیشہ گر
رونق دکنی سیمابی

ادبی اعتبار سے ہندوستان میں ایسے خطے بھی موجود ہیں جن پر نہ کبھی سحاب کی ایک بوند ٹپکی اور نہ جن کی طرف کبھی کوئی نہرِ شاداب بھٹکی۔ ایسے علاقوں میں اردو کے وہ شعرا جو اپنے خونِ دل و جگر سے شعر و ادب کی آبیاری کرتے ہیں، واقعی لائقِ صد تحسین ہیں۔ ایسے شعرا میں رونق دکنی سیمابی کا بھی ذکر آتا ہے جنھوں نے آندھرا کے غیر ادبی علاقے وشاکھا پٹنم میں پیدا ہوکر اسی ماحول سے اپنی فطری جودت و فطانت کے ذریعے اردو شعر و ادب کے اعلیٰ اقدار کا عرفان حاصل کیا ہے۔ ان کا اصل نام محمد عظیم خاں اور سنہ پیدائش 1902 تھا۔ اس اعتبار سے وہ ترقی پسندوں کے پیش رو مثلاً احسان دانش، حفیظ میرٹھی، فیض، جمیل مظہری وغیرہ کے ہمعصر ہیں اور ان کا ذہن و شعور بھی انہی سماجی سیاسی اور ادبی نشیب و فراز سے دوچار ہوا ہے جن سے دانش، حفیظ، فیض یا جمیل مظہری کا ذہن و شعور متاثر ہوا تھا۔

رونق 18 سال کی عمر میں بہ سلسلۂ ملازمت جمشید پور منتقل ہوگئے اور اسی شہرِ آہن کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا۔ موصوف نے اس آہنی شہر میں پہلی بار 1920 میں مشاعروں کی داغ بیل ڈالی۔ پہلے پہل نکڑ کی روشنی میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے سیماب لٹریری سوسائٹی کی بنا ڈالی جس کے زیرِ اہتمام جمشید پور میں بڑے بڑے یادگار مشاعرے منعقد ہوئے۔ ان مشاعروں میں وقتاً فوقتاً جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، جمیل مظہری، مجروح سلطانپوری جیسے اکابرِ شعر و ادب نے شرکت فرمائی۔ جمشید پور میں مسلسل ادبی خدمات انجام دیتے ہوئے 4 نومبر 1984 کو 82 سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور وہیں ساکچی قبرستان میں پیوندِ خاک ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام میں 'متاعِ ہنر' کے نام سے ایک شعری مجموعہ 1983 میں نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن (یوپی) کی جانب سے اور ان کے انتقال کے بہت بعد 'کلیاتِ رونق دکنی سیمابی' کے نام سے ایک غزلیہ مجموعہ 2020 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کی جانب سے شائع ہوا۔

علامہ سیماب کے بے شمار شاگردوں میں رونق دکنی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، اس لیے بھی کہ علامہ کو ان سے کافی رغبت تھی۔ سب سے پہلے رونق دکنی نے حضرت عار بارکپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

1938 میں عار بارکپوری کے انتقال کے بعد عبدالرشید داد صدیقی سے تحریک پا کر انھوں نے اپنا کلام علامہ سیماب کے پاس بھیجا مگر علامہ نے اصلاح دینے سے اس لیے صاف انکار کردیا کہ رونق کی شاعری قدیم رنگ کی روایتی شاعری تھی۔ اس اطلاع سے رونق دکنی کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ انھوں نے عہد کرلیا کہ وہ علامہ سیماب کا نظریہ بدل کر ہی رہیں گے۔ اس لیے انھوں نے 20 مئی 1938 کو دبستانِ آگرہ کے مخصوص رنگ میں غزل کہہ کر علامہ کے پاس بھیجی، تو علامہ کو کہنا پڑا ''مجھے یقین ہے کہ آپ نے ذرا توجہ سے کام لیا تو آپ بہت جلد فکرِ صحیح پر قابو پالیں گے۔'' اس کے بعد سلسلۂ اصلاح سات سال تک جاری رہا۔ بالآخر 1945 میں انھیں 'فارغ الاصلاح' کی سند مل گئی۔

رونق دکنی کا قلم نظم، غزل، رباعی، مسدس، آزاد نظم غرض تقریباً ہر مانوس صنفِ سخن میں گلکاریاں کرتا رہا ہے۔ انھیں اساتذہ میں سیماب، فانی اور معاصرین میں جگن ناتھ آزاد اور غلام ربانی تاباں بہت پسند ہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں رونق دکنی نے فانی کا سا دل اور سیماب، آزاد اور تاباں کا سا دماغ پایا ہے۔ دماغ سے مراد ان اصحاب کا وہ ذہنی رویہ جس سے انھوں نے کلاسیکیت اور رومانیت ان دونوں سطحوں کو پگھلا کر ایک سطح بنا دیا ہے۔ دراصل کلاسیکیت اور رومانیت ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ بقول والٹر پیٹر ''کلاسیکیت حسن میں تنظیم کا نام ہے اور رومانیت حسن میں استعجاب کا۔'' دراصل تنظیم اور استعجاب دونوں حسن کی خصوصیات میں سے ہیں جو ایک ہی سکے کے دو رخ کی طرح عمل پیرا ہوتے ہیں۔ رونق دکنی کے کلام میں کلاسیکل شعرا کی طرح فنی پابندی بھی ہے اور رومانی شعرا کی طرح فکر و خیال کی آزادی بھی۔ ان کی شاعری صاف ستھری مہذب قسم کی شاعری کی عمدہ مثال ہے جو دبستانِ آگرہ کا خاصہ ہے۔

جہاں تک نظموں میں بھوک اور افلاس کا تعلق ہے، رونق ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن ان کی روش ترقی پسندوں کی عام روش سے ہٹ کر ہے، کیونکہ یہ افادیت کا لیبل لگا کر اصلاح پسندی تک نہیں پہنچتی بلکہ سماج کو صاف و شفاف آئینہ دکھانے کا کام کرتی ہے۔ مثلاً نظم 'بھوک' میں فرماتے ہیں۔

ہوش ہوجائے معطل آگہی دے دے جواب
تازگی کی روح ہوجائے حجاب اندر حجاب
مسترد کردے نظامِ دل جب آئینِ دماغ
جب دماغ و دل کے گل ہونے لگیں روشن چراغ
فطرتاً یہ کیفیت ہے، ترجمانی بھوک کی
جاگتی ہے لے کے انگڑائی جوانی بھوک کی

یہاں شاعر موجودہ نظامِ حیات کا مصلح یا مسیحا نہیں بلکہ ایک مصور کی طرح اس کے رستے ہوئے زخموں کا ترجمان نظر آتا ہے۔

مادی علم و دانش کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے انسان میں ملحدانہ ذہنیت فروغ پانے لگی ہے۔ نظم 'بیگانۂ فردا' اس ملحدانہ ذہنیت کے خلاف ایک زبردست ضرب ہے۔ اس نظم میں فرشتے ان الفاظ میں 'جدید انسان' کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

یہ مشتِ خاک بھی آمادۂ بغاوت ہے
اسے ہے زعم کہ ہے ذمہ دارِ بست و کشود
قصورِ فہم کی جدت طرازیاں توبہ
یہ کہتے ہیں تری قدرت کو کوششِ بے سود
یہی ہے حاصلِ تحصیلِ علم تو اک دن
بکھر ہی جائے گا شیرازۂ قیام و قعود

قادرِ قیوم کا جواب سنیے۔

بہ زعمِ علم مری ذات کے نہیں قائل
دلوں سے جوہرِ ایماں بھی ان کے ہے مفقود
غرض یہ ہے کہ سلیم الخیال و دانا ہیں
بہ ایں شکوہ یہ نا آشنائے فردا ہیں

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ انسان جتنی بھی ترقی کرجائے، اس کا مستقبل اس سے ہمیشہ تاریک رہے گا، اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر آئنسٹائن اور ملنے جیسے سائنس دانوں کو بھی قادرِ مطلق پر ایمان لانا پڑا تھا۔ مذکورۂ بالا نظم کے اسلوب و اندازِ بیان میں، ممکن ہے اقبال کے تتبع کا گمان گزرے، لیکن اقبال کی خوبیوں کو اپنانا بھی تو ایک کمال ہے۔

رونق دکنی موجودہ تہذیب کی مادی ترقیوں سے مطمئن نہیں ہیں، کیونکہ اس مادی ترقی کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کا انسان روحانی تنزل کا شکار ہو چلا ہے اور اس مادی ترقی کے ہاتھوں خود اپنی ہستی کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

چاند تاروں کی خبر کے لیے کوشاں ہے بشر
اپنی عظمت سے مگر بے خبری آج بھی ہے

ان کا یہ شعر معنوی اعتبار سے امجد نجمی کے اس شعر کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔

چرخ پر اڑ کے بھی بے بال و پری باقی ہے
مل گئی چشم تو کیا بے بصری باقی ہے

حادثے، ادارے، تاثر، سکون وغیرہ رونق کی بہت ہی کامیاب نظمیں ہیں۔ نظم 'حادثے' اس نازک ردعمل کی ترجمان ہے جسے شاعر نے 'بت احساس شعور کے ٹوٹنے' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بت رومان، امید، آرزو، شوق، ارادہ، زعم کسی کا بھی بت ہوسکتا ہے، کیونکہ انہی عناصر سے 'شعور' مرکب ہے اور قاری کا ذہن ان عناصر میں سے کسی کی طرف مبذول ہوسکتا ہے۔ اس طرح ہمارے ذہن میں گوناگوں تصویریں ابھرتی ہیں جو ہمیں جمالیاتی نشاط عطا کرتی ہیں۔ اس نظم میں ایسے خوبصورت پیکر استعمال ہوئے ہیں، جن میں تازگی، انوکھاپن اور قوتِ ترسیل تینوں صفتیں موجود ہیں۔ مثلاً کثرتِ نور سے ایوانِ خیال کا درخشاں ہونا، دل افسردہ کا اشک شبستانِ مجال بننا، بالیدگیِ روح کا انگڑائی لینا، خوابیدہ محبت کے ایاغ کا چھلکنا، بلندیِ فلک سے تارا ٹوٹنے کی طرح یا کسی بدبخت کے جینے کا سہارا ٹوٹنے کی طرح بتِ احساس شعور کا ٹوٹنا وغیرہ۔ خیال، دل، روح، محبت، احساسِ شعور، جیسے مجرد (Abstract) اشیا ذہن شاعر کو جس وجدانی کیفیت سے آشنا کرتی ہیں، اس کا پرخلوص ابلاغ مذکورۂ بالا پیکروں کی مدد سے بخوبی عمل میں آتا ہے۔

نظم 'ارادے' دو آوازوں پر مشتمل ہے۔ پہلی آواز دورِ حاضر کی مایوسی، ناکامی اور ناامیدی کی بازگشت ہے۔ دوسری آواز میں شاعر کے عزم عمل کی شمعیں فروزاں ہیں۔ یہ آواز دراصل شاعر کے ضمیر کی آواز ہے جو اس مصرع کے اردگرد گھومتی ہے۔

آدمی کو ابھی انسان بنانا ہوگا

اس نظم میں طاقِ غم میں ارمان کے چراغ کا سسکنا، جبینوں میں ناامیدی کا غبار مسلط ہونا، میکدۂ شوق کا ویراں ہونا، خونِ امروز سے فردا کے ایاغ کا چھلکنا جیسے بہت ہی کامیاب پیکر استعمال ہوئے ہیں جو جدید انسان کی ظاہری و باطنی کشمکش کو بہ حسن وخوبی واضح کررہے ہیں۔

نظم 'سکون' ایک ایسی آزاد نظم ہے جس کا آزاد فارم مرکزی خیال کی مناسبت سے فطری طور پر ابھر آیا ہے۔ اس طرح کا آزاد فارم کم ازکم رونق دکنی کے ہمعصر کسی شاعر سے متوقع نہیں ہے۔ حضرتِ سیماب سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے بعد رونق دکنی کی نظموں اور غزلوں میں حسن وعشق کی روایتی روداد ایک طرح سے مفقود نظر آتی ہے۔ پھر بھی وہ اشارے کنایے میں حسن وعشق کی بہت سی گہری داستانیں کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ شعر لیجیے۔

باعثِ تزئینِ رنگ و بو نہیں ان کا وجود
پھر بھی کانٹوں کا چمن میں حقِ پیدائش تو ہے

کانٹوں کا عشق کی صعوبوں سے اور تزئینِ رنگ و بو کا حسن کی آرائش وزیبائش سے رشتہ جوڑا جاسکتا ہے کہ نہیں؟

وارداتِ قلبی جو وہم، یاس وحسرت، غم، ارمان، ناامیدی، شوق، مجبوری، درد، محرومی، عقیدت، انبساط جیسی مابعدالطبعی کیفیات سے مرکب ہیں یا پھر عناصر نفسی مثلاً تصور، غرور، خیال، شعور، احساس ان سب کے ردعمل کی شاعرانہ عکاسی ان کے کلام میں مل جاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

1 وہم نے ڈال دی ہے روئے حقیقت پہ نقاب
2 شدتِ یاس سے بوجھل ہے فضا
3 وہ جو اک حسرتِ ناکام ہے گردش کی شکار
جنبشِ چشم فسوں ساز تک آپہنچی ہے
4 طاقِ غم میں یہ سسکتے ہوئے ارماں کے چراغ
5 ناامیدی کا جبینوں پہ مسلط ہے غبار
6 لذتِ کش مکشِ شوقِ فراواں نہ رہے
بات دل کی اگر اظہارِ بیاں تک پہنچے
7 وفا کی اف رے مجبوری کہ ذکرِ دردِ دل کو بھی
بہ عنوانِ حدیثِ دیگراں کہنا ہی پڑتا ہے
8 نقاب اٹھا نہ سکے روئے انبساط سے ہم
کچھ اس میں سازشِ محرومیِ حیات بھی تھی
9 سو عبادتوں پہ حاوی، سو ریاضتوں پہ غالب
مرا جذبۂ عقیدت جو ہے تجھ سے والہانہ
10 کچھ خبر ہے تجھے نامحرمِ فیضِ شبِ غم
اک سحر اور بھی ہوتی ہے سحر سے پہلے
11 وہ تصور کی حدوں سے ہوگئے جب بے نیاز
اک حجابِ بے حجابی درمیاں بنتا گیا
12 مٹ گیا حسنِ تصور کا گراں مایہ غرور
کثرتِ نور سے رخشاں ہوا ایوانِ خیال
14 پھر سے بالیدگیِ روح نے لی انگڑائی
ٹوٹ کر رہ گیا آخر بتِ احساسِ شعور

بعض موقعوں پر رونق دکنی کے کلام کی سادگی میں بھی بڑی پرکاری نظر آتی ہے۔ ایسی والہانہ شاعری میں کچھ نہیں ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ مثلاً

جابجا ہونے لگے اہلِ خرد میں تذکرے
لکھ دیا کس نے یہ دیواروں میں دیوانے کا نام
پڑ سکے غنچۂ دل پر نہ خزاں کے سائے
آشیاں جس پہ تھا، وہ شاخ ہری آج بھی ہے

ان کی غزلوں میں جدید شاعری کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً

کسی عمیق تصور میں چپ ہوں یوں رونق
کھڑا ہو جیسے سرِ رہ گزر شجر تنہا

کسی کلاسیکل غزل گو شاعر کے نزدیک 'شجر' کا اس طرح استعمال راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ یہاں شاعر نے ایک کامیاب مصور کی طرح تنہائی کے عالم کی ذہنی کشمکش کی تصویر کھینچ دی ہے، لگے ہاتھوں ایسے موقع میں غالب کا یہ شعر بھی سن لیجیے۔

ہے آدمی بذاتِ خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اخیر میں رونق دکنی کی غزلیہ شاعری کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے جن میں پختگی، شستگی، سنجیدگی اور فکری بالیدگی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

مری پلکیں ہیں چٹکتی ہوئی کلیوں کی نمود
صبح دم چاہو تو ان کلیوں سے شبنم لے لو

خود داریِ نفس کا وہ معیار ہے بلند
اظہارِ حالِ دل کی اجازت بھی اب نہیں

دیتا رہا بصیرتِ تابانیِ حیات
وہ قطرہ خونِ دل کا مژہ کی نمی میں تھا

شکستِ دل کو مقدر سمجھ لیا ہم نے
اب اور صبر ہم اس سے زیادہ کیا کرتے؟

نگارخانۂ ہستی کا ساتھ دو رونق
خوشی کے سامنے تصویرِ داد بن جاؤ

کیوں بخت کو الزام بہ ہرگام دیا جائے
اک موڑ تجھے کوششِ ناکام دیا جائے

محبت جرم بھی ہے اور سزا بھی؟
محبت میں روا کیا، ناروا کیا؟

ارضِ دکن میں پیدا ہونے کی وجہ سے انھیں تہذیبِ دکن پر ناز ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

میں کہ پروردۂ تہذیبِ دکن ہوں رونق
میری ہر سانس میں ہے ارضِ دکن کی خوشبو

واقعی شہرِ آہن کا یہ جادوگر ہمہ وقت شیشہ گری کی تلاش میں سرگرداں رہا، جیسا کہ اس کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

بنا کر شیشۂ دل توڑنا ہم کو نہیں آتا
فنِ آہن گری لے لو، ہمیں شیشہ گری دے دو

■

Prof. Karamat Ali Karamat
Rahmat Ali Building
Dewan Bazar
Cuttack - 753001 (Odisha)
Mob.:9861579171

منٹو کے تعلق سے بدلتے نظریات

محمد نہال افروز

سعادت حسن منٹو اردو ادب کا جتنا بڑا نام ہے اتنا ہی متنا زعہ نام بھی ہے۔ اسے فراڈ کہا گیا، جھکّی سمجھا گیا اور فحش نگار ٹھہرایا گیا اور اس کے فن پر طرح طرح کے اعتراض کیے گئے۔ فحش نگاری کے الزام میں اس پر مقدمے تک چلائے گئے، لیکن اچھا یہ ہوا کہ اس انتہا پسندی کو ردّ کر دیا گیا اور منٹو کو ہر مورچے پر سرخ روئی حاصل ہوئی۔

ایک وقت تھا کہ منٹو اردو کا سب سے بدنام اور فحش افسانہ نگار سمجھا جاتا تھا۔ بدنام ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اسے بے ہودہ اور سنکی بھی کہا جاتا تھا۔ اسی بدنامی اور فحاشی کی بنا پر منٹو ہمیشہ لوگوں کے دل و دماغ میں رہتا تھا۔ منٹو کو جتنا بدنام کیا گیا وہ اتنا ہی بڑا افسانہ نگار بنتا گیا۔ آہستہ آہستہ منٹو کے تئیں لوگوں کا نظریہ بدلتا گیا اور منٹو بدنامی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی فنکاری کے سبب اردو کا بڑا افسانہ نگار قبول کیا جانے لگا۔ آج پورے طور پر منٹو کو فنی بالیدگی کے ساتھ نفس الامری کو بیان کرنے والا افسانہ نگار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ پریم گوپال متّل اپنی مرتب کردہ کتاب ''سعادت حسن منٹو'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''سعادت حسن منٹو اردو ادب کا جتنا بڑا نام ہے اتنا ہی متنازعہ نام بھی ہے۔ اسے فراڈ کہا گیا، جھکّی سمجھا گیا اور فحش نگار ٹھہرایا گیا اور اس کے فن پر طرح طرح کے اعتراض کیے گئے۔ فحش نگاری کے الزام میں اس پر مقدمے تک چلائے گئے، لیکن اچھا یہ ہوا کہ اس انتہا پسندی کو ردّ کر دیا گیا اور منٹو کو ہر مورچے پر سرخ روئی حاصل ہوئی۔''[1]

پریم گوپال متّل کی باتوں سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی یہ بات بالکل درست ہے کہ منٹو کو متنازعہ افسانہ نگار قرار دیا گیا۔ اسے فراڈ، جھکّی اور سنکی کہا گیا۔ اس پر فحش نگاری کا مقدمہ چلایا گیا۔ اسے فحش نگار ٹھہرایا گیا۔ اس کے افسانوں کے موضوعات پر اعتراض کیا گیا، لیکن اس کی فن کاری پر (ابتدائی افسانوں کو چھوڑ کر) کسی نے اعتراض نہیں کیا ہے، بلکہ منٹو کو اس کی فنکاری ہی کی بنا پر ایک بڑا افسانہ نگار تسلیم کیا گیا۔ ہم منٹو کے معاصرین مثلاً عصمت چغتائی، اوپیندر ناتھ اشک، غلام عباس، حامد جلال، ہاجرہ مسرور، ابو سعید قریشی وغیرہ کے مضامین پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے منٹو کے فن پر نہیں بلکہ اس کے موضوعات پر اعتراض کیا ہے۔ چاہے وہ مضامین منٹو میرا دشمن، میرا دوست، میرا دشمن، منٹو ماموں کی موت، جو بک نہ سکا، منٹو کی موت، ہوں یا پھر مضمون 'رحم دل دہشت گرد' ہو۔ ان تمام مضامین میں منٹو کے فن پر نہیں بلکہ منٹو کی شخصیت اور اس کے افسانوں کے موضوعات پر بحث ہوئی ہے۔

کوئی بھی تخلیق کار اس لیے بڑا نہیں ہوتا کہ وہ صرف اچھے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے اور ان پر اپنی تخلیقات پیش کرتا ہے۔ بلکہ اس لیے بڑا ہوتا ہے کہ وہ اچھے موضوعات کے ساتھ ساتھ بہترین فنکاری کا بھی ثبوت دیتا ہے۔ منٹو نے بھی یہی کیا ہے، لیکن منٹو کے ساتھ ان کے معاصر تخلیق کاروں اور اس دور کے ناقدوں نے منٹو کی تخلیقات کو ایک ہی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے منٹو کی اکثر و بیشتر تصنیفات کو فحش نگاری کے زمرے میں رکھ کر دیکھا، جس کے سبب اس کے پانچ افسانوں کالی شلوار، دھواں، بو، ٹھنڈا گوشت اور 'اوپر نیچے اور درمیان' پر فحاشی کا الزام لگا کر باقاعدہ مقدمے چلائے گئے۔ ان مقدموں میں منٹو کو کئی بار سزائیں بھی ہوئیں، لیکن سیشن کورٹ میں اپیل کرنے پر ہر بار منٹو اور منٹو کے افسانوں کو فحاشی کے الزام سے بری کر دیا گیا۔ منٹو نے اپنے دلائل و براہین سے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے افسانوں میں فحشیات نہیں ہے بلکہ سماج میں خود یہ برائی پھیلی ہوئی ہے۔ منٹو اپنے اور فحش موضوعات کے متعلق خود لکھتا ہے کہ:

''اپنے متعلق میں اتنا ہی کہوں گا کہ موضوع مجھے پسند ہے، کیوں ہے؟ بس سمجھ لیجیے کہ مجھ میں Perversion ہے۔ زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ نا قابل برداشت ہے، مجھ میں جو برائیاں ہیں، وہ اس عہد کی برائیاں ہیں، میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ یہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔''[2]

منٹو اور منٹو کے افسانے فحاشی کے الزام سے تو بری ہو گئے، لیکن اُس وقت اردو ادب میں منٹو کے افسانوں کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا، جس کے وہ حق دار تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت منٹو کے افسانوں کو صرف

موضوعاتی سطح پر پرکھا جاتا تھا۔فنی خوبی یا خامی کی طرف ناقدین توجہ نہیں دیتے تھے۔منٹو کو اِس بات کی تکلیف ہمیشہ رہی ہے۔وہ چاہتا تھا کہ اس کے افسانوں پر موضوعات کے علاوہ فنی نقطۂ نظر سے بھی بات ہو،جس سے اسے کچھ حاصل ہو۔منٹو خود اپنے ایک مضمون 'تحریری بیان' میں 'ٹھنڈا گوشت' کی مدافعت میں لکھتا ہے کہ:

''مجھے آخر میں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے انتہائی افسوس ہے،استغاثے کی طرف سے میری تصنیف 'ٹھنڈا گوشت' پر کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی۔اگر ایسا ہوتا تو مجھے دلی مسرت ہوتی۔افسانے میں اگر کوئی فنی کمزوری رہ گئی تھی، بیان میں اگر کوئی سقم تھا، انشاء میں اگر کوئی خامی تھی تو مجھے اس کا علم ہو جاتا اور میں کچھ حاصل کر پاتا۔''[3]

منٹو کے فن پر سب سے پہلے ممتاز شیریں نے توجہ دی اور انھوں نے منٹو کی فنکاری پر بھر پور لکھا بھی ہے، لیکن انھوں نے منٹو کو بہت آسانی سے قبول نہیں کیا تھا۔ ممتاز شیریں نے سعادت حسن منٹو کے ابتدائی دور کے افسانوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھیں۔جب منٹو ممبئی میں رہ کر افسانوں میں اپنے نت نئے تجربات پیش کر رہے تھے اس وقت ممتاز شیریں بنگلور میں اپنے شوہر صمد شاہین کے ساتھ ایک رسالہ نکالتی تھیں۔اس رسالے میں انھوں نے افسانے کے فنی پہلوؤں پر کئی اہم مضامین شائع کیے،لیکن اس میں منٹو کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔اس کے علاوہ ممتاز شیریں نے اپنے ایک بہت ہی مشہور مضمون 'تکنیک کا تنوع' میں منٹو اور منٹو کے فن کا ذکر تک نہیں کیا ہے، جب کہ اس مضمون میں مغرب کے علاوہ اُس دور کے مشرق کے کئی افسانوں مثلاً آنندی، حرام جادی، ہماری گلی، بالکونی، شکوہ شکایت، تلاش گمشدہ، چیچک کے داغ، برہمچاری، دوفرلانگ لمبی سڑک، آہ اے میرے دوست وغیرہ کی تکنیک پر گفتگو ہوئی ہے،لیکن اس مضمون میں منٹو کے کسی افسانے کا ذکر نہیں ہے۔وقت کی تبدیلی کے ساتھ منٹو کے تئیں ممتاز شیریں کا نظریہ بدلا اور انھوں نے منٹو پر ایک بھر پور کتاب 'منٹو: نوری نہ ناری' کے عنوان سے تخلیق کی۔منٹو کے تئیں ممتاز شیریں کا نظریہ بدلنے کے متعلق مظفر علی سید لکھتے ہیں:

'نیادور' کے علاوہ اس تبدیلیٔ نظر کا سراغ خود ممتاز شیریں کے مجموعہ مضامین 'معیار' سے بھی مل سکتا ہے۔اس مجموعے کا پہلا اور ادب کے اُس دور کا ایک اہم مقالہ 'تکنیک کا تنوع' منٹو کے ذکر سے یکسر خالی ہے،جب کہ سیکڑوں مغربی اور بیسوں مشرقی افسانہ نگاروں اور ان کی تخلیقات کا حوالہ اس میں موجود ہے۔اردو کے بھی متعدد قصہ نویس اور ان کی تحریریں مختلف افسانوی تکنیکوں کی مثال کے طور پر اس مقالے میں زیر بحث آئی ہیں،مگر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ اردو زبان کے صرف دو افسانہ نگار عصمت اور منٹو اس طویل و بسیط مقالے میں ذرا سی جگہ بھی حاصل نہیں کر سکے۔اور ان میں سے ایک افسانہ نگار اتفاق سے وہی ہے، جسے بعد میں خود ممتاز شیریں نے 'معیار' کے آخری مضامین کے علاوہ ایک مستقل (مگر نا تمام) کتاب 'نوری نہ ناری' کا موضوع بنانا پسند کیا۔''[4]

مظفر علی سید کی یہ بات بالکل درست ہے کہ ممتاز شیریں نے اپنے مضمون 'تکنیک کے تنوع' میں بیسوں مشرقی افسانہ نگار کی تخلیقات کا حوالہ دیا ہے،لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس میں سیکڑوں مغربی فنکاروں کا بھی ذکر ہے، یہاں پر انھوں نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ بہر حال یہاں پر بحث اس بات کی نہیں ہے کہ مشرق اور مغرب کے کتنے فنکاروں کا حوالہ اس مضمون میں شامل ہے، بلکہ بحث اس بات کی ہے کہ منٹو جیسے بڑے فنکار کا ذکر کیوں نہیں ہے۔اس کی وجہ کیا ہے؟

دراصل ابتدا میں منٹو کے افسانوں کو صرف موضوعات کی سطح پر ہی پرکھا گیا اور منٹو کے افسانوں کو فحشیات اور منٹو کو فحش نگار کہہ کر ٹال دیا گیا۔یہی وجہ ہے کہ اس وقت کسی نقاد نے منٹو کے افسانوں کو اس لائق نہیں سمجھا کہ ان پر فنی گفتگو بھی کی جا سکتی ہے، خود ممتاز شیریں نے بھی اس وقت اپنے مضمون میں منٹو کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا،لیکن جب ممتاز شریں نے اس دور کے مشرق و مغرب کے افسانوں کے فنی پہلوؤں پر کام کیا۔اس کے بعد جب منٹو کے افسانوں کا دوبارہ بغور مطالعہ کیا تو منٹو کے تئیں ان کا نظریہ بالکل مختلف ہو گیا۔اس کے بعد ہی ممتاز شیریں نے منٹو کے افسانوں کے فنی پہلوؤں پر کام کیا اور منٹو کی فنی بالیدگی سے عام قاری کو متعارف کرایا۔ منٹو کے جن افسانوں کو فحش اور بے ہودہ کہہ کر ٹال دیا گیا تھا انھیں افسانوں کو ممتاز شیریں نے منٹو کی فن کاری کا اعلیٰ نمونہ بتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منٹو کے ابتدائی افسانوں میں فنی کمزوری ضرور دیکھنے کو ملتی ہے،لیکن بعد کے افسانوں میں منٹو نے عمدہ فنکاری کا بہترین ثبوت دیا ہے۔وہ اپنے ایک مضمون 'منٹو ایک اخلاقی فنکار' میں منٹو کی فنکاری کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''منٹو ایک سچا، دیانت دار، فطری فن کار تھا۔اس نے جو کچھ لکھا، پھر پور خلوص اور ایمانداری سے لکھا۔منٹو میں اظہار کی مسلسل تڑپ تھی، ایک شدید اندرونی لگن، ایک آگ، جس میں وہ ہمیشہ تپتا رہتا تھا، جو فن کار کی بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔''[5]

ممتاز شیریں کے نزدیک منٹو صرف دیانت دار اور فطری فن کار نہیں تھا بلکہ وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ منٹو کے افسانوں میں وقت کے ساتھ تغیر اور ارتقا بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد منٹو کے فن میں نمایاں ارتقا ہوا ہے۔منٹو کے اس دور کے افسانوں میں فنی اور نظریاتی دونوں حیثیتوں سے ایک اہم تبدیلی نظر آتی ہے۔ممتاز شیریں منٹو کے سب سے زیادہ متنازعہ افسانے 'ٹھنڈا گوشت' کے حوالے سے ان کی فنکاری کے بارے میں اپنے ایک مضمون 'منٹو کا تغیر اور ارتقا' میں رقمطراز ہیں:

'ٹھنڈا گوشت' ایک ایسا افسانہ ہے، جسے ہم منٹو کے فن کے مکمل نمونے کے طور پر لے سکتے ہیں۔منٹو کے اسلوبِ تحریر میں اب غضب کی چستی ہے۔'ٹھنڈا گوشت' اتنا گٹھا ہوا، چست اور مکمل افسانہ ہے کہ اس میں ایک لفظ بھی گھٹایا یا بڑھایا نہیں جا سکتا۔''[6]

اردو افسانے کی تنقید میں وقار عظیم کا نام اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے افسانے کی تنقید پر بہت کام کیا ہے۔افسانے پر ان کی مشہور و معروف کتابیں داستان سے افسانے تک، ہمارے افسانہ نگار، نیا افسانہ، فنِ افسانہ نگاری وغیرہ اس بات کی دلیل ہے۔ابتدا میں ممتاز شیریں کی طرح وقار عظیم بھی منٹو کے افسانوں کو لائق مطالعہ نہیں سمجھتے تھے اور اسے اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار کہتے تھے۔اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے کہ منٹو کو طوائف اور فرائڈ کے قرب نے بدنام کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وقار عظیم نے منٹو کے افسانوں کا فنی مطالعہ نہیں کیا۔ افسانے کے فن سے متعلق ان کی مشہور کتاب 'نیا افسانہ (1946)' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''منٹو اردو کے سب سے بدنام افسانہ نگار ہیں اور انھیں میرے نزدیک 'طوائف اور فرائڈ' کے قرب نے بدنام کیا ہے۔اردو کے کسی افسانہ نگار نے ان دونوں شہرہ آفاق مستوں سے جان بوجھ کر اتنا قرب حاصل نہیں کیا۔ جب منٹو طوائف کی زندگی اور فرائڈ کے نظریوں کو اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں تو ان کے بیان میں جتنی آمد اور روانی ہوتی ہے کسی اور وقت نہیں ہوتی۔اور اس لیے منٹو کے افسانوں کا تجزیہ کرنے والا اگر طوائف اور فرائڈ کو نظر انداز کرتا ہوا نکل جائے تو منٹو کے افسانوں کی دنیا کھوکھلی اور بے رنگ رہ جائے۔گو اس کھوکھلی اور بے رنگ دنیا میں رہ کر منٹو نے جتنا زیادہ لکھا ہے اپنی 'مخصوص دنیا' میں رہ کر اتنا نہیں لکھا:

> منٹو کے سبھی افسانے نہ تو طوائف کی زندگی پر مبنی ہیں اور نہ ہی فرائڈ کے نظریے پر لکھے گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ منٹو نے بہت سے ایسے موضوعات کاا نتخاب کیا ہے ،جو طوائف کی زندگی سے متعلق ہیں ،جس سے منٹو کوبہت سے لوگوں سے برائی مول لینی پڑی اور بہتوں سے گالی بھی سننی پڑی۔

’’کھوکھلی اور بے رنگ‘‘ اس لحاظ سے نہیں کہ جس دنیا کے متعلق وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ زندگی کی گہما گہمی سے خالی ہے۔ کھوکھلی اور بے رنگ صرف فنی نقطۂ نظر سے۔ ورنہ طوائف اور فرائڈ کے دائرے سے نکل کر منٹو نے ہماری زندگی کی بے شمار باتیں کہی ہیں۔‘‘7

دراصل کسی بھی فن پارے کو پرکھنے یا تجزیہ کرنے کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ موضوعاتی اور دوسرا حصہ فنی پہلوؤں کو محیط ہوتا ہے۔ ’نیا افسانہ‘ میں وقار عظیم نے منٹو کے فن پاروں کو پرکھنے کے لیے پہلے حصے کا تجزیہ تو کیا،لیکن دوسرے حصے یعنی فنی پہلوؤں پر گفتگو نہیں کی۔ موضوعاتی سطح پر ہر افسانہ نگار کی طرح منٹو کے بھی سبھی افسانے نہ تو بہت اچھے ہیں اور نہ ہی بہت برے۔ منٹو کے سبھی افسانے نہ تو طوائف کی زندگی پر مبنی ہیں اور نہ ہی فرائڈ کے نظریے پر لکھے گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ منٹو نے بہت سے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے، جو طوائف کی زندگی سے متعلق ہیں،جس سے منٹو کو بہت سے لوگوں سے برائی مول لینی پڑی اور بہتوں سے گالی بھی سننی پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ وقار عظیم نے اس وقت منٹو کے افسانوں کے فنی پہلوؤں پر گفتگو نہیں کی۔ وقار عظیم جیسے بڑے فکشن کے نقاد بھی منٹو کے افسانوں کی دنیا کو فنی نقطۂ نظر سے ’کھوکھلی اور بے رنگ‘ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں،لیکن انہی وقار عظیم نے آگے چل کر منٹو پر ایک مختصر سی کتاب محض ستر صفحے کی ’منٹو کا فن‘ کے عنوان سے لکھی، جو 1982 میں شائع ہوئی،جس میں منٹو کے تئیں وقار عظیم کا نظریہ بالکل مختلف ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے منٹو کے فن پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ’’......حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا،جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی، جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہم عصر نہیں،وہ اس کا فن ہے۔‘‘ وقار عظیم منٹو کے فن پر مزید گفتگو کرتے ہوئے مذکورہ کتاب کے آخری صفحے پر لکھتے ہیں کہ منٹو ایک بڑا فنکار تھا، اتنا بڑا تھا کہ اس کا فن اسے کبھی مرنے نہیں دے گا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

’’اس لیے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ (منٹو) ان چند کمزوریوں کے باوجود بہت بڑا فن کار تھا۔ اس کا مشاہدہ، تخیل، تصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا گہرا رنگ ہے اور شخصیت میں غیر معمولی قوت وتوانائی، وہی قوت وتوانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے۔ اور آنے والے ہر دور میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپر بن کر اس کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی ...... منٹو مر گیا...... لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔‘‘8

فکشن تنقید میں برج پریمی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ منٹو پر ان کی دو کتابیں ’سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے‘ (1986) اور ’منٹو کتھا‘ (1994) شائع ہوئی ہیں۔ انھوں نے منٹو کو ایک بڑا فن کار تسلیم تو کیا ہے،لیکن انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ منٹو کے فن پر اب تک کوئی تعمیری کام نہیں ہوا ہے، ان پر جو بھی کام ہوئے ہیں ان کی حیثیت اضطراری ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

’’... سعادت حسن منٹو نے افسانے کو موضوع، ہیئت، تکنیک اور زبان کے لحاظ سے تکمیلیت (Perfection) کے درجے پر پہنچایا۔ منٹو کی افسانہ نگاری کی فنی قدر و قیمت کا تعین ایک دشوار کام سہی، لیکن اب جب کہ افسانے کے فنی لوازم کا شعور نہ صرف نقادوں بلکہ افسانہ نگاروں میں بھی گہرا ہو رہا ہے۔ اس کام کو انجام دینا لازمی اور نتیجہ خیز ہے، کیوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ منٹو کے افسانوی ادب کی صحیح قدر و قیمت کا احساس جاگ اٹھا ہے۔ منٹو کے افسانوں پر فنی نقطۂ نگاہ سے جو کچھ مواد اِکے دُکے مضامین کی شکل میں یا منٹو نمبروں کی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ وہ ان کے آرٹ کی تفہیم اور تعین قدر کے ضمن میں اضطراری کوششیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان کوششوں میں پہلے کے طے شدہ نظریے یا جذبات کا خاصا دخل رہا ہے۔ اس لیے غیر جانب داری سے تنقید و تجزیے کا کام نہیں ہو سکا ہے۔9

درج بالا اقتباس میں برج پریمی نے منٹو کے متعلق جو باتیں کہی ہیں ان میں سے کچھ درست ہو سکتی ہیں، لیکن یہ بات قطعی درست نہیں ہے کہ ’’منٹو کے افسانوں پر فنی نقطۂ نگاہ سے جو کچھ مواد اِکے دُکے مضامین کی شکل میں یا منٹو نمبروں کی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ وہ ان کے آرٹ کی تفہیم اور تعین قدر کے ضمن میں اضطراری کوششیں قرار دی جا سکتی ہیں۔‘‘ برج پریمی کی کتاب ’سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے‘ (1986) سے چار سال قبل وقار عظیم کی کتاب ’منٹو کا فن‘ (1982) اور اس سے بھی پہلے ممتاز شیریں کی کتاب ’منٹو: نوری نہ ناری‘ منظر عام پر آچکی تھیں۔ ان میں منٹو کے فن پر تنقیدی اور تجزیاتی نقطۂ نگاہ سے اچھی گفتگو ہوئی ہے اور بہت اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں، جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ غالباً موصوف نے منٹو پر لکھے گئے ابتدائی مضامین مثلاً منٹو میرا دشمن، میرا دوست، میرا دشمن، منٹو ماموں کی موت، جو بک نہ سکا، منٹو کی موت، رحم دل دہشت گرد وغیرہ؛ کی روشنی میں یہ باتیں کہی ہیں۔ ان مضامین میں زیادہ تر منٹو کی شخصیت کو موضوع بحث لایا گیا ہے، فن پر گفتگو خال خال ہی ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے واقعی ان مضامین کو اضطراری کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔

ماضی قریب کے ناقدین میں وارث علوی نے منٹو پر کافی کام کیا ہے۔ ان کا شمار منٹو شناسوں میں ہوتا ہے۔ منٹو پر ان کی دو بہترین کتابیں ’سعادت حسن منٹو‘ اور ’منٹو: ایک مطالعہ‘ شائع ہوئی ہیں۔ وارث علوی کے نزدیک منٹو ایک منجھا ہوا، نفاست پسند اور مشاق فنکار تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں حقیقتِ نفس الامری کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ فطرت انسانی کا رمز شناس اور اعمال انسانی کے پر اسرار نفسیاتی محرکات کا نباض تھا۔ بلاشبہ منٹو ژرف بیں تھا۔ وہ چیزوں کو بہت گہرائی سے دیکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سماج کی ان حقیقتوں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے، جن سے ہم بالکل نا آشنا تھے۔ وارث علوی منٹو کی افسانہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

’’... منٹو واقعی بڑا افسانہ نگار تھا، جس کے سینے میں افسانہ نگاری کے تمام راز پنہاں تھے۔ اس کی معمولی سی معمولی کہانی بھی فنکارانہ چابکدستی اور ہنر مندی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ منٹو کبھی بھی بے کیف، بے رنگ اور بے جان نہیں ہوتا۔ تخلیق کا ایک آتشیں لاوا ہے، جو اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اس کی ہر کہانی زندگی کے انوکھے اور اچھوتے تجربات کی حرارت سے دہکی ہوئی ہے... منٹو کے ذریعے ہم پہلی بار ان حقائق سے آشنا ہوئے جن کا صحیح علم نہ ہو تو آدمی نرم و نازک اور آرام دہ عقائد کی محفوظ تحویل میں چھوئی موئی شخصیتوں کی طرح جیتا ہے۔‘‘10

شمیم حنفی نے منٹو کو ایک الگ نظریے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منٹو اپنے دور کے افسانہ نگاروں میں سب سے کم پڑھا لکھا تھا اور اپنے عہد کے بیشتر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں اس نے عمر بھی کافی کم پائی تھی، لیکن منٹو اپنے عہد کے افسانہ نگاروں سے زیادہ

حساس اور ذہین تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا، مگر کڑھا (تجربے سے بھرپور) بہت تھا۔ اس کے افسانوں کی طاقت اس کے مشاہدات، تجربات، ادراک اور اس کی ہنرمندی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد کے زیادہ تر افسانہ نگار اپنے دور کے بعد معدوم سے ہوتے جا رہے ہیں، مگر منٹو آج بھی اسی آب و تاب کے ساتھ افسانوی ادب میں باقی ہے بلکہ اس کے افسانوں کی قدر اور بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ شمیم حنفی منٹو کے باقی رہنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''... اپنے ترقی پسند ہم عصروں کے مقابلے میں، منٹو کے باقی رہنے کا سبب یہی ہے کہ منٹو نے کہانی میں نہ تو علم کا سہارا لیا، نہ عقیدے کا، نہ آئیڈیالوجی کا، نہ کرتب بازی کا۔ منٹو کی طاقت اس کا مطالعہ اور تفکر نہیں بلکہ اس کا کھرا پن اور سچائی ہے۔ منٹو کا تجربہ اور ادراک ہے۔ اس کی ہنرمندی ہے..... وہ کائنات کی ہر شے کو اور ہر شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اپنی فن کارانہ ضرورت اور طلب کے مطابق اسے ہمارے سامنے لاتا ہے''[11]

شمس الرحمٰن فاروقی اردو فکشن تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اردو کی دیگر اصناف کی طرح اردو فکشن پر بھی بہت لکھا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ سعادت حسن منٹو جدید ادب کا سب سے بڑا نام ہے۔ اس کے افسانوں میں نہ صرف موضوعاتی سطح پر تنوع پایا جاتا ہے بلکہ فنی سطح پر بھی اس نے متعدد انوکھے اور نئے تجربے کیے ہیں۔ منٹو کے افسانے کھول دو، نیا قانون اور 'ٹھنڈا گوشت' جیسی کوئی اور فنی مثال پورے اردو افسانوی ادب میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ ایسے افسانے ہیں، جن کا نقطۂ نظر افسانے کے اختتام پر واضح ہوتا ہے۔ جب ہم ان افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ابتدا میں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ افسانے بہت کمزور ہیں یا کبھی کبھی ایسا بھی احساس ہوتا ہے کہ یہ افسانہ بنا ہی نہیں، لیکن جیسے ہی افسانے کے اختتامی حصے پر پہنچتے ہیں تو ہمارا نقطۂ نگاہ ہی بالکل بدل جاتا ہے۔ ان کا اختتام موثر اور سحر انگیز ہوتا ہے۔ یہ منٹو کی فنی مہارت ہے، جو اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ اتنے بڑے فن کار کو اردو کے ابتدائی ناقدین نے محض فحش نگار سمجھا اور اسے فحش افسانہ نگار کہہ کر ٹال دیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''یہ منٹو کی بدقسمتی اور ہماری تنقید کا شرمناک عجز ہے کہ ہم منٹو کو صرف جنس نگار سمجھیں۔ یہ ہماری تنقید کی بدنصیبی اور ہمارے پڑھنے والوں کے ساتھ ظلم عظیم ہے کہ منٹو کو 'رنڈیوں کا افسانہ نگار' اور 'فحشیات کا ماہر' یا بہت سے بہت 'فسادات' کے موضوع پر چند شاک انگیز افسانوں کا مصنف' کہہ کر ٹال دیا جائے۔''[12]

شمس الرحمٰن فاروقی کو اس بات پر افسوس ہے کہ منٹو جیسے صاحب فکر فنکار کو 'رنڈیوں کا افسانہ نگار' اور 'فحشیات کا ماہر' تک ہی محدود رکھا گیا۔ ناقدین اگر اس سے آگے بڑھتے بھی ہیں تو اسے زیادہ سے زیادہ فسادات کے موضوع پر لکھنے والا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ اس کے فنی پہلوؤں پر گفتگو نہیں کرتے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو اس بات پر غصہ بھی آتا ہے۔ وہ اسے اردو تنقید کا شرمناک عجز سمجھتے ہیں۔ ان کا غصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ فاروقی آگے

یہ منٹو کی بدقسمتی اور ہماری تنقید کا شرمناک عجز ہے کہ ہم منٹو کو صرف جنس نگار سمجھیں۔ یہ ہماری تنقید کی بدنصیبی اور ہمارے پڑھنے والوں کے ساتھ ظلم عظیم ہے کہ منٹو کو 'رنڈیوں کا افسانہ نگار' اور 'فحشیات کا ماہر' یا بہت سے بہت 'فسادات کے موضوع پر چند شاک انگیز افسانوں کا مصنف' کہہ کر ٹال دیا جائے۔"

چل کر اس بابت اور سخت جملے استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے منٹو کے بعد کی نسلوں کا نقصان ہوا ہے اور ہمارے نوجوان قاری منٹو کی افسانہ نگاری کے متنوع فنی ارتفاع سے واقف نہیں ہو پائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''نقصان تو منٹو کے بعد کی نسلوں کا ہوا کہ انھوں نے منٹو کو صرف ایک آنکھ سے اور وہ بھی کانی آنکھ کے کونے سے دیکھا... بگڑا تو ہمارے نوجوان قاری کا کہ وہ منٹو کی حقیقی بصیرتوں، ان کے فن کی حقیقی گہرائیوں، افسانہ نگاری کے فن پر ان کی وسیع الذیل دسترس سے ناواقف رہ گئے۔''

ان تمام باتوں کی روشنی میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ دیر ہی سے سہی لیکن منٹو کو وہ حق ملا، جس کا وہ اصل حق دار تھا۔ منٹو اردو کا واحد افسانہ نگار ہے، جس کا شمار عالمی سطح کے افسانوی ادب میں ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو منٹو اپنے دور سے آگے کا افسانہ نگار تھا۔ چونکہ جس منٹو کو اس کے دور میں لائق مطالعہ نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ اس پر فحاشی کے الزامات لگائے جا رہے تھے۔ اس کے افسانوں پر مقدمے چلائے جا رہے تھے۔ آج ایک عرصہ گزر جانے کے بعد اسی منٹو پر 'ہمارے منٹو صاحب' جیسے مضمون اور 'ہمارے لیے منٹو صاحب' جیسی کتاب لکھی جا رہی ہے۔ یہی نہیں آج منٹو کا شمار عالمی سطح کے افسانہ نگاروں میں بھی ہو رہا ہے۔

یہ وہی منٹو ہے، جس کو ابتدا میں اردو کی پہلی خاتون نقاد ممتاز شیریں نے اس لائق نہیں سمجھا کہ اس پر روشنائی خرچ کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون 'تکنیک کا تنوع' میں منٹو کو جگہ نہیں دی، لیکن بعد میں اسی ممتاز شیریں نے نہ صرف یہ کہ منٹو کے فن پر اپنے قلم کو جنبش دی بلکہ ان پر ایک بھرپور کتاب بعنوان 'منٹو: نوری نہ ناری' بھی لکھی۔ ممتاز شیریں ہی نہیں بلکہ اردو کے ہر چھوٹے بڑے ناقد (جو بھی اردو افسانے کے فن سے تھوڑا بہت بھی سروکار رکھتا ہے) نے منٹو کی شخصیت اور اس کے فنِ افسانہ نگاری پر اپنے قلم کی روشنائی بکھیری ہے اور اسے ایک بڑے ادیب اور فنکار کے طور پر قبول کیا ہے۔

حوالہ جات:

1 پریم گوپال متل (مرتب)، سعادت حسن منٹو، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1999، ص 07
2 سعادت حسن منٹو، مشمولہ: بلراج مین را، مرتب، دستاویز، شعور پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1982، ص 118
3 سعادت حسن منٹو، مشمولہ: ممتاز شیریں، منٹو نوری نہ ناری، مکتبہ اسلوب، کراچی، 1985، ص 161
4 مظفر علی سید (دیباچہ)، منٹو: نوری نہ ناری، ممتاز شیریں، مکتبہ اسلوب، کراچی، 1985، ص 23، 24
5 ممتاز شیریں، منٹو: نوری نہ ناری، مکتبہ اسلوب، کراچی، 1985، ص 154
6 ایضاً، ص 124
7 وقار عظیم، نیا افسانہ، مطبوعہ جناح پریس، دہلی، 1946، ص 167
8 وقار عظیم، منٹو کا فن، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1982، ص 71
9 برج پریمی، سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے، دیپ پبلی کیشنز، کشمیر، 1986، ص 174
10 وارث علوی، سعادت حسن منٹو، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1995، ص 100
11 شمیم حنفی، منٹو: حقیقت سے افسانے تک، دلّی کتاب گھر، 2012، ص 289
12 شمس الرحمٰن فارقی، ہمارے لیے منٹو صاحب، ایم۔ آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2013، ص 6
13 ایضاً

■

Dr. Md Nehal Afroz
Asst. Professor(Cont.), DDE
Maulana Azad National Urdu University
Gachbowali,
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob.: 9032815440
Email: nehalmd6788@gmail.com

اردو تبصروں کا ابتدائی دور

راہین شمع

”انگریزوں کی آمد سے قبل اردو ادب میں افسانوی نوعیت کا ادب موجود تھا. داستان بھی نثر اور نظم کے پیرائے میں بیان کی جاتی تھی. ان کے آنے سے افسانوی ادب میں وسعت پیدا ہوئی. اس طرح انگریزوں کی آمد سے داستان سرائی کے تراجم کے ساتھ ساتھ ناول، ناولٹ، افسانہ، افسانچہ، انشائیہ وغیرہ کی اردو ادب میں ابتدا ہوئی. انگریزوں کی ہندوستان پر حکومت قائم ہوجانے سے ہندوستان کی ادبی دنیا میں جس وجہ سے انقلاب آیا وہ ہے پرنٹنگ پریس کا آغاز. پرنٹنگ پریس کی وجہ سے جہاں ترسیل وابلاغ وغیرہ اور کتب و رسائل کی اشاعت میں تیزی آئی. اس طرح ہندوستان میں صحافتی ادب کی شروعات ہوئی. اسی کے زیر اثر غیر افسانوی ادب کی مختلف اصناف نے اردومیں جنم لیا.“

تبصرہ عربی زبان کا لفظ ہے جو کہ ’بصر‘ سے مشتق ہے جس کے معنی بینائی یا آنکھ کے ہوتے ہیں۔ اسی مناسبت سے ذکاء اللہ نے ریویو کے لیے تبصرہ کی اصطلاح وضع کی۔ اصطلاح میں تبصرہ کے معنی: کسی بھی فن، یا تصنیف، تخلیق کا جائزہ لینا، اس کے حسن و قبح کو واضح کرنا اور ساتھ ہی فن پارے کا معیار متعین کرنا وغیرہ۔

انگریزوں کی آمد سے قبل اردو ادب میں افسانوی نوعیت کا ادب موجود تھا۔ داستان بھی نثر اور نظم کے پیرائے میں بیان کی جاتی تھی۔ ان کے آنے سے افسانوی ادب میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس طرح انگریزوں کی آمد سے داستان سرائی کے تراجم کے ساتھ ساتھ ناول، ناولٹ، افسانہ، افسانچہ، انشائیہ وغیرہ کی اردو ادب میں ابتدا ہوئی۔ انگریزوں کی ہندوستان پر حکومت قائم ہوجانے سے ہندوستان کی ادبی دنیا میں جس وجہ سے انقلاب آیا وہ ہے پرنٹنگ پریس کا آغاز۔ پرنٹنگ پریس کی وجہ سے جہاں ترسیل وابلاغ وغیرہ اور کتب و رسائل کی اشاعت میں تیزی آئی۔ اس طرح ہندوستان میں صحافتی ادب کی شروعات ہوئی۔ اسی کے زیر اثر غیر افسانوی ادب کی مختلف اصناف نے اردو میں جنم لیا۔

انگریزوں کے ہی دور حکومت میں مخصوص طبقے کے لیے کی گئی جد وجہد نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی تھی جس کو سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ واحد ایسی تحریک ہے جس کے اثر سے غیر افسانوی ادب کی مختلف اصناف اور موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے غیر افسانوی ادب کی دیگر اصناف کا سہارا لیا۔ اس تحریک سے جن اصناف کو عروج حاصل ہوا ان میں اداریہ نگاری، مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، سوانح نگاری، تنقید نگاری اور تبصرہ نگاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے انگریزی طرز پر اردو میں شائع شدہ کتب و رسائل پر ریویو لکھے۔ جن کا مقصد اردو میں بھی وہی رہا جو انگریزی میں ہوا کرتا تھا۔ یعنی نئی کتب و رسائل کی اشاعت سے عوام کو باخبر کرنا۔ اس سے قبل اردو میں نئی کتابوں پر جو تحریریں لکھی جاتی تھیں وہ پیش لفظ، مقدمات، دیباچے اور تقریظیں وغیرہ۔ جو کتاب کے ساتھ ہی شائع ہوا کرتے تھے۔ علی گڑھ تحریک کے علمبرداروں نے جہاں مختلف موضوعات کی کتب و رسائل پر تبصرے لکھے وہیں انھوں نے ریویو نویسی کے اصول وضوابط پر بھی سب سے پہلے گفتگو کی۔ ان میں سب سے پہلا نام علی گڑھ تحریک کے روح رواں سرسید احمد خاں کا ہے۔ جنھوں نے انگریزی ریویو نگاری کے اثر سے اردو میں تبصرے لکھے اور تبصرہ کے اہم اصول و ضوابط کی بھی نشاندہی کی۔ سرسید احمد خاں کتاب ’نجم الامثال‘ پر تبصرہ میں تبصرہ کے اہم شرائط کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اگر ہم ان تمام باتوں کو راستی کے ساتھ بیان نہ کریں جو اس کتاب میں ہیں تو ہم صرف ایک مداح ہوں گے اور اس کے حسن و قبح کی نظر کرنے والے نہ ہوں گے۔ اس لیے ہم اس بات کو بیان کیے بغیر نہ رہ سکتے۔“

(مقالات سرسید، (جلد ہفتم) مرتبہ، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب،

نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور، اشاعت: 1962، ص: 293)

سرسید احمد خاں کی تحریر سے تبصرہ نگاری کے اہم نکات کی وضاحت ہوتی ہے مثلاً:

تبصرہ نگار کتاب کی اصل حقیقت کو بیان کرے۔ تبصرہ نگار فن پارے کی حقیقت کو واضح نہیں کرے گا تو وہ صرف قصیدہ خواں ہوگا، تبصرہ نگار فن پارے کے حسن و قبح دونوں پر نظر رکھے۔

انگریزی میں جس طرح تبصرہ کو 'بک ریویو' کہا جاتا ہے۔ سرسید کے عہد میں بھی 'بک ریویو' کو کتاب پر ریویو کہا جاتا تھا۔ ترجمہ صرف بک کا کیا گیا مگر ریویو کے لیے انگریزی کی اصطلاح ہی استعمال کی جاتی رہی۔ سرسید کے رفیقوں میں مولوی ذکاء اللہ نے بھی سرسید کی ہی طرح ریویو کے ترجمہ کی وضاحت 'مدوجزر اسلام' پر تبصرہ میں کی ہے۔ ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

''ریویو ایک انگریزی لفظ ہے۔ جس کے اصل معنی نظر ثانی کرنے کے ہیں۔ مگر اصطلاحی معنی اس کے یہی ہیں کہ کتابوں کی عیب وصواب بینی۔ اب ایک عربی لفظ تبصرہ ہے۔ جس کے معنی دکھا دینے کے ہیں۔ جیسے ریویو کے اصل معنی کی مناسبت سے عیب وصواب بینی کے انگریزی میں ہوگئے۔ اس طرح تبصرہ کے معنی عیب و صواب دکھادینے کے ہماری زبان میں ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ کوئی اس کو استعمال کرے۔''

(تبصرہ یعنی ریویو، مسدس مدوجزر اسلام، مشمولہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ماہ شوال 1310ھ، مطابق: 80-1879، ص: 168)

سرسید احمد خاں نے تبصرہ کی جن شرائط کو ضروری قرار دیا ہے، مولوی ذکاء اللہ نے بھی انھیں شرائط کو معنی میں ڈھالا ہے۔

سرسید کے ساتھیوں میں تبصرہ نگاری کے فن پر مہدی افادی نے بھی گفتگو کی ہے۔ 'تمدن عرب پر ایک کھلی چٹھی' کے نام سے مہدی افادی کا تحریر کردہ مضمون (اس کو تبصرہ ہی کہنا چاہیے) جو کہ 1899 میں رسالہ ریاض الاخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مہدی افادی لکھتے ہیں:

''میں (تمدن عرب) کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں تاریخی فلسفہ کا بہترین نمونہ ہے اور میں اپنی اس رائے میں غالباً منفرد نہیں ہوں کہ ترجمہ کے لحاظ سے لائق سے لائق شخص کا انتہائی تخیل جو کچھ ہوسکتا ہے، کتاب اس کی پوری تصویر مرئی ہے۔ افسوس ہے کہ میں اپنی مصروفیت سے اس قدر وقت نہیں پاتا کہ اپنے دعویٰ کی دلیل میں اقتباسات کو پیش کرسکوں، یہ فرض ریویو نگار کا ہے''

(افادات مہدی: مرتبہ مہدی بیگم، مطبوعہ: معارف پریس، اعظم گڑھ، اشاعت: 1939، طبع سوم، ص: 11)

اس کے علاوہ مہدی افادی نے 'علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ' کے عنوان سے تبصرہ لکھا جو 1906 میں رسالہ البشیر میں شائع ہوا۔ ریویو کے متعلق مہدی افادی لکھتے ہیں:

''فاضل ایڈیٹر پر کچھ ریویو کرنا منظور ہے، مگر یہ اس قدر مشکل کام ہے کہ سمجھ میں نہیں آیا کہاں سے شروع کروں۔ اردو لٹریچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آج کل کے وسیع معیار قابلیت کے لحاظ سے اہل قلم کی صف اول میں شامل ہونے کے لائق ہوں۔ سرسید سے قطع نظر کرنے کے بعد جن کو بالاستحقاق اولیت کا فخر حاصل ہے، میرا خیال ہے، شبلی بلحاظ فن صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں ہیں۔'' (ایضاً، ص: 74)

مہدی افادی نے 'شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر' پر تبصرہ کیا جو رسالہ 'مشرق' 1910 میں شائع ہوا۔ جس میں مہدی افادی نے ریویو نگاری کے ایک اہم نکتے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شعر العجم' کے جزئی عیوب بھی ریویو نگار کے خیال میں اتنے ہیں کہ اگر وہ ابھار کر دکھا دیے جائیں تو ایک دوسری کتاب تیار ہوسکتی ہے۔'' (ایضاً، ص: 166)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ریویو کے فرائض کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تبصرہ نگار فن پارے کے متعلق جو دعویٰ کرے اس کی دلیل دے اور اس دلیل کے لیے اقتباسات کتاب سے نقل کیے جاسکتے ہیں۔ حالانکہ تبصرے کا مختصر ہونا شرط ہے۔ اس لیے اقتباسات یا زیادہ اقتباسات نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے ہاں اگر اقتباس نقل کرنا ضروری ہے تو اس اصول کی پیروی کرنا بھی یقینی ہے اور یہ ممکن اس وقت ہوسکتا ہے جب اخبارات میں ریویو کے لیے صفحے کی تعداد مختص نہ ہو یا اختصار کی پابندی نہ ہو۔ ادارے کا مقصد تبصرہ کے نام پر اشتہار نہ ہو۔ لیکن یہ بات ایسی بھی نہیں کہ تبصرہ نگاری کے اصول سے خارج کر دینا چاہیے۔ طویل تبصروں میں اس کی خوب گنجائش ہوتی ہے۔ جبکہ اشتہاری یا کیٹلاگ میں دلیل کی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔

تبصرہ بہت مشکل کام ہے۔ اگر مصنف سے دوستی ہے تو وہ اور زیادہ مشکل ہوجاتا ہے کیونکہ ہم ساتھیوں کی خوبیوں اور خامیوں دونوں سے واقف ہوتے ہیں لیکن جب بیان کا تذکرہ آتا ہے تو ہم صرف خوبیاں ہی گنواتے ہیں۔ خامیوں کو جانتے بوجھتے بیان کرنے سے کتراتے ہیں۔ یا پھر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اپنوں کے ساتھ ہمدردی اور جانب داری کے جذبے سے ہٹ کر رائے دینا ہمارے لیے نہایت گراں بار ہوتا ہے۔

تبصرہ نگار فن پارے کے متعلق جو دعویٰ کرے اس کی دلیل دے اور اس دلیل کے لیے اقتباسات کتاب سے نقل کیے جاسکتے ہیں۔ حالانکہ تبصرے کا مختصر ہونا شرط ہے۔ اس لیے اقتباسات یا زیادہ اقتباسات نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے ہاں اگر اقتباس نقل کرنا ضروری ہے تو اس اصول کی پیروی کرنا بھی یقینی ہے اور یہ ممکن اس وقت ہوسکتا ہے جب اخبارات میں ریویو کے لیے صفحے کی تعداد مختص نہ ہو یا اختصار کی پابندی نہ ہو۔ ادارے کا مقصد تبصرہ کے نام پر اشتہار نہ ہو۔

1980 کے آس پاس مہدی افادی نے علامہ شبلی نعمانی کو خط لکھا جس میں ریویو کے تعلق سے بات کی تھی۔ مہدی افادی نے 1890 کے دوران جو خط علامہ شبلی نعمانی کو لکھے تھے ان تک میری رسائی نہیں ہو پائی ہے۔ مگر مہدی افادی کے خط کے جواب میں علامہ شبلی نعمانی کا لکھا گیا خط ملا۔ جو 8 مئی 1890 کو لکھا گیا تھا۔ مہدی حسن کے نام علامہ شبلی نعمانی کا خط دیکھیے:

''ریویو کا جو تذکرہ آپ کے خط میں ہے وہ شاید مناسب نہ تھا، گو آپ کا منشا نہ ہو لیکن اس سے متبادر ہوتا ہے کہ ریویو گویا کتاب کا ایک قسم کا معاوضہ ہے، حالانکہ مصنف کی بڑی پست فطرتی ہے کہ وہ لوگوں سے ریویو لکھانے کا شائق ہو، اگر کوئی شخص کسی معقول کتاب پر ریویو لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے تو ہر حالت میں اس کو لکھا چاہیے، لیکن ریویو کوئی آسان چیز نہیں ہے، ہمارے ریویو نگاروں کے لیے یہی بہت ہے کہ ان کی یہ قابلیت تسلیم کی جائے، نہ کہ اس سے کسی مصنف پر احسان رکھا جائے، ملک میں شاید ایسے مضمون نگار دو تین سے زیادہ نہیں ہیں، جن کے ریویو سے کسی مصنف کو خوشی ہوسکے، خدا کرے آپ کا محمڈن کلب کامیاب ہو اور بے ہودہ قسم کی کتابیں (ناول وغیرہ) اس کی الماریوں کی آغوش میں نظر نہ آئیں۔

والسلام

شبلی از علی گڑھ، 8 رمئی 1890ء''

(مکاتیب شبلی (جلد دوم) مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، پوسٹ بوکس نمبر 19، اعظم گڑھ (ہند) 27001 ایڈیشن: 2012، ص: 68-167)

شبلی نعمانی کی اس تحریر میں تبصرہ نگاری کے اصول وضوابط کے اہم نکات ہیں:

ریویو دراصل کتاب کا معاوضہ ہوتا ہے، ریویو لکھنا قابل لوگوں کا کام ہے یعنی تبصرہ نگار کو موضوع پر مکمل دسترس ہو تبھی وہ تبصرہ لکھنے کا اہل ہوگا۔ مصنف اگر اپنے کسی دوست واحباب سے تبصرہ لکھوائے تو یہ اس کی پست فطرت کی علامت ہے۔

سرسید احمد خاں کے رفیقوں میں تبصرہ نگاری کے فن پر بحث الطاف حسین حالی نے بھی کی۔ اپنے معاصرین میں تبصرہ نگاری کے فن پر سب سے طویل تحریر (اقتباس کی صورت میں) انھیں کی ہے۔ الطاف حسین حالی نے علامہ شبلی نعمانی کی کتاب 'سیرت النعمان' پر تبصرہ لکھا۔ یہ ریویو 1892 کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا۔ سرسید احمد خاں کی طرح الطاف حسین حالی نے بھی تبصرہ میں تصنیف پر رائے دیتے ہوئے ہی ریویو نویسی کے اصول وضوابط پر روشنی ڈالی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

''اگرچہ اس کتاب پر ریویو لکھنا ایک محدث، فقیہ، مورخ اور ممارس فن رجال کا کام ہے اور میں ان چاروں صفتوں سے مبرا ہوں، لیکن ممکن ہے کہ مثلاً ایک شخص جو ریل کی حقیقت سے واقف نہ ہو، مگر اس میں بیٹھ کر سفر کر چکا ہو، وہ لوگوں کے سامنے جواب تک ریل میں سوار نہیں ہوئے محض آسائش یا تکلیف کی کیفیت جو اس ریل کے سفر میں گزری ہو بیان کرے۔ ریویو لکھنے میں بشرطیکہ وہ دیانت اور سچائی سے لکھا جائے، اکثر اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے کہ کتاب کا وہ حصہ جو ریویو نگار کی رائے کے موافق ہوتا ہے، اس کی داد دی جاتی ہے اور جس قدر اس کی رائے کے خلاف ہوتا ہے وہ مصنف کی لغزش یا خطا پر محمول کیا جاتا ہے۔ اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مثلاً جو کتاب تسنن یا تشیع یا تقلید یا عدم تقلید کی تائید میں لکھی جائے، اس پر مخالف مذہب کا آدمی کبھی عمدہ ریمارک نہ کر سکے۔ جو مضمون ایک اسکول کے فلسفے پر لکھا جائے ہر گز دوسرے اسکول کا پیرو اس کی داد نہ دے سکے۔ میرے نزدیک ریویو نگاری کا منصب صرف اس بات کا دیکھنا ہے کہ مصنف نے وہ فرائض جس کو زمانہ کا مذاق ہر نئی تصنیف میں اس طرح ڈھونڈتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو، کس حد اور کس درجہ تک ادا کیے ہیں پس جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ مصنف کی رائے جزئیات مسائل میں فی نفسہ کیسی ہے، کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے نہ ریویو لکھنے والے کا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کتاب کا عنوان بیان کیا ہے، ترتیب کیسی ہے؟ طریق استدلال مذاق وقت کے موافق ہے یا نہیں؟ اور کتاب کی غایت جو مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہیے یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے وہ اس سے حاصل ہوسکتی ہے یا نہیں؟۔ میں اس ریویو میں صرف انھیں باتوں سے بحث کروں گا اور ہرگز ریویو نگاری کی حد سے متجاوز نہ ہوں گا۔''

(کلیات نثر حالی، (جلد دوم) مرتبہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور، نومبر 1968، ص 12-211)

حالی کے پیش نظر ریویو کا طریقہ کچھ اس طرح ہونا چاہیے:

مبصر کو فن پارے کے مختلف اجزا پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ (1) عنوان بیان، (2) تصنیف کی ترتیب (3) طریق استدلال (4) تصنیف کی غرض وغایت، مبصر کو غیر جانبداری سے فن پارے پر رائے دینی چاہیے، مبصر کو دیانت دار اور سچائی کا پیرو کار ہونا چاہیے۔ تبصرہ نگار کو مصنف کے نقطہ نظر یا اس کی رائے پر زور نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ کام قارئین کا ہے نہ تبصرہ نگار کا، تبصرہ نگار کو محدث، فقیہ، مؤرخ اور ممارس فن رجال ہونا چاہیے۔ یعنی مختلف علوم پر اس کو عبور ہونا چاہیے۔

سرسید تحریک کے بعد اگر کسی نے اردو میں تبصرہ نگاری کے فن پر بحث کی ہے تو وہ ہیں ابوالکلام آزاد۔ انھوں نے سنہ 1903 میں کلکتہ سے ماہوار رسالہ 'لسان الصدق' جاری کیا۔ جس میں انھوں نے اس رسالے کے مقاصد سے عوام کو باخبر کیا۔ اس رسالہ کے سرورق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابو الکلام آزاد نے ''لسان الصدق'' میں عام علمی، اخلاقی، تاریخی، سائنٹفک مضامین شائع کرنے کے علاوہ اس رسالے میں چار اہم مقاصد کو بیان کیا ہے، جن کے تحت رسالے میں تحریریں شائع ہوں گی۔ ان چاروں مقاصد میں سے تیسرا مقصد جس کو 'تنقید' کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد تھا کہ اس رسالے میں ملک کی معروف کتابوں اور اخباروں پر ریویو شائع ہوں گے۔ 'لسان الصدق' کا پہلا شمارہ نومبر 1903 کو جاری ہوا۔ اس شمارے میں ابوالکلام آزاد نے 'لسان الصدق' کے مقاصد کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس میں 'تنقید' کے عنوان سے تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنے پر زور دیا گیا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

''تیسرا مقصد:

تنقید: انگریزی میں کسی کتاب پر 'ریویو' کرنا یہ مفہوم رکھتا ہے، کہ اس کتاب کے حسن و قبح پر بحث کی جائے، اور ریویو نویس اپنی رائے ظاہر کردے، لیکن اردو میں ہمیشہ ریویو کا ترجمہ 'تقریظ' کیا گیا ہے، جس سے ریویو کا اصلی مفہوم ہی مفقود ہو گیا، اس لیے تقریظ تو عام طور پر کسی کتاب کے مدح وتحسین کرنے کا مفہوم رکھتی ہے، برخلاف ریویو کے کہ اس کا مفہوم صرف اس کے حسن پر بحث کرنی نہیں ہے بلکہ اس کے قبح پر بھی نکتہ چینی کرنی ہے۔ اکثر کتابوں کے آخر میں بعض ہم عصر افاضل کی تقریظیں نظر آتی ہیں جنھیں مدح وتحسین سے دو تین صفحہ کالے کرنے سوا کرٹسزم کے اصول سے ذرا بھی کام نہیں لیا جاتا۔ تقریظ کا صرف مدح وتحسین کا مفہوم رکھنا یہاں تک مسلم ہو گیا ہے کہ اگر کسی تقریظ میں کتاب پر کوئی ذرا سا اعتراض کیا ہو یا کتاب کی کسی قدر خرابی ظاہر کی ہو تو وہ تقریظ کے دائرے سے باہر سمجھ کر اس قابل نہیں سمجھی جاتی، کہ کتاب کے ساتھ شائع کی جائے۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے جب اپنے ابتدائی زمانے میں آئین اکبری کی تصحیح کی۔ اور اسے طبع کیا، تو مرزا اسداللہ خاں غالب مرحوم سے تقریظ کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب یورپ کے جدید آئین کے دلدادہ تھے اور آئین اکبری کو ایک فضول کتاب سمجھتے تھے۔ انھوں نے سرسید کی خاطر تقریظ تو نظم میں لکھ دی لیکن اظہار رائے سے نہ بچ سکے۔ تقریظ کا پہلا شعر یہ ہے۔

مژدہ یاران را کہ این دیرین کتاب
یافت از اقبال سید فتح باب

سرسید احمد خاں مرحوم نے جب اپنے ابتدائی زمانے میں آئین اکبری کی تصحیح کی۔ اور اسے طبع کیا، تو مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم سے تقریظ کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب یورپ کے جدید آئین کے دلدادہ تھے اور آئین اکبری کو ایک فضول کتاب سمجھتے تھے۔ انھوں نے سرسید کی خاطر تقریظ تو نظم میں لکھ دی لیکن اظہار رائے سے نہ بچ سکے۔

اس کے بعد انھوں نے انگریزوں کے آئین اور ایجادات کی تعریف کی ہے۔ اور اس کتاب کی تصحیح میں سرسید نے جو عرق ریزی کی تھی اسے شاعرانہ پہلو سے فضول بتایا ہے اور چند شعر سرسید کی مدح میں لکھ کر تقریظ ختم کردی ہے۔

سرسید نے جب تقریظ دیکھی، تو بہت ناراض ہوئے اور کتاب کے ساتھ شائع نہیں کی۔ اس ناراضی کا اصل سبب یہ تھا کہ سرسید ریویو کے اصلی مفہوم کے عادی نہ تھے، تقریظ میں صرف مدح وتحسین کا ہونا ان کے ذہن نشین تھا۔

’ریویو‘ کا اصلی ترجمہ ہماری زبان میں تنقید سے بہتر نہیں ہوسکتا اور ممالک اسلامیہ میں ریویو کی جگہ یہی لفظ مستعمل ہے۔ ہندوستان کے عام اخبارات میں آج کل جس طریقے سے کتابوں پر بالعموم ریویو کیا جاتا ہے اسے ریویو کی جگہ تقریظ کہنا چاہیے۔ نہ کتاب کی پوری کیفیت ظاہر کی جاتی ہے، اور نہ اس کے حسن وقبح پر بحث ہوتی ہے صرف مصنف اور جائے طبع اور قیمت کی اطلاع دے دینی ریویو نویسی کا فرض سمجھا گیا ہے۔ ایسے ریویو سے علاوہ اس کے کہ ریویو نویسی کا اہم فرض نہیں پورا کیا جاتا۔ سب سے بڑی یہ خرابی پیدا ہوتی ہے کہ کتاب کے نقائص نہ پبلک پر ظاہر ہوتے ہیں، اور نہ مصنف پر، رفتہ رفتہ مصنفین بھی تقریظ کے عادی ہوجاتے ہیں، اور پھر وہ کسی قسم کے اعتراض سننے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

’لسان الصدق‘ کا فرض ہوگا کہ وہ ہر کتاب پر اپنی سچی رائے ظاہر کرے، اور جس طرح کتاب کا روشن پہلو پبلک کے سامنے کردے، اسی طرح اس کے تاریک پہلو کو بھی پیش کردے۔ وہ اس کی بالکل پرواہ نہیں کرے گا، کہ اس کا مصنف کون ہے؟ اور کس پایہ کا ہے؟ وہ تصنیف گو کیسے ہی با اقتدار اور مشہور شخص کی کیوں نہ ہو، یہ اس کی سچی خرابیاں ظاہر کردے گا، کیونکہ یہ لسان الصدق ہے، اور سچائی اس کا دستور العمل ہے۔“

(لسان الصدق، کلکتہ، نومبر 1903 تا مئی 1905 (عکسی اشاعت) ایڈیٹر: مولانا ابوالکلام آزاد، ناشر، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی، پاکستان، اشاعت: 1996، ص:27)

ماہوار ’لسان الصدق‘ کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر آزاد کا اس رسالے میں ’ریویو‘ کا جو مقصد تھا وہ اس سے مکمل طور پر ابھر کر نہیں آرہا تھا۔ آزاد اس سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کے لیے ’لسان الصدق‘ میں ریویو کے لیے مخصوص صفحات ناکافی تھے اسی لیے انھوں نے کلکتہ سے ’ریویو‘ کے عنوان سے ایک ماہنامہ نکالنے کا عزم کیا۔ ’لسان الصدق‘ کے جلد نمبر 3، شمارہ نمبر 1-2 اپریل اور مئی 1905 کے شمارے میں پورے ایک صفحے پر رسالہ ’ریویو‘ کا اشتہار چھپا۔ جس میں انھوں نے ’ریویو‘ کے نصب العین اور مقاصد اجرا کی صراحت کی اور 20 جون 1905 میں رسالے کو نکالنے سے عوام کو باخبر کیا۔ مگر یہ رسالہ کبھی جاری نہ ہوسکا۔ لسان الصدق میں شائع اشتہار کی شکل دیکھیے:

”اردو میں اپنی ڈھنگ کا پہلا رسالہ

ریویو

جس کا مقصد صرف ریویو ہے

یورپ کی زبانوں میں متعدد رسالے ایسے شائع ہوتے ہیں، جن کا مقصد صرف ’ریویو‘ ہوتا ہے، وہ ملک کی قابل قدر تصنیفات پر مفصل تنقید کرتے ہیں۔ مصنفین کو ضروری معلومات سے مدد پہنچاتے ہیں، دوسرے ملکوں سے علمی تعلقات پیدا کرکے علم دوست جماعت کے لیے وہ اسباب مہیا کرتے ہیں، جن سے وہ اپنی علمی ضرورتیں آسانی سے پوری کرسکیں۔ افسوس ہے کہ اردو میں اس وقت تک کوئی رسالہ اس مقصد سے شائع نہیں ہوا، اور یہ اہم کام لٹریری رسالوں کا ضمیمہ بن کر ناقابل اور غیر موزوں حالت میں خراب ہوتا رہا۔ آج لسان الصدق اس کمی کے پورا کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ 20 جون 1905 سے ایک ماہوار رسالہ بالفعل (14) صفحوں کی ضخامت پر بطور ضمیمہ لسان الصدق شائع ہونا شروع ہوگا، جس کا نام اور نام کے ساتھ صرف مقصد ریویو ہے۔

مقاصد: (1) ہندوستان میں جس قدر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں ان پر مفصل ریویو کرنا، اور کوشش کرنا کہ اس کتاب کی مفصل کیفیت، مصنف کی عمدہ تصویر شائع کی جائے۔

(2) ممالک اسلامیہ میں عربی کی جو قابل قدر کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر مفصل ریویو کرنا، اور خریداروں کی فرمائش پر اصلی قیمت پر کتاب منگوا دینا، اور کوشش کرنی کہ جن اردو عربی کتابوں پر ریویو کیا جاتا ہے اس کے متعدد نسخے دفتر میں موجود ہوں۔

(3) ہندوستان میں اس وقت تک کوئی، ایسی ایجنسی نہیں ہے جہاں قلیل منفعت پر مصر، شام، قسطنطنیہ کی نادر الوجود کتابیں شائقین کو دستیاب ہوجائیں اگر ایک دو دوکانیں ہیں بھی تو وہاں زیادہ تر قدیم مذاق کی تصنیفات اور دینیات کی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں اس لیے ریویو کے متعلق ایک ایجنسی قائم کی گئی ہے، جہاں تمام جدید کتابیں اور علوم وفنون جدید کے تراجم تقریباً اصلی قیمت پر شائقین کو مل سکتے ہیں۔

(4) دائرۃ المعارف جیسی قیمتی کتابیں منگوا کر اس ایجنسی کے ذریعے ماہوار قسط کے آسان طریقے پر فروخت ہوں گی۔

نوٹ: قیمت سالانہ مع محصول 3عہ، مگر خریداران لسان الصدق کے لیے صرف 12، درخواستیں دفتر لسان الصدق کے پتے پر کی جائیں۔

(لسان الصدق، کلکتہ، نومبر 1903 تا مئی 1905 (عکسی اشاعت) ایڈیٹر: مولانا ابوالکلام آزاد، ناشر، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی، پاکستان، اشاعت 1996، ص 338)

ابوالکلام آزاد کا یہ منصوبہ بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ مگر انھوں نے جب جولائی 1912 میں رسالہ الہلال جاری کیا۔ اس رسالے کو نکالنے کی ابتدا ہی سے ان کا خیال یہ تھا کہ ’مطبوعات جدیدہ‘ یا انتقادیات کا ایک مستقل عنوان الہلال میں شامل کرنا چاہیے۔ کیونکہ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ لسان الصدق کی طرح الہلال کے قارئین کو بھی نئی کتابوں اور جریدوں سے روشناس کرایا جائے۔ اور اگر ہوسکے تو ان پر جامع مگر مختصر ریویو شائع کیا جائے۔

جنوری یا فروری 1905 میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی ’گلزار نسیم‘ کا نیا ایڈیشن شائع ہوا جس کو چکبست نے مرتب کیا اور اس دیباچے پر تحریر کیا۔ اس کتاب پر عبدالحلیم شرر نے رسالہ ’دلگداز‘ شمارہ 30 جلد 9 مارچ اور اپریل 1905 میں ’گلزار نسیم پر ریویو‘ کے عنوان سے تبصرہ لکھا۔ یہ تبصرہ قسط وار شائع ہوا کیونکہ اس نے مباحثے کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اس تبصرے کی پہلی قسط میں عبدالحلیم شرر تبصرہ پر گفتگو کرتے ہیں:

”افسوس اس بات کا ہے کہ اس کے دوسرے رخ یعنی مثنوی گلزار نسیم کے عیوب کی طرف مسٹر چکبست نے بالکل چشم پوشی کی ہے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اس ایڈیشن مین گلزار نسیم پر ایک منصفانہ (ریویو) کیا جاتا اس لیے کہ جس قدر یہ مثنوی ایک عمدہ (ریویو) کی محتاج تھی اردو کی اور کوئی نظم نہیں۔ مگر افسوس کہ (ریویو) نویسی میں ہمارے یہاں یاتو مروت و دوستی کے جذبات ظاہر کیے جاتے ہیں یا بغض وعناد کے۔ اور اگر معاصرین سے واسطہ نہ ہوتو ہمارے ریویو نگار قوم پرستی کرتے ہیں اور اپنی قوم وگروہ میں ہیرو پیدا کرنے کی ایسی ہوس ہوتی ہے کہ انصاف کو بالکل ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس مرض سے انگلستان کے ریویو نگار بھی پاک نہیں ہیں۔ مگر زمانے کی مساعدت سے مغرب والے اپنی اس ہوس میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور ہم اپنی وقعت اور کم کردیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ وہاں ایک ہی قوم ہے اور سب کے جذبات یکساں ہیں بخلاف اس کے یہاں باہمی اختلاف ہے لہٰذا ایک گروہ کسی شخص کو زبردست ہیرو بنا کے بڑھاتا ہے تو دوسرا گروہ اس کے گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اسی سبب سے ہم کو ریویو لکھنے میں جس قدر

اعتدال اور منصف مزاجی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اہل یورپ کو نہیں۔''

(مباحثہ گلزار نسیم، یعنی چکبست وشرر، مؤلف خلاصۃ الحکما میرزا محمد شفیع شیرازی ثم الکھنوی، باہتمام پنڈت منوہر لال بھاگوبی۔اے سپرنٹنڈنٹ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں طبع ہوا، اشاعت اول: 1913، ص: 58-57)

عبد الحلیم شرر کے نزدیک تبصرہ کے اصول ہیں:
ریویو میں فن پارے کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں سے بھی چشم پوشی نہیں ہونی چاہیے، تبصرہ نگار کو حسن وقبح میں عدل وانصاف سے کام لینا چاہیے۔ تبصرہ مروت ودوستی کے جذبات سے عاری ہونا چاہیے ساتھ ہی بغض وعناد سے بھی پاک ہونے کی ضرورت ہے۔

آل احمد سرور نے اردو تنقید کے مسائل کو خوب بیان کیا ہے۔ انھیں تنقیدی تحریروں میں تبصرے کے تعلق سے چند سطور ہی سامنے آتی ہیں۔

وہ اپنے تنقیدی مضمون تنقید کے مسائل میں تحریر کرتے ہیں:

''گذشتہ تیس سال میں علمی وادبی ذوق کے متعین کرنے میں رسالوں کا رول نہایت شاندار رہا اور تنقید و تحقیق اور تبصرہ تینوں میدانوں میں ان رسالوں نے ایک قابل قدر کام کیا ہے۔ رسالہ 'اردو اور نگار' کی خدمات کو اس سلسلے میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان رسالوں کے ذریعے سے اول تو سیکڑوں گمنام اور غیر معروف شاعروں اور ادیبوں کا تعارف ہوا اور ان کے کلام کے نمونے سامنے آئے ہیں۔ دوسرے جانے پہچانے شعرا کی بہت سی تصانیف جو ابھی تک پردہ خفا میں تھی منظر عام پر آئی ہیں۔ تیسرے ان میں ہر قسم کے تنقیدی مضامین نکلے ہیں جن میں سے بعض نے نہایت قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ ان میں سے کئی رسالوں کے گرد اہل قلم کا ایک حلقہ ہے جس میں جانب داری اور وکالت اور ایک دوسرے کی پیٹھ کھجانے کا بھی مظاہرہ ہے۔ مگر ان کے ذریعے سے نظریاتی اور عملی دونوں قسم کی تنقیدیں بہرحال سامنے آتی ہیں مگر سنجیدہ رسالوں کا بھی ایک خاصا سیلاب ہے لیکن انھوں نے بجائے ذوق سلیم کی اشاعت کے سستی مقبولیت پائی اور سہل الحصول شہرت عطا کی ہے اور اس طرح ذوق کو بلند کرنے کے بجائے اسے پست کیا ہے۔ چونکہ رسالے نکالنے کی سہولتیں پہلے سے زیادہ ہیں اور پڑھنے والوں کا حلقہ بھی بہرحال سست رفتاری سے سہی مگر بڑھ تو رہا ہے اس لیے ان میں تنقید سے تحسین یا تنقیص پر اور تبصرے سے زیادہ مدح یا قدح پر توجہ ہے۔

اس زمانے میں تبصرہ نگاری کے فن پر خاصی ترقی ہوئی ہے۔ رسالہ اردو اور اردو ادب کے تبصرے عام طور پر تبصرے ہیں۔ ان میں صرف چند نام نہیں گنائے جاتے۔ پاکستان میں سویرا، نیا دور، صحیفہ اور فنون نے تبصرہ نگاری کا اچھا معیار قائم کیا ہے۔ نیا دور بنگلور، اور سوغات بنگلور نے بھی اس سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہنری جیمس تو دراصل تبصرے کو تنقید کہنے کو ہی تیار نہیں ہے اور اس کا یہ خیال سالوں کے بیشتر تبصروں اور کتابوں کے بیشتر مقدموں کے متعلق صحیح ہے۔ کیوکہ ان میں ادب سے زیادہ اشتہاریت اور معیار سے زیادہ مدح سرائی ہوتی ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان تبصروں نے ادب کے معیاروں کو بھی متاثر کیا ہے کیونکہ ہر چنگاری کو شعلہ اور ہر ذرے کو آفتاب سمجھنے کی وبا خاصی عام ہوگئی ہے۔ تبصرہ نہ تو وہ کھونٹی ہے جس پر تبصرہ نگار اپنے خیالات کا لبادا لٹکاتا ہے، نہ یہ محض خوبیوں یا خامیوں کی طرف ایک اشارہ ہے۔ اس میں کس نے کہا، کیا کہا اور کیسے کہا، تینوں پہلوؤں کی طرف توجہ ضروری ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اردو میں ابھی تک کوئی رسالہ ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کی طرح صرف اچھے تبصرے پیش کرنے کے لیے نہیں نکل سکا۔ مگر اس معاملے میں تو غالباً ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں یہی رنگ ہے۔

تنقید اور تبصرے کا گہرا تعلق پڑھنے والوں کے ذوق سے ہے۔ اور اس سلسلے میں کچھ تلخ حقیقتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ دور نے تجارتی مقاصد کو خاص طور پر فروغ دیا ہے۔ اور اس لیے خون جگر کو بھی مال تجارت بنانے کا طریقہ بہت عام ہے۔ قومی حکومت سے ہمیں یہ توقع تھی کہ یہ تمام قومی زبانوں کے فروغ پر یکساں توجہ دے گی۔ مگر بعض سیاسی الجھنوں کی وجہ سے ایسا نہ ہوا۔ بہرحال ہم صنعتی دور میں قدم رکھ چکے ہیں اور ایسا ایک بڑا طبقہ موجود ہے جس کے لیے تفریحی مواد کی ضرورت ہے۔ ادب سے مانوس ہونے کی وجہ سے لیکن ادب کے بلند مقام کو نہ سمجھتے ہوئے وہ اس تحریر کی طرف مائل ہوتا ہے جو دراصل ادب نہیں مگر جس کے اوپر ادب کا ایک غلاف ہے یہ شاعر کا کلام نہیں پڑھ سکتا، اس کے مختصر انتخاب پر قناعت کرتا ہے۔ یہ علمی مسائل کو سمجھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا، ہاں ان سے کچھ اوپری واقفیت ضروری سمجھتا ہے یہ اپنا بھرم رکھنے کے لیے جدید ترین دبستانوں اور مکاتب خیال سے بھی اپنی دلچسپی ظاہر کرتا ہے خواہ وہ تجریدی آرٹ ہو یا اسپیس ٹریول یا خلا میں پرواز کے مسائل۔ میں ایسے رسالوں کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں مگر ان کی علم وادب کی ٹھیکیداری پر مجھے اعتراض ہے۔ ان رسالوں نے تنقید کو محض شخصیت کی شعبدے بازی بنا دیا ہے اور فن سے زیادہ فن کار سے شغف کو فیشن۔ پھر فن کار کے یہاں اہم محرکات کی تلاش میں اس نے جو زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنایا ہے، اس کی وجہ سے ادبی معیاروں کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ بقول ہنری جیمس نو دن کے شاہکاروں کی کثرت اور ہم عصری ادب کی حد سے بڑھی ہوئی سطحیت میں گہرا تعلق ہے۔ اس سطحیت میں زبان، حسن کاری کے آداب، خیال کی گہرائی، احساس کی تازگی سب مجروح ہوتے ہیں۔''

(نظر اور نظریے، آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشاعت اول 1973، ص 104 تا 107)

درج بالا اقتباسات سے یہ بات تو صاف طور پر واضح ہوگئی ہے کہ سرور صاحب تبصرہ کو بھی تنقید کے دائرے میں ہی رکھتے ہیں۔ یہ بات بہت حد تک صحیح بھی ہے۔ کیونکہ تنقید اور تبصرہ دونوں ہی فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کا نام ہے۔ نقاد معلم الاخلاق ہوتا ہے یہی کام تبصرہ نگار کا بھی ہے۔ جس طرح نقاد فن پارے پر رائے دے سکتا ہے مبصر کو بھی آزادی رائے ہے۔ تبصرہ نگار فن پارے کو پرکھتا ہے۔ نقاد کے لیے بھی فن پارے کو پرکھنا شرط ہے۔ جس طرح تنقید میں ہیرو پرستی اچھی خیال نہیں کی جاتی تبصرہ نگاری میں بھی اس کی گنجائش نہیں۔ نقاد اور تبصرہ نگار کو مبلغ اور نقیب نہیں ہونا چاہیے۔ نقاد اور مبصر کو یک طرفہ نہیں ہونا چاہیے۔ پہلو کے دونوں رخ کو دیکھنا ہوگا۔ تنقید نگاری اور تبصرہ نگاری کی بڑی خصوصیت فن پارے کی پرکھ ہے۔ تبصروں میں مدح سرائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ورنہ اس کی صورت اشتہار تک محدود ہوکر رہ جائے گی۔ تبصرہ نگار کو فن پارے میں دیکھنا چاہیے کہ کس نے کہا، کیا کہا اور کیسے کہا۔

تبصرہ نگاری کے تعلق سے یہ مختصر تحریریں ہمار سامنے ہیں جن میں مبصر اور اصول تبصرہ نگاری کی مفید معلومات ملتی ہیں ان مختصر تحریروں کے علاوہ بھی اردو تبصرہ کے اصول وضوابط پر بہت سے ناقدین نے روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً کلیم الدین احمد، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، رحم علی الہاشمی، عبادت بریلوی، شمس الرحمٰن فاروقی، عبد السلام خورشید، ظ انصاری، یوسف سرمست، ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر کوثر مظہری وغیرہ نے تبصرے کے فن پر مضامین قلم بند کیے ہیں۔

■

Dr Raheen Haya
Asst. Prof. Mohammad Ali Jauhar University
Rampur. U.P
Email.: raheenhaya786@gmail.

اردو میں سنسکرت ادب کے تراجم

عادل احسان

علوم وفنون کی قدیم میراث ہمارا عظیم سرمایہ ہے جن زبانوں میں قدیم علوم وفنون تصنیف وتالیف کیے گئے آج وہ زبانیں عملی طور پر موجود نہیں یا موجود تو ہیں مگر ان کے سمجھنے والے محدود تعداد میں ہیں۔قدیم علوم ومعارف اور علمی ذخیروں سے استفادے کا ذریعہ ترجمہ ہے۔ ترجمے کے ذریعے بہت سے ایسے علوم وفنون ہم تک پہنچے ہیں جو ترجمے کے بغیر ناپید ہو جاتے۔ہندوستان میں جو زبان قدیم زمانے میں علوم وفنون کی زبان رہی ہے اور جس زبان نے بہت ترقی اور عروج حاصل کی وہ سنسکرت زبان ہے۔سنسکرت زبان میں بہت سی مذہبی علمی اور ادبی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ان کتابوں کے ہر زمانے میں اس وقت کی رائج زبان میں تراجم ہوتے رہے ہیں۔ان کتابوں کی اہمیت افادیت اور وقعت سے انکار ممکن نہیں، سنسکرت زبان میں رامائن،مہابھارت، گیتا،وید،پر ان وغیرہ مشہور ایسی کتابیں ہیں جنھیں ہندو عقائد میں بنیادی مقام حاصل ہے۔سنسکرت ادب میں نظم کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے،نثری نمونے بھی موجود ہیں۔رامائن اور مہابھارت کے قصوں سے ہمارے کان بچپن سے آشنا ہوتے ہیں۔ان قصوں پر مشتمل ٹی وی سیریل بھی بنائے گئے انھیں مقبولیت بھی حاصل رہی۔سنسکرت زبان اور اس کے ادبی نمونوں کے بارے میں سید یحیٰ حسن نقوی لکھتے ہیں:

''سنسکرت زبان انڈو یورپین زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔حضرت عیسیٰ سے تقریباً دو ہزار برس پہلے جب آریہ ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ اس زبان کو ہندوستان لائے۔رگ وید کی بعض مناجاتوں میں اس کے بالکل ابتدائی طرز کے نمونے موجود ہیں۔اس عہد میں ادبی زبان اور بول چال کی زبان میں زیادہ فرق نہیں تھا لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ فرق وسیع تر ہوتا گیا۔ادبی زبان پر مذہبی رنگ چڑھ گیا اور آگے چل کر اس نے کلاسیکی حیثیت اختیار کر لی۔

اسی سنسکرت کو جو ویدوں کی زبان تھی،دیسی لوگ جن پر آریوں نے تسلط قائم کیا تھا،اپنے آقاؤں سے لین دین اور بات چیت میں استعمال کرتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی اثرات نے زبان کے روزمرہ میں تلفظ اور لب ولہجے کا فرق پیدا کر دیا اور جیسے جیسے آریہ ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلے اس میں مقامی اور علاقائی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔حاکم ومحکوم کے میل جول اور باہمی ارتباط نے پراکرت زبانوں کو جنم دیا جو مختلف ارتقائی منزلوں سے گزر کر ماگدھی،پیشاچی اور مہاراشٹری کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔

سنسکرت کے لغوی معنی ہیں 'صیقل کیا ہوا' اور پراکرت کے معنی ہیں 'قدرتی' یا 'فطری' جیسے جیسے سنسکرت کی بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں فرق بڑھتا گیا اس کے قواعد پیچیدہ اور اسلوب نگارش پر تکلف اور مرصع ہوتا گیا۔اس کا استعمال اعلیٰ طبقوں میں محدود ہو گیا اور عوام میں پراکرت زبانیں مقبول ہو گئیں اور آپس میں لین دین اور اظہارِ خیال کا ذریعہ بن گئیں۔''

(ہمارا قدیم سماج:سید یحیٰ حسن نقوی،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی، 1998،ص 77,78)

اب ہم کچھ سنسکرت کی کتب اور ان کے تراجم کے بارے میں گفتگو کریں گے جس سے اردو زبان وادب پر سنسکرت کے اثرات کی وضاحت ہوگی۔رامائن ہندومت کی مشہور ومعروف کتاب ہے سات فصلیں اور چوبیس ہزار اشعار اس کتاب میں شامل ہیں۔اس کتاب میں والمیکی نے رام چندر جی اور سیتا کی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں۔رام چندر کی پیدائش، بچپن، شادی، بنواس،راون کا سیتا جی کو اغوا کر کے لے جانا ان کو دوبارہ حاصل کیا جانا،راون کی شکست وموت اور رام چندر جی کی پھر ایودھیا واپس آنے کے حالات بیان کیے ہیں۔رامائن کے تراجم کئی لوگوں نے کیے ہیں ایک ترجمہ ملک الشعراء دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے کیا ہے۔دوارکا پرشاد افق 1804 میں پیدا ہوئے اور 1913 میں وفات پا گئے۔ان کی رامائن کا پہلا ایڈیشن منشی نول کشور پریس لکھنو میں چھپا۔منشی شنکر دیال فرحت نے بھی رامائن کا ترجمہ مثنوی کے طور پر کیا تھا 1862 میں پہلی بار منشی نول کشور پریس کانپور سے اس کی اشاعت ہوئی۔رامائن کا ایک ترجمہ ہریانہ کے ضلع حصار کے رہنے والے سردار جسونت سنگھ نے ایک ناٹک کے طور پر کیا ہے۔جس میں بڑے خوبصورت مکالمے ہیں۔رامائن کا ایک ترجمہ شری صاحب رام کا بھی ملتا ہے۔اس رامائن کی تیسری اشاعت 1941 میں ہوئی تھی۔

اس اہم کتاب کے یہ چار تراجم اس کی عظمت اور مقبولیت کی دلیل ہے وہیں اردو زبان کی آفاقیت اور وسعت پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ہندوؤں کی مقدس مذہبی کتابوں میں ایک کا نام مہابھارت ہے۔مہابھارت میں کوروؤں اور پانڈوؤں کی زندگی اور کارناموں کی داستان ہے۔کروکشتر کے میدان میں کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان جو جنگ لڑی گئی اسے ہی مہا بھارت کہتے ہیں۔مہابھارت میں دونوں طرف سے سخت معرکہ ہوا اور بہت کشت خون ہوا،پانڈوؤں کی فتح ہوئی۔اسی کہانی کو مہابھارت میں بیان کیا گیا ہے لیکن مہا بھارت ایک رزمیہ نظم ہی نہیں بلکہ اس کے اندر تعلیم وتربیت کے لیے مذہب،اخلاق،فلسفہ اور بہت سی اس طرح کی چیزیں بھی موجود ہیں۔مہابھارت کے بہت سے تراجم ہیں،سکھ دیال سنگھ نے مہابھارت کے دوسرے اور تیسرے حصہ کا ترجمہ ڈراما کی شکل میں کیا ہے جو مفید عام پریس آگرہ سے 1893 میں شائع ہوا۔پنڈت سورج بھان بھارگو کا اردو ترجمہ منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔دین دیال دنیش نے مہابھارت کا اردو میں نثری ترجمہ کیا ہے جس کی اشاعت دیہاتی پستک بھنڈار دہلی سے ہوئی۔منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے ایک اور منظوم ترجمے کی اشاعت 1905 میں ہوئی جس کے مصنف طوطا رام شیام ہے۔

سنسکرت زبان میں شاہکار نظم جز شری مد بھاگوت گیتا ہے جو اٹھارہ ابواب سات سو اشلوکوں پر مشتمل ہے۔اس کتاب کو مہارشی وید ویاس نے پانچ ہزار سال قبل نظم کیا تھا جب ارجن نے اپنے ہتھیار ڈال دیے تو شری کرشن جی نے عمل حیات اور کائنات کے فلسفے سے ارجن کو واقف

کرایا۔ یہ کتاب شری کرشن جی اور ارجن کے سوال وجواب کی شکل میں ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی صحائف میں یہ کتاب اپنی تعلیمات میں لافانی اور لاثانی ہے۔اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ اکثرمحفلوں میں اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے لوگ بے تکلف گیتا کے اشلوک پڑھ دیتے ہیں۔اس کی عظمت اور وقعت کی وجہ سے بکثرت تراجم ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب علی اردو زبان میں گیتا کے تراجم اور گیتا کی اہمیت افادیت اورعظمت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گیتا ایک عظیم تصنیف ہے اور اس کی عظمت واہمیت کو غالبًا ہندوستان نے سب سے زیادہ تسلیم کیا ہے۔چنانچہ ہندوستانی زبانوں نے گیتا کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اوراسی سے اپنے دامن کو مالا مال کیا ہے۔اس عظیم تصنیف کے سب سے زیادہ تراجم ہندی میں ملتے ہیں اس کے بعد جس زبان نے اپنے دامن کو کشادہ کیا وہ اردو ہے۔ڈاکٹر نثاراحمد فاروقی کے مطابق اردو زبان میں صرف مسلمانوں نے گیتا کے 32 یا 33 ترجمے کیے ہیں اورسلطان احمد صدیقی کواردو کے پچاس ترجموں کا سراغ لگا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ سے معلوم ہوا ہے کہ اردو میں گیتا کے منظوم ترجموں کی تعداد 31 اور منثور ترجموں کی تعداد 67 ہے۔اس طرح اردو میں منظوم اور منثور ترجموں کی کل تعداد 98 ہے۔

بھگوت گیتا کا سب سے قدیم اردوترجمہ نثر میں ملتا ہے جسے منشی کنہیال عرف الکھ دھاری نے 'گیان پرکاش' کے عنوان 1863 میں گیانی پریس اکبرآباد(آگرہ) سے شائع کیا ہے۔اسی طرح منشی شیام سندرلال نے 1884 میں ایک کتاب 'بھگوت گیتا مع اردوترجمہ' کے عنوان سے شائع کی۔اس کتاب میں پہلے سنسکرت میں اشلوک درج ہیں پھر ترجمے کے ساتھ متن اور اس کی شرح اردو میں بیان کی گئی ہے۔ 'بھگوت گیتا' ہی کے عنوان سے منشی دہلوی پرشاد نے گیتا کا آسان اردو ترجمہ کیا جو 1913 میں رام پریس میرٹھ سے چھپا۔اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ترجمے سے پہلے ہر باب کے مضمون کا خلاصہ مترجم نے رقم کیا ہے۔''

(ہندوستانی اساطیر اور فکر وفلسفہ کا اثر اردو زبان و ادب پر،مرتب :پروفیسر قمر رئیس،اردو اکادمی، دہلی، 2018 ص، 273,274)

گیتا کی شہرت اور عظمت کی وجہ سے اس کے کثیر تراجم ملتے ہیں مختلف ناموں سے گیتا کے تراجم ہوئے ہیں منشی جگن ناتھ پرساد عارف نے سرچشمہ عرفان، روشن لال ایم اے نے اکسیر روح، منشی بشیشور پرساد منور لکھنوی نے نسیم عرفان، پنڈت یوگی راج نظر سوہانوی نے کلام ربانی، محمد اجمل خاں نے بھاگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی، قاضی محمد نیر صدیقی نے اسرار معرفت کے نام سے اس کتاب کے تراجم کیے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے مضمون نسیم عرفان بھاگوت گیتا کے ایک ترجمے میں اس کتاب کے اردو منظوم منثور تراجم کی فہرست پیش کی ہے جن کی تعداد تئیس ہے۔ڈاکٹر انصار احمد نے گیتا کے اردو تراجم اور شیو برت لعل کے موضوع پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں جدید گیتا کے بارہ تراجم کا ذکر کیا ہے۔اس قدر کثرت سے ترجمے اس بات کے غماز ہیں کہ یہ کتاب نہایت مقبول بھی ہے اور قدر ومنزلت کی حامل بھی ہے۔ان تراجم کے ذریعے گیتا کی تعلیمات اوراس کا فلسفہ اردوداں طبقے تک پہنچا ہے۔

قدیم زمانے میں مذہبی کتابوں کے علاوہ سنسکرت زبان میں قصے وکہانیاں لکھی گئیں جن کی مقبولیت قدیم زمانے سے آج بھی قائم ہے۔ ہندوستان میں 'پنچ تنتر' کے نام سے وشنو شرما نے ایک کتاب تیار کی۔وشنو شرما نے یہ ادبی سرمایہ سنسکرت زبان میں پیش کیا تھا۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے حقیقت میں شہزادوں کو اخلاقی تعلیم دینے کے لیے درسی کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔اس کتاب کی توقع سے بڑھ کر مقبولیت حاصل ہوئی اس مقبولیت کی وجہ اس کتاب کی عظیم مقصدیت اور ناصحانہ انداز بیان ہے۔اس کتاب کی مقبولیت وشہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی تقریباً پچاس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔اردو میں عربی زبان کی معروف کتاب سے بھی اس کتاب کے تراجم ہوئے اور فارسی زبان سے بھی اسے اردو میں منتقل کیا گیا۔ پنچ تنتر کا یہ قصہ بڑا مشہور ہے عربی زبان میں عبداللہ ابن مقفع نے پنچ تنتر کا نہایت فصیح و بلیغ ترجمہ کیا تھا۔ فارسی میں یہ کتاب انوار سہیلی کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے یہ اردو میں منتقل ہوئی،عربی زبان سے اس کا ترجمہ مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی نے کیا۔ 'کلیلہ ودمنہ' کا یہ ترجمہ 2014 میں منظر عام پر آیا جبکہ فارسی کتاب انوار سہیلی کا ترجمہ بھی اردو زبان میں کیا گیا ہے۔اردو میں اس کتاب کے مترجمین میں فقیر محمد گویا، شیخ حفیظ الدین اطہر پرویز، راز اکبرآبادی، بشاش بھوپالی، ڈاکٹر سید علی، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری شامل ہیں۔

سنسکرت کے کلاسیکی ادب میں کالی داس کو بڑی اہمیت حاصل ہے اسے کوی کل گرو (استاد الشعراء) کہا جاتا ہے دلچسپ اور پروقار انداز میں بہترین موضوعات پر کالی داس نے روشنی ڈالی ہے۔اس کی تصانیف کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کالی داس صاحبِ علم و فضل تھا۔وہ زندگی کے جذبات سے واقف غور وفکر کا ماہر اور مناظر قدرت کا عاشق تھا۔کالی داس کی تصانیف کو کلاسیکی سنسکرت میں اہم مقام حاصل ہے کالی داس کی تخلیقات کی تعداد سات ہے۔میگھ دوت، رتو سنگھار، رگھوونش، کمار سمبھو یہ چار اس کی شاعرانہ تصانیف ہیں۔کالی داس نے تین ڈرامے بھی لکھے ان ڈراموں پر مشتمل کتابوں کے نام مال وکاگن متر، وکرم اروسی، ابھگیان شاکنتلم۔کالی داس کی کتاب میگھ دوت کا ترجمہ رانا پرتاپ سنگھ رانا گنوری نے کیا ہے جس کی اشاعت پاپولر پبلیکیشن بازار چتلی قبر دہلی سے 1970 میں ہوئی ہے۔میگھ دوت کا یہ ترجمہ زبان وبیان کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔اردو میں میگھ دوت کے کئی منظوم ترجمے موجود ہیں۔سلام مچھلی شہری نے میگھ دوت کا منظوم ترجمہ کیا ہے ان کے علاوہ پربھو دیال عاشق اور پیارے لال شاکر جگیت سرن داس وغیرہ نے بھی میگھ دوت کا ترجمہ کیا۔رانا گنوری نے میگھ دوت کا ترجمہ بڑی محنت سے اور ترجمہ نگاری کے اصول وضوابط کا خیال رکھتے ہوئے کیا ہے۔شمیم کرہانی اس ترجمے کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مہاکوی کالی داس کے جادو نگار قلم کی طراوشوں میں ایک رنگین وپرنور طراوش 'میگھ دوت' بھی ہے جو حقیقت نگاری کا حسین ترین نمونہ ہی نہیں بلکہ رسم ورواج، ماحول و زمانہ، شادابی وخوشحالی اور جغرافیائی شناخت کا بہترین آئینہ بھی ہے۔تمام تشبیہات و استعارات عظیم دیوتاؤں کے جمال وجلال کی نسبت سے پاکیزگی ورفعت پر مبنی ہیں۔غم فراق کی ایسی دلگداز مصوری کی گئی ہے کہ مہاکوی کی فطرت شناسی اور حقائق نگاری کی داد دینی پڑتی ہے۔ سنسکرت کی ایسی عظیم نظم کا اردو ترجمہ وہ بھی نظم میں کوئی آسان کام نہیں تھا۔رانا گنوری صاحب خراجِ تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑے خلوص اور سچائی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔''

(میگھ دوت: کالی داس، مترجم، داکٹر رانا پرتاپ سنگھ رانا گنوری، پاپولر پبلی کیشن دہلی، 1970، ص 10)

منشی پیارے لال صاحب شاکر ایڈیٹر رسالہ العصر لکھنؤ نے بھی رتو سنگھار کا اردو منظوم ترجمہ کیا ہے اوراس کا نام 'اکسیر سخن' رکھا ہے۔ یہ کتاب مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے 1913 میں منظر عام پر آئی۔اس ترجمے سے پہلے ذکر کی گئی کتاب میگھ دوت میں حسن وعشق وصال وجدائی کے جذبات وافر مقدار میں موجود ہیں۔مناظر فطرت کی رنگینیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔کالی داس کو اسلوب کی ندرت تشبیہات کا استعمال اور استعارات کو برتنے کا سلیقہ بہت اچھی طرح معلوم ہے۔شاکر صاحب نے رتو سنگھار کا اردو زبان میں اکسیر سخن کے نام سے ترجمہ کیا ہے یہ اردو میں پہلا ترجمہ ہے۔رتو سنگھار کالی داس کی چار مشہور نظم کی کتابوں میں سے ایک ہے۔اس کتاب میں شاعر نے

نہایت دلکش اسلوب عمدہ خیالات اور بہترین احساسات وجذبات کے پیرائے میں چھ موسموں کے مناظران کے تغیرات اور ان موسموں میں پیدا ہونے والے افکار اور جذبات کو بیان کیا ہے۔اردواور فارسی میں تین ہی قسم کے موسم موجود ہیں۔اس ترجمے سے پہلے عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالہ 'دلگداز' میں دو تین رتوں کا ترجمہ نثر میں کیا تھا۔شاکر نے سنسکرت کے پیچیدہ اور عمیق جذبات کو بڑی سلاست کے ساتھ اس طرح نظم کیا ہے کہ یہ ترجمہ آمد کا لطف دیتا ہے۔کالی داس کی چار منظوم کتابوں میں سے دو کے مضامین اور ترجمہ پر روشنی ڈالی گئی۔اب تین ڈراموں میں سے ایک ڈراما ''وکرم اروشیم'' کے ترجمہ ''وکرم اروسی'' کا ذکر کیا جا رہا ہے۔یہ ترجمہ مولوی عزیز مرزا نے مختلف زبانوں کے تراجم کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔وکرم اروسی کا قصہ بہت قدیم ہے اس میں پروراوس اور اروسی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔وکرم اروسی کالی داس کے ان ناٹکوں میں سے ہے جو کالی داس کی فکری بلند پروازی کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں۔بیان کی شگفتگی جذبات کی رقت طرز ادا کی شائستگی میں اپنی مثال آپ ہے۔مولوی عزیز مرزا نے یہ ترجمہ اصل کتاب کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف تراجم کی مدد سے کیا ہے۔

کالی داس کی دیگر کتابوں کے بھی تراجم منظر عام پر آئے ہیں۔مال ویاگنی مترا جو ایک ڈراما ہے منور لکھنوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ 1973 میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے اس کی اشاعت ہوئی ہے۔اسی کتاب کا ایک ترجمہ عرفان صدیقی نے بھی کیا ہے جو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔کالی داس کی کتاب 'کمار سمبھو' کا ترجمہ بھی منور لکھنوی نے کیا ہے۔کمار سمبھو کا ایک ترجمہ منشی وشویشور پرشاد نے 1945 میں کیا ہے۔کالی داس کی یہ تمام کتابیں بہت شہرت رکھتی ہیں اور ان کے تراجم بھی بڑے اہم ہیں۔کالی داس کی ایک کتاب 'ابھگیان شکنتلم' ہے جسے شکنتلا کے نام سے شہرت حاصل ہے۔یہ کالی داس کی شہرہ آفاق کتاب ہے دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کتاب کے بے شمار تراجم ہوئے ہیں صرف اردو میں ہی اس کتاب کے نو ترجمے موجود ہیں۔ان تراجم کے مترجمین میں اختر حسین رائے پوری راجا شیو پرشاد، پریم پال اشک،منور لکھنوی،مرزا کاظم علی جوان،ساغر نظامی،قدسیہ زیدی،اقبال ورما سحر شامل ہیں۔بھرترہری بھی سنسکرت کے ایک مشہور شاعر تھے۔ان کی شاعری آج بھی مشہور ہے بھرترہری کے ششکوں کا ترجمہ امتیاز الدین خاں رگویندر راؤ جذبے مے کرشن چودھری نے کیا ہے۔بھرترہری کے تینوں ششکوں کے منتخب کلام کا عبدالستار ردلوی نے بھرترہری اقبال کا ایک ممدوح عظیم سنسکرت شاعر اور اس کے منتخب کلام کا اردو ترجمہ نام سے ترجمہ کیا جو دائرہ الادب ممبئی سے 2004 میں شائع ہوا۔

سنسکرت زبان کا ایک شہرہ آفاق ناٹک مدرا راکھشش ہے جس کے خالق وشاکھادت تھے منور لکھنوی نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے اس کتاب کی اشاعت ہوئی ہے۔وشاکھادت کی اس مشہور ومعروف تصنیف کا پہلا ترجمہ ہے۔ہندی زبان میں اس کے کئی تراجم موجود تھے۔مترجم نے اردو ترجمے کو اس طرح ترجمے کی شکل میں پیش کیا ہے کہ کتاب زیادہ اصل سے قریب رہے۔

'رام چرت مانس' تلسی داس کی مشہور ومعروف کتاب ہے۔پروفیسر نورالحسن نقوی نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے، مجلس اشاعت ادب دہلی سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔شمالی ہندوستان میں تلسی داس کی اس کتاب کو ویدوں کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے۔اس کتاب کا مرکزی کردار رام چرت مانس کی مقبولیت کا راز کیا ہے۔ اس کو نورالحسن نقوی کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

''رام چرت مانس کی تخلیق اس عہد میں ہوئی جب عوام وخواص کی زبان پر بھکتی اور پریم کے گیت تھے۔صوفیا کے ملفوظات ہندو مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔یہ اکبر کا دور تھا۔اس کے ایما پر رامائن اور مہابھارت کے فارسی ترجمے بھی ہوئے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ ادھیاتم رامائن کے خطوط پر رام چرت مانس کی تصنیف ہوئی، لیکن وید اور پران کے اثرات، ناتھ یوگیوں کی روایات اور فلسفۂ وحدت الوجود کا پرتو بھی اس میں نظر آتا ہے۔''

(رام چرت مانس: تلسی داس، نورالحسن نقوی، مجلس اشاعت ادب، دہلی، ص8)

اپنی عمدہ تعلیمات بہترین قصہ اور بول چال سے قریب زبان استعمال کرنے کی وجہ سے اس کتاب کو عوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔تلسی داس نے رام چرت مانس میں تشبیہات واستعارات کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ وہ عوام کی فہم سے بالاتر نہیں ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اردو میں کئی ترجمے اس کتاب کے ہوئے ہیں۔یہ ترجمہ نورالحسن نقوی نے کیا ہے جو اصل کتاب کی طرح ہی سلیس رواں اور آسان ہے۔

اردو زبان میں بہت سی مشہور ومعروف قصہ کہانیوں کی کتابیں ایسی بھی ہیں جو یا تو سنسکرت سے ماخوذ ہیں یا سنسکرت وہندی سے متاثر ہوئی ہیں ایسے ہی قصوں میں بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی اور رانی کیتکی کی کہانی وغیرہ شامل ہیں۔میں نے اپنے اس مقالے میں مہابھارت، رامائن، گیتا، پنچ تنتر، کالی داس کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے اور اردو کے تراجم پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ بھرترہری، مدرا راکھشش، رام چرت مانس، کا بھی تعارف پیش کرتے ہوئے اس کے اردو تراجم کا جائزہ لیا ہے۔ویدک ادب کے بھی اردو زبان میں تراجم ہوئے ہیں۔رگ وید کے کئی تراجم منظر عام پر آئے ہیں۔سام وید اور اتھر وید کے بھی اردو میں تراجم کیے گئے ہیں۔کنہیا لال الکھ وہاری نے چار وید کے نام سے اردو زبان میں چاروں ویدوں کا خلاصہ لکھا ہے۔اپنشد بھی ویدک ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے بھی کئی تراجم اردو زبان میں ہوئے ہیں۔پرانوں کے بھی تراجم ہوئے جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں گزرا۔کلاسیکی ادب میں کالی داس کی کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔ان کے تراجم پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے علاوہ سنسکرت میں لکھی جانے والی دیگر علوم وفنون کی کتابوں کے بھی اردو میں تراجم کیے گئے ہیں۔علم الحساب کی کتاب جس کا نام 'لیلاوتی' ہے۔جسے بھاسکر آچاریہ نے تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کو اردو میں دیوی چند نے منتقل کیا ہے۔سنسکرت شعریات پر مشتمل کتاب دھونیالوگ آنندوردھن کی مشہور تالیف ہے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے اس کتاب کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔عنبر بہرائچی اس کتاب کے مترجم ہیں مندرجہ بالا باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سنسکرت میں لکھی گئی تمام اہم کتابوں کے اردو زبان میں تراجم ہوئے ہیں لیکن سنسکرت کی ان کتابوں کے اردو میں منتقل کرنے والے مترجمین نا جانے کیوں اس بات سے قاصر نظر آتے ہیں کہ وہ بلاواسطہ سنسکرت سے اردو زبان میں کتاب کو منتقل کرتے اکثر مترجمین ہندی، انگریزی، فارسی، عربی اور اردو کے تراجم سے مدد لیتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ بات ان کتابوں کے لیے تو ٹھیک ہے جو اب دنیا سے نایاب ہیں۔یا ان کا حصول ممکن نہ تھا لیکن وید، گیتا، مہابھارت، رامائن جن کے نسخے کثیر تعداد میں دنیا بھر میں موجود ہیں۔ان کتابوں کا بلا واسطہ اردو میں اگر ترجمہ کیا جاتا تو اور بہتر اور مفید تراجم سامنے آتے پھر بھی سنسکرت زبان کے جتنے بھی قیمتی جواہر پارے اردو میں موجود ہیں۔وہ قومی یکجہتی بے تعصبی وطن اور زبان سے محبت کا بین ثبوت ہیں اور اردو زبان کی بین الاقوامیت وسعت اور عظمت ومقبولیت کی دلیل ہیں۔

■

Dr. Adil Ehsan
BN Degree College
Near Bus Stand
Anjhi Railway Station Road
Shahabad Hardoi- 241124 (UP)

علی گڑھ تحریک، انجمن پنجاب اور جمالیات

دانش کمال

علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید احمد خان تھے، جبکہ ان کے رفقا میں مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک اور آغا خان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس تحریک نے مسلمانوں کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اگرچہ سر سید سے بہت سارے امور میں اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اگر اس تحریک کے اثرات کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تحریک نے تعلیم کے میدان میں تو جو کارنامے ادا کیے سو کیے، ادبی سطح پر بھی اس تحریک نے بہت فعال کردار ادا کیا اور اردو ادب کے ایک کافی طویل دورانیے کو متاثر کیا۔ اسی تحریک کی ابتدائی شکل ہمیں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی صورت میں نظر آتی ہے جس کا بنیادی مقصد انگریزی زبان سے اعلیٰ علمی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ تھا۔ یہ تراجم اس لیے بھی ضروری تھے کہ ہندوستانی ماحول میں اکثریت انگریزی زبان سے ناواقف تھی، اور بہت حد تک سر سید اور ان کے حامیوں کا یہ خیال تھا کہ موجودہ حالات میں انگریزی زبان اور اس سے متعلقہ علوم ہی ترقی کا واحد زینہ ہیں۔ چنانچہ اس سوسائٹی نے بہت ساری کتابیں شائع کیں۔ مولوی عبدالحق نے تو سوسائٹی کی جانب سے شائع شدہ کتابوں کی تعداد 40 بتائی ہے لیکن اصغر عباس کی تحقیق کے مطابق سائنٹفک سوسائٹی سے کل 15 کتابیں ہی اشاعت پزیر ہوئی تھیں بہر حال اس وقت اور ماحول میں جبکہ تراجم کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا اتنی کتابوں کا ترجمہ ہوکر شائع ہوجانا اپنے آپ میں اہمیت کا حامل ہے۔ اسی تحریک کے چلتے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں محمڈن اے او کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا۔

اس تحریک کے بنیادی مقاصد تو نئے علوم کا حصول، مذہب کی عقلی تفہیم، سماجی اصلاح اور زبان و ادب کی ترویج و ترقی تھے۔ لیکن اس تحریک نے اردو ادب کو جس انداز سے متاثر کیا، اس کے اثرات بہت دیر پا ثابت ہوئے۔ چنانچہ اسی تحریک کے زیر اثر حالی نے سوانحی سلسلہ شروع کیا اور یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید جیسی جاوداں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ شبلی نے ہیروز آف اسلام کے منصوبے کے تحت الفاروق، المامون، النعمان اور الغزالی جیسی کتابوں کی تصنیف کا بیڑا اٹھایا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نویسی کی طرف قدم بڑھائے اور اردو میں ناول نگاری کا پہلا خاکہ پیش کیا۔ اس طرح اس تحریک نے اردو میں کئی ایک اہم اصناف کی جانب پیش رفت کو تیز کردیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اردو نثر و نظم کی تہذیب میں بھی اس تحریک نے نمایاں کردار ادا کیا۔ سر سید اپنی ان کوششوں کے بارے میں خود کہتے ہیں:

''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیِ عبارت سے جو تشبیہات اور استعاراتِ خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت، صِرف لفظوں ہی میں رہتی ہے اور دِل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگیِ عبارت پر توجہ کی۔ اِس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو، وہ صرف مضمون کی اَدا میں ہو۔ جو اَپنے دِل میں ہو، وہی دوسرے کے دِل میں پڑے، تاکہ دِل سے نکلے اور دِل میں بیٹھے۔'' (ہماری خدمات)

اگرچہ اردو ادب میں سادہ زبان کے استعمال کا آغاز مرزا غالب کے خطوط سے ہی ہوچکا تھا، مقفی اور مسجع نثر کی روایت ختم ہونے کے آثار نظر آنا شروع ہوگئے تھے لیکن اس نظریے کو فروغ دینے اور اسے پوری طرح رائج کرنے میں سر سید کی کوششوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سر سید اور ان کے رفقا کے لیے سادہ نثر کو اختیار کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ انھوں نے جو بھی تخلیقات پیش کیں وہ ادب برائے ادب نہیں بلکہ افادی مقاصد کے تحت لکھی گئی تھیں۔ اس افادی مقصد کے تحت ان تخلیقات کے مخاطب ادبی طبقات تو کم کم ہی تھے، ان کا مخاطبہ عوام سے زیادہ تھا اس لیے ضروری بھی تھا کہ ایسا سادہ اور ہلکا پھلکا اسلوب

اپنایا جائے جسے سمجھنے میں عوام کو کوئی دشواری نہ ہو۔

اس کے بعد انجمن پنجاب کی تشکیل ہوئی اور جدید اردو نظم کی بنیاد اسی کے مناظموں سے پڑی۔ انجمن پنجاب کا خصوصی تعلق علی گڑھ تحریک سے اس لیے بھی جڑتا ہے کیونکہ سرسید کے سب سے قریبی رفقا میں خواجہ الطاف حسین حالی کا بھی شمار ہوتا ہے جو انجمن پنجاب کے زیر انتظام ان مناظموں کے انعقاد میں پیش پیش تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی انجمن پنجاب کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''اردو شاعری اس منزل سے اس وقت روشناس ہوئی جب 57 کے انقلاب کے بعد زندگی میں نئے حالات پیدا ہوئے اور ان نئے حالات کے نتیجے میں جب نیا احساس بیدار ہوا، نئے شعور نے آنکھ کھولی اور نئے معاملات و مسائل وجود میں آئے۔ ایک نئی دنیا پیدا ہوئی، ایک نیا نظام قائم ہوا، ایک نئے معاشرے کی بنیاد پڑی اور ایک نئی تہذیب کی جھلکیاں نظر آنے لگیں، یہ تبدیلی ہماری زندگی کی بہت اہم تبدیلی تھی۔ چنانچہ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں ایک نیا انداز پیدا کیا۔ شاعری بھی اس نئے انداز سے بچ نہ سکی۔ اس کے موضوعات بدلے اور ان موضوعات کو پیش کرنے کے لیے نئے سانچے بنائے گئے۔ اس تبدیلی کی جھلک سب سے پہلے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ان مشاعروں میں نظر آتی ہے جنھیں لاہور میں اسی مقصد سے ترتیب دیا گیا تھا اور جن میں حالی اور آزاد پیش پیش تھے۔''

(عبادت بریلوی، جدید شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2005، ص: 11,12)

انجمن پنجاب کے ان مناظموں میں موضوعاتی نظموں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور ان میں خاص طور پر اس بات پر توجہ مرکوز رکھی گئی کہ نیچرل شاعری کو فروغ دیا جائے اور فطرت، مظاہر فطرت وغیرہ پر خصوصی طور پر نظمیں لکھی جائیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

''انجمن پنجاب کے مشاعرے آزاد یا حالی کے کہنے پر شروع نہ ہوئے تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں مشاعرے کے محرک نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر نے مدارس کی درسی کتب کے لیے فطرت کی شاعری پر مشتمل نظمیں لکھوا کر نصاب میں شامل کرنے کے لیے ہالرائیڈ کو خصوصی ہدایات بھیجی تھیں اور ہالرائیڈ نے منصوبہ بندی کر کے آزاد اور حالی کی معاونت حاصل کی تھی۔''

(ڈاکٹر تبسم کاشمیری، آزاد انجمن پنجاب اور جدیدیت، مشمولہ آزاد صدی مقالات، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، 2010، ص: 88)

کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں حالی اور آزاد نے اس سلسلے میں بھرپور کوششیں کیں، دراصل یہاں بھی وہی فکر کام کر رہی تھی کہ انگریزی ادب سے استفادے کے بغیر ہم بالکل ہی کورے ہیں۔ چونکہ انگلش قوم اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم تصور کی جاتی تھی لہٰذا یہ خیال عام تھا کہ تہذیبی، ثقافتی اور ادبی سطحوں پر اس قوم کی برابری کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ انھی کی اتباع و پیروی کی جائے۔ دوسری جانب زمینی سطح پر اس صداقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ انگلش قوم اس وقت علوم وفنون اور ادب میں ایک مخصوص بلندی پر فائز تھی اور بہت ساری قابل استفادہ چیزیں ان کے پاس موجود تھیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں اس قوم سے استفادہ کرنا کچھ ایسا برا بھی نہ تھا۔ چنانچہ حالی و آزاد کی کوششوں سے ایک عمومی فضا بننی شروع ہوگئی۔ آزاد نے اس سلسلے میں بہت سارے لکچر دیے جن میں انھوں نے قدیم شعری جمالیات کو مکمل طور پر ترک کر دینے کی سفارشیں پیش کیں۔ ان کے شعری خیالات کا اندازہ ان اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے:

''شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروش خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور اسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے۔ خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبہ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں۔

ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے۔ البتہ فصاحت و بلاغت اب زیادہ ہے مگر خیالات خراب ہو گئے۔ سبب اس کا سلاطین و حکام عصر کی قباحت ہے۔ انھوں نے جن جن چیزوں کی قدردانی کی۔ لوگ اس میں ترقی کرتے گئے۔ ورنہ اسی نظم و شعر میں شعرائے اہل کمال نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں جن کی بنا فقط پند پر ہے اور ان سے ہدایت ظاہر و باطن کی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کلام سعدی و مولوی روم و حکیم سنائی و ناصر خسرو اسی قبیل سے ہیں۔''

(نظم آزاد، مرتبہ آغا محمد باقر، شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری بازار، لاہور، 1929، ص: 22,23)

ظاہری بات ہے آزاد شاعری کے افادی پہلوؤں پر خاصا زور صرف کر رہے تھے، وہ معاملات حسن و عشق اور تفریح و تفنن طبع کے لیے تخلیق شعر کے قائل نظر نہیں آتے بلکہ انتہائی سختی کے ساتھ شعر کے افادی پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے کلام خسرو و سعدی، مولانا روم اور حکیم سنائی وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے 'بعض' کا لاحقہ لگا کر ان کے عشقیہ کلام کو بھی نشان زد کر دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک تخلیق شعر کا اصل مقصد تفریح طبع اور تسکین احساس جمال نہیں بلکہ قوم کی تعمیر و ترقی ہے۔ ظاہری بات ہے جب کلام میں صرف افادی پہلوؤں پر زور دیا جانے لگے گا تو ایسی صورت میں جمالیاتی پہلو کا دب جانا فطری ہے۔

محمد حسین آزاد نے بذات خود 'محنت کرو، حب وطن، میری پیاری اماں' جیسی نظمیں تخلیق کیں۔ ان نظموں میں جمالیاتی قدروں کا وہ پیمانہ ہی نہیں ہے جس سے ہم عمومی ادب کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ مثال کے طور ان کی نظم حب وطن کے چند اشعار دیکھیں۔

بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شب سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
عالم سے تا کہ تیرہ دلی دور ہو تمام
اور ہند تیرے نور سے معمور ہو مدام

حب وطن اپنی جگہ ایک جمالیاتی تجربہ ضرور ہے کہ یہ انسانی فطرت میں داخل و شامل ہے، لیکن اس تجربے کا اظہار جس انداز سے کیا گیا ہے ظاہری بات ہے وہ کسی تصنع، تکلف اور ملمع کاری سے عاری ہے۔ یہ سادگی اور صفائی ضرور ہے لیکن اس میں قاری و سامع کو اپنی جانب کھینچنے اور ملتفت کرنے کا وہ ملکہ نہیں جس سے قاری ایک ہی نظر میں شکار ہو جائے اور کسی سحر میں گرفتار کھنچا چلا آئے۔ دوسری طرف اس طرح کے کلام میں اگرچہ سادگی پر بہت زیادہ زور دیا گیا اور لفظی صناعی سے دانستہ گریز کیا گیا لیکن اس کے باوجود مذکورہ پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ''عوض چراغوں کے'' کے اندر جو لفظی تعقید ہے وہ اہل نظر کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔ اس تحریک سے جڑے ہوئے شعرا کے کلام کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ یہ سادگی بذات خود کہیں کہیں تصنع کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ یعنی وہ تراکیب و تعبیرات جو کسی مقام پر بالکل برجستہ سما سکتی تھیں، سادگی کے نام پر انھیں بھی تج دیا گیا اور یہ کلام بالکل ہی سیدھا اور سپاٹ نظر آنے لگا۔

اس سے قبل مقدمہ شعر و شاعری میں مولانا الطاف حسین حالی نے بھی کلام کی سادگی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا؛

''سادگی ایک اضافی امر ہے، وہی شعر جو ایک حکیم کی نظر میں محض سادہ اور سمپل معلوم ہوتا ہے اور جس کے

معنی اس کے ذہن میں بمجرد سننے کے متبادر ہوجاتے ہیں اور جو خوبی اس میں شاعر نے رکھی ہے اس کو فوراً ادراک کرلیتا ہے۔ ایک عام آدمی اس کے سمجھنے اور اس کی خوبی دریافت کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک عامیانہ شعر جس کو سن کر ایک پست خیال جاہل اچھل پڑتا ہے اور وجد کرنے لگتا ہے ایک عالی دماغ حکیم اسی کو سن کر ناک چڑھالیتا ہے اور اس کو محض ایک سخیف اور رکیک و سبک تک بندی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا۔ ہمارے نزدیک ایسی سادگی جو سخافت اور رکاکت کے درجہ کو پہنچ جائے سادگی کا اطلاق کرنا گویا سادگی کا نام بدنام کرنا ہے۔ ایسے کلام کو سادہ نہیں بلکہ عامیانہ کہا جائے گا۔''

(مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 2002، ص: 58,59)

ظاہر سی بات ہے سادگی اور صفائی، سلاست و روانی، لوازم شعر اور دیگر تمام متعلقات کے لیے سارے اصول خود ساختہ تھے ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انجمن پنجاب کے زیر انتظام جو بھی شاعری پیش کی گئی وہ ایک مستحکم منشور کے تحت تخلیق کی گئی تھی۔ لہٰذا اس ضمن میں عمومی رجحان کا خیال رکھنا، قاری و سامع کے احساس جمال کی تشفی کا سامان فراہم کرنا وغیرہ ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ ایک بندھے ٹکے اصول کے تحت اپنے مقصود و مفہوم کو صرف شعری قالب میں ڈھال کر عوام کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اسی تناظر میں اگر ہم مولانا حالی کی شاعری کا جائزہ لینے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خود مولانا حالی اپنے شعری نظریات کی وضاحت اپنے اشعار ہی کے ذریعے کردیتے ہیں۔

اے شعر! دل فریب نہ ہو تو، تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

یعنی حالی کے نزدیک شعر کا دل گداز ہونا لازمی اور ضروری ہے، جبکہ اس کی دل فریبی ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی اس طرح دیکھا جائے تو حالی نے فنی جمالیات کا گلا تو پہلی ہی فرصت میں گھونٹ ڈالا، نیچر پر مبنی شاعری کی بات کی جائے تو بوزان کے اور اس کے ہم نواؤں نے مظاہر فطرت کو جمالیاتی دائرے سے پہلے ہی باہر نکال رکھا تھا، یہاں صرف ایک ہی بحث باقی تھی کہ مظاہر فطرت کی ادبی یا شعری عکاسی میں چونکہ ادیب و شاعر کا شعور شامل ہوجاتا ہے اس لیے ان ادبی کاوشوں پر جمالیاتی بحثوں کی گنجائش بہرحال باقی رہتی ہے۔ حالی کے اس قول کی روشنی میں ادیب و شاعر کی فنی جمالیات کا راستہ بھی مسدود ہوجاتا ہے۔ حسن و عشق کے معاملات کو حالی و آزاد شاعری

> **علی گڑہ تحریک اور انجمن پنجاب کی عمومی خدمات سے انکار کرنا ممکن نہیں اور یہ تقاضا انصاف کے بھی مخالف ہے لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف بھی ہونا چاہیے کہ اگر ان کی جانب سے جمالیاتی اقدار پر اس قدر سخت بندش نہ لگائی گئی ہوتی تو شاید اس زمانے میں تخلیق کیا گیا ادب بھی ایک جمالیاتی معیار کا حامل ہوتا۔ ہاں اسی کے ساتھ ساتھ اس تحریک کی عقلیت پسندی اور افادی پہلوؤں پر حد سے زیادہ زور دینے کا جو رد عمل سامنے آیا وہ اردو کو جمالیاتی خزانوں سے معمور کرگیا۔**

کا حصہ رکھنا نہیں چاہتے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ بقول مولانا حالی:

''...... انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین و تربیت نہیں کرتا لیکن ازروئے انصاف اس کا علم اخلاق کا نائب مناب قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ اسی بنا پر صوفیہ کرام کے ایک جلیل القدر سلسلہ میں سماع کو جس کا جزو اعظم اور رکن رکین شعر ہے وسیلۂ قرب الٰہی اور باعث تصفیہ نفس و تزکیہ باطن مانا گیا ہے۔''

(مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 2002، ص: 15)

لفظی صناعی اور فکری سطح پر حسن و عشق کو ممنوع گرداننے کے بعد ظاہر سی بات ہے اب صرف اخلاقی موعظت ہی باقی رہ جاتی ہے جو اشعار میں کسی قدر جمالیاتی قدروں کی موجودگی کا سراغ دے سکتی ہے۔ افادی اور مقصدی ادب کا سب سے بڑا اور واضح نقصان یہی رہا ہے کہ یہاں جمالیاتی قدروں نے دم توڑ دیا ہے اور فکری اور موضوعاتی سطح سے لے کر فنی اور اسلوبیاتی سطح تک ایک ہموار اور مسطح راستہ بنادیا ہے جہاں کوئی بھی نشیب و فراز نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ بغیر کسی نشیب و فراز کے، بغیر کسی فنی شعبدہ گری کے، صرف سادگی و صفائی کی بنیاد پر شعر کس قدر دل پزیر بن سکتا ہے! حقیقت کی ترجمانی کچھ الگ شے ہے، خاص طور پر مولانا حالی عربی و فارسی کے جن شعرا کا حوالہ دے رہے ہیں اگر ان کی شعری جمالیات کا جائزہ لیا جائے تو بات تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ان کے یہاں کذب و افترا کا ماحول نہیں ہے، وہ جھوٹی باتیں نہیں

کرتے، ان کے یہاں جمالیات کا ایک مخصوص پیمانہ و معیار پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم زہیر ابن ابی سلمی جیسے عظیم الشان شاعر کے معلقہ کی بات کریں جو سماجی اخلاقیات کی بہت زیادہ تلقین کرتا ہے۔

فلا تکتمن اللّٰہ ما فی نفوسکم
لیخفی و مھما یکتم الله یعلم
یؤخر فیوضع فی کتاب فیذخر
لیوم الحساب او یعجل فینقم

اس طرح کی باتیں کرنے والا شاعر بھی اپنے قصیدے میں آخرکار ایک تخیلاتی منظر میں عورتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ ہی بیٹھتا ہے۔

و فیھن ملھی للطیف و منظر
انیق لعین الناظر المتوسم

یعنی شاعری معاملات حسن و عشق سے مکمل طور پر عاری ہو ہی نہیں سکتی، کسی نہ کسی سطح پر حسن و عشق شاعری میں جگہ پا ہی جاتے ہیں کیونکہ یہ فطرت انسانی میں داخل ہیں۔ اگر ان سے دانستہ پہلوتہی کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ایسا نہیں ہے کہ یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ شعر بالکل سپاٹ اور بے جان ہوجائے گا اور پھر وہ اپنی جانب قارئین کو کھینچ پانے میں ناکام ہوجائے گا۔ اصلاحی، تعمیری، افادی اور مقصدی شاعری میں بھی ہمیں یہ بات ملحوظ رکھنی ہوگی کہ اس شاعری میں اتنی تو جاذبیت بہرحال موجود رہے کہ لوگ اسے سننے اور پڑھنے پر آمادہ ہوسکیں کیونکہ جب سامعین و قارئین اسے سننے اور پڑھنے پر آمادہ ہی نہیں ہوں گے تو آپ کے مقاصد کا حصول مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجائے گا۔

علی گڑھ تحریک اور انجمن پنجاب کی عمومی خدمات سے انکار کرنا ممکن نہیں اور یہ تقاضا انصاف کے بھی مخالف ہے لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف بھی ہونا چاہیے کہ اگر ان کی جانب سے جمالیاتی اقدار پر اس قدر سخت بندش نہ لگائی گئی ہوتی تو شاید اس زمانے میں تخلیق کیا گیا ادب بھی ایک جمالیاتی معیار کا حامل ہوتا۔ ہاں اسی کے ساتھ ساتھ اس تحریک کی عقلیت پسندی اور افادی پہلوؤں پر حد سے زیادہ زور دینے کا جو رد عمل سامنے آیا وہ اردو کو جمالیاتی خزانوں سے معمور کرگیا۔

■

Danish Kamal (Danish Asari)
H.No. 167/A, Behind Ayesha Masjid,
Bulaqui Pura, Mau Nath Bhanjan
Mau - 275101 (UP)
Mob.: 9236741905, 7007809510
E. mail. dkamal2011@gmail.com

ساغر صدیقی کی غزل میں سائنسی عناصر

محمد عادل

ہر بڑے شاعر کی شاعری کا فکری وجدان بہت وسیع ہوتا ہے۔ ساغر صدیقی (1928-1974) بھی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے تخیل کے زور پر بڑے بڑے ادبی محل تعمیر کیے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق حقیقی، عشق مجازی، زندگی سے مایوسی، کرب و بے چینی، آوارگی وغیرہ کے موضوعات نمایاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ساغر صدیقی کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اپنی ذات سے جڑے ہوئے مسائل کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ یہ موضوع کائنات کے موضوع بن جاتے ہیں۔ اور ان کا کرب ان کا کرب نہیں رہتا بلکہ پورے عالم کا کرب ہو جاتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کے آفاقی کلام ہونے کی ترجمان ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ محدود نہیں ہے بلکہ اس میں اتنی وسعت ہے کہ جس میں پوری کائنات کے موضوع سمٹ آئے ہیں۔ در اصل یہ موضوعات ہی سائنسی فکر کے ترجمان ہیں۔ وہ خود اپنی ایک غزل میں خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چمن سے برق و شرر سے خطاب کرتا ہوں
شعور و فکر و نظر سے خطاب کرتا ہوں
قدم قدم پہ کھلاتا ہوں گل معانی کے
جہان شمس و قمر سے خطاب کرتا ہوں
جبیں پہ سطوت الہام کے تقاضے ہیں
زبان قلب و جگر سے خطاب کرتا ہوں
میں ایک مرد قلندر میں ایک دیوانہ
طلوع نور سحر سے خطاب کرتا ہوں

اکثر بارش کے موسم میں آسمان پر بادلوں کے بڑے بڑے قافلے دیکھنے کو ملتے ہیں جب ہوا کے زور سے بادل ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑتے ہوئے جاتے ہیں تو ان کی شکل و صورت میں بہت سی تصویریں ابھر کر آتی ہیں اور انسانی عقل ان اسٹرکچرس میں بہت سی مانوس چیزوں کو تلاش کر لیتی ہے۔ مثلاً کبھی بادلوں میں جانور کا چہرہ تو کبھی انسانی شکل نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آسمان کے کینوس پر کسی نے بادلوں کی مدد سے جیتی جاگتی تصویر بنا دی ہے۔ ماہرین کے مطابق اس امر میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اگر ہم بادلوں میں کسی خرگوش کے خد و خال دیکھ رہے ہیں تو یہ صرف اس کی رینڈم نس سے نکالنے والا پیٹرن ہے۔ یہ عمل اس بات کا عکاس ہے کہ ہمارا دماغ کس طرح انفارمیشن کو پراسس کرتا ہے اور اس سے معنی نکالتا ہے۔ بصارت کے ذریعے پیٹرن تلاش کرنے کے اس عمل کو 'پیریڈولیا' (Peridoliya) کہا جاتا ہے۔ اور ہمارے دماغ کی پیٹرن نکالنے کی اس صلاحیت کو 'اپوفینیا' کہا جاتا ہے۔

دراصل اس عمل کے پیچھے ہماری ذہنی قوت عمل کرتی ہے۔ جب ہماری آنکھیں کوئی عکس دیکھتی ہیں تو ہمارا ادراک متحرک ہو جاتا ہے اور وہ اس عکس کو اپنے اندر محفوظ کر لیتا ہے اور اس سے ملتی جلتی ہوئی چیز سے ملا کر باقی تفصیلات خود مکمل کر لیتا ہے۔ پھر ہمیں وہ بادل کا ٹکڑا کسی چہرے کی طرح نظر آتا ہے۔ اسی طرح بادلوں کی وجہ سے بھی لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں تو کبھی کبھی ڈر اور خوف کے شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ بادلوں کے خوف کو 'نیفوفوبیا' کہتے ہیں اس فوبیا میں گرفتار شخص بادلوں کے بدلتے ہوئے روپ کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے اور اس کی کیفیت بدلنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ چیخنے اور رونے لگتا ہے۔

ساغر صدیقی کی غزل کا ایک شعر دیکھیں جو پیریڈولیا، اپوفینیا، نیفوفوبیا کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

بادل فضا میں آپ کی تصویر بن گئے
سایہ کوئی خیال سے گزرا تو رو دیے

سائنس کی وہ شاخ جس میں نباتات کی حیات سے متعلق علم حاصل کیا جاتا ہے اس کو بوٹنی (Botany) کہا جاتا ہے۔ نباتات بھی ہماری طرح جیتے جاگتے اور متحرک اور سانس لیتے اور چھوڑتے ہیں۔ پیٹر ولیبن (Peter Wohlleben) ایک جرمن Forester نے اپنی تحقیقی کتاب 'The Hidden life of

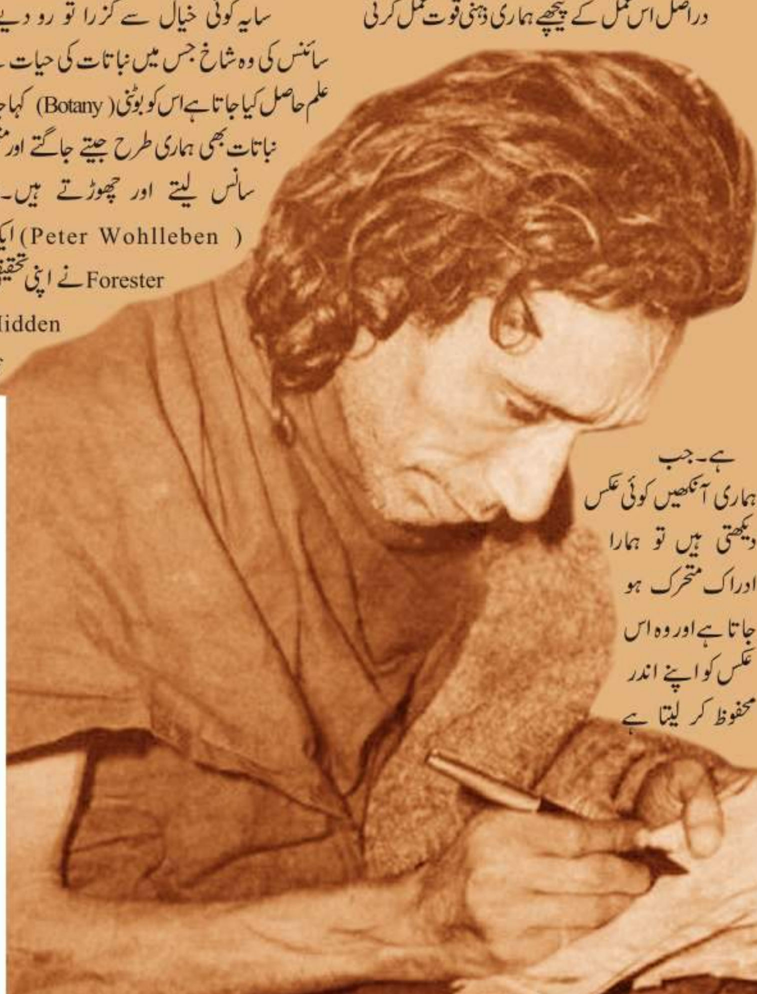

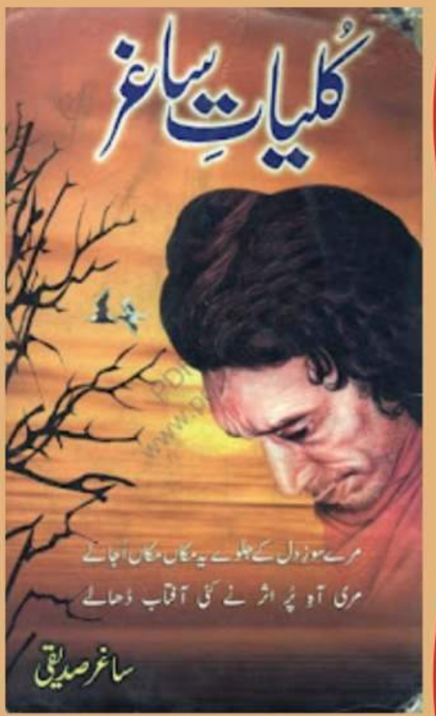

Trees: What they feel How they Communicate' میں پودوں کی حیات سے متعلق بہت سی حیرت انگیز باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ پیٹر ولیبن کے مطابق پیڑ پودے بھی آپس میں پیغام بھیجتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں۔لیکن ان کی بات چیت کرنے کا عمل ہم سے الگ ہے۔ یہ پیغام نشر کرنے کے لیے اپنی جڑوں، شاخوں، تنوں، پتیوں، پھل اور پھول کا استعمال کرتے ہیں۔ بیلیں اور جھاڑیاں ایک دوسرے سے جڑ کر معلومات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہیں۔ ماہرین کے مطابق پیڑوں کی جڑیں زمین کے اندر بہت گہرائی تک پھیلی ہوئی اور آپس میں جڑی رہتی ہیں۔وہ ان جڑوں کے ذریعے آپس میں پیغام بھیجتے ہیں۔اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ یہ اپنی غذا اور دفاع سے متعلق پیغام بھیجتے ہیں۔پیڑ اپنی جڑوں سے ایک خاص قسم کی فنگی کے ذریعے دوسرے پیڑوں کو سگنل بھیجتے ہیں۔جس کو وہ اپنی جڑوں سے ریسیو کر کے آگے پیڑوں کو بھیج دیتے ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان کے ایک بایولوجسٹ جگدیش چندر بوس نے تحقیق میں ثابت کیا کہ پودے الیکٹرک نیچر کے ذریعے بھی بات کرتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ ایک خاص طرح کی خوشبو کو ہوا میں چھوڑ کر بھی پیغام اور اطلاعات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ساغر صدیقی کی غزل کے یہ اشعار دیکھیں جس میں وہ پھولوں کی بات سننے اور گلشن میں شگوفوں کا صبا سے شکوہ کرنے کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بات پھولوں کی سنا کرتے تھے
ہم کبھی شعر کہا کرتے تھے
آج گلشن میں شگوفے ساغر
شکوۂ بادِ صبا کرتے تھے

جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کی ہر خواہش کو سچ کر دکھایا ہے۔انسان کو ہوا میں اڑنے کی تمنا تھی تو اس نے ہوائی جہاز کی تخلیق کی۔اس نے تیزی سے سفر کرنے کے لیے تیز رفتار گاڑیاں، بس اور ریل گاڑیوں کو بنایا۔ اس نے دور دراز کے علاقوں تک پیغام کی رسائی کے لیے ٹیلیفون اور اسمارٹ موبائل کی ایجاد کی جس کے ذریعے آج وہ اپنی آواز، تصویر، اور تحریر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کچھ لمحات میں منتقل کر سکتا ہے۔آج سائنسی ترقی کے سبب فاصلے سکڑ کر مختصر ہو گئے ہیں اور دنیا مٹھی میں آگئی ہے۔یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش انسان نے کی تھی اور کبھی ان کو خیالی تصور کیا جاتا تھا۔سائنس کی زبان میں کہا جائے تو سائنس فکشن سمجھی جانے والی یہ چیزیں آج حقیقت میں وجود میں آ چکی ہیں۔جس کی کامیابی کا سہرا

آج سائنسی ترقی کے سبب فاصلے سکڑ کر مختصر ہو گئے ہیں اور دنیا مٹھی میں آگئی ہے۔یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش انسان نے کی تھی اور کبھی ان کو خیالی تصور کیا جاتا تھا۔سائنس کی زبان میں کہا جائے تو سائنس فکشن سمجھی جانے والی یہ چیزیں آج حقیقت میں وجود میں آ چکی ہیں۔ جس کی کامیابی کا سہرا سائنسدانوں کے سر بندھتا ہے۔

سائنسدانوں کے سر بندھتا ہے۔انسان کی بہت خواہشات میں سے ایک خواہش وقت پر قابو کرنا بھی ہے۔اس کی خواہش ہے کہ کسی طرح وہ اپنے ماضی یا مستقبل کا سفر کر سکے۔ٹائم ٹریول جس کو سائنسی فکشن تصور کیا جاتا ہے۔اگر ہماری سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت کبھی حقیقت میں آ سکا تو ایک بڑی کمال کی بات ہوگی۔لیکن سائنسدانوں نے اس خواب کو بھی شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے کام شروع کر دیا ہے۔انھوں نے اپنی تحقیقات اور تجربات کے ذریعے کائنات کے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ رفتار کی کمی بیشی کے مطابق کسی چیز پر وقت کے پھیلنے اور سکڑنے کا عمل وجود میں آتا ہے۔سائنسدانوں کا ماننا ہے کہ اگر انسان روشنی کی رفتار سے سفر کرتا ہے تو وہ اپنے مستقبل کا سفر کر سکتا ہے۔کچھ سائنسداں وقت کو بہتے ہوئے پانی کے جھرنے سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں پانی ایک طرف کو بہتا ہے یعنی اوپر سے نیچے کی طرف۔اسی طرح وقت بھی آگے بڑھتا ہے اور اس میں پیچھے جانا ممکن نہیں یعنی ماضی میں سفر کرنا غیر ممکن ہے۔کچھ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ انسان وقت میں آگے اور پیچھے جا سکتا ہے یعنی مستقبل اور ماضی کا سفر کر سکتا ہے۔جب کہ آئنسٹائن کا 'نظریہ اضافیت' ٹائم ٹریول کے ممکن ہونے کی بات کو درست قرار دیتا ہے۔اس کے علاوہ سائنسداں بلیک ہول اور ورم ہول پر بھی تحقیق کر رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ ہول دوسری دنیا میں جانے کے راستے ہو سکتے ہیں اور ان کے ذریعے انسان ٹائم ٹریول بھی کر سکے گا۔بہر حال اگر انسان کسی طرح اپنے ماضی میں سفر کر سکا تو ایک حیرت انگیز دنیا میں قدم رکھ سکے گا۔جو اس کی دنیا سے مختلف ہو گی۔اس سائنسی فکشن کی ترجمانی میں ساغر صدیقی کی غزل کا ایک شعر دیکھیں۔

وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

میڈیکل سائنس کے نقطۂ نظر سے دل ایک ایسا عضو ہے جو انسانی جسم میں خون پمپ کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔ایک تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارا دل ایک دن میں تقریباً ایک لاکھ مرتبہ دھڑکتا ہے۔اور سال بھر میں اس کی دھڑکن کی تعداد تین کروڑ 50 لاکھ ہو جاتی ہے۔ایک اوسط زندگی کے دوران انسانی دل دو ارب 50 کروڑ مرتبہ دھڑکتا ہے۔یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایک بچے کی آرام کی حالت میں نبض کی رفتار ایک منٹ میں 90 سے 120 ہوتی ہے۔بالغ لوگوں کی اوسطاً ایک منٹ میں 27 بار ہو سکتی ہے ماہرین کے مطابق ہمارے جسم میں 4.7 سے 5.6 لیٹر خون موجود ہوتا ہے۔یہ خون ایک منٹ میں پورے جسم میں تین بار گردش میں آتا ہے اور یوں ایک دن میں 19 ہزار کلومیٹر سفر طے کرتا ہے۔اس طرح ہمارا دل دھڑکتے ہوئے بدن میں موجود خون کو پورے جسم میں گردش کراتا ہے۔جب ہمارے دل کے والو کھلتے اور بند ہوتے ہیں تو اس کی دھڑکن محسوس اور سنائی دیتی ہے۔دل کی دھڑکن کو سمجھنے کے لیے ایک مخصوص مشین کا استعمال کیا جاتا ہے جس کو الیکٹرو کارڈیوگرام (ای سی جی) کہتے ہیں۔اس مشین میں ایک اسکرین ہوتی ہے جس پر ایک لائن خط بناتے ہوئے اوپر نیچے ہوتی ہے۔جو دل کی دھڑکنوں کی رفتار کو دکھاتی ہے کہ کتنی تیزی سے ہمارا دل کام کر رہا ہے۔

اگر انسان کا دل کام کرنا بند کر دے تو لائن سیدھی چلنے لگتی ہے۔دراصل یہ مشین دل سے گزرنے والی بجلی کی پیمائش کرتی ہے جس کی مدد سے ڈاکٹر دل کے کام کرنے اور اس کی صحت کا اندازہ لگاتا ہے۔

ساغر صدیقی کی غزل کے یہ شعر ملاحظہ کریں جس

میں وہ دل کی دھڑکن کی کیا خوب ترجمانی کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

زندگی رقص میں ہے جھومتی ناگن کی طرح
دل کے ارمان ہیں بجتی ہوئی جھانجھن کی طرح

مذکورہ شعر کو اگر ہم سائنس کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ ساغر صدیقی الیکٹروکارڈیوگرام (ای سی جی) مشین کی اسکرین پر نظر آنے والی انسانی دل کی دھڑکنوں کی عکاسی کر رہے ہیں۔اور اسکرین پر چلنے والی ان لائنوں کو جھومتی ناگن سے تشبیہ دے رہے ہیں۔جس طرح ناگن پھن اٹھا کر لہرا لہرا کر زمین پر چلتی ہے۔اسی طرح الیکٹروکارڈیوگرام پر ہمارے دل کی دھڑکنیں رقص کرتی ہوئی چل رہی ہیں۔شعر کے دوسرے مصرعے میں ساغر دل کے ارمان کو بجتی ہوئی جھانجھن کہہ رہے ہیں۔گویا دل دھڑکنے پر پیدا ہونے والی آواز کو جھانجھن کی آواز کے مترادف قرار دے رہے ہیں۔جس طرح جھانجھن چھن چھن کی آواز پیدا کرتی ہے اسی طرح ہمارا دل بھی دھک دھک کرتا ہے۔

ایک دوسری غزل میں اسی موضوع کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دیکھی جو رقص کرتی ہوئی موج زندگی
میرا خیال وقت کی شہنائی بن گیا

اس شعر میں ساغر رقص کرتی ہوئی موج زندگی اور وقت کی شہنائی کا ذکر کر رہے ہیں۔موج زندگی کا نام آتے ہی ذہن فوراً الیکٹروکارڈیوگرام پر بننے والی دل کی دھڑکنوں کی طرف جاتا ہے۔جس طرح موج سمندر کی سطح پر اوپر نیچے ہوتی ہے اسی طرح 'موج زندگی' دل کی دھڑکنیں اوپر نیچے ہو رہی ہیں۔وقت کی شہنائی سے مراد دل کے دھڑکنے سے پیدا ہونے والی آواز سے لی جاسکتی ہے۔

اس موضوع سے متعلق ایک اور شعر دیکھیں جس میں وہ دھڑکنوں کی زبان سمجھانے یعنی ای سی جی مشین کے کام کرنے کے عمل کو سمجھانے کی بات کر رہے ہیں۔

کوئی ان بے وفا نگاہوں کو
دھڑکنوں کی زبان سمجھائے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے عصر حاضر کی انسانی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا ہے لیکن اس کے بے جا استعمال سے انسانی زندگی پر برے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔آج ہم اپنے چاروں طرف مشینوں کو دیکھتے ہیں اور پوری طرح ان پر منحصر ہوگئے ہیں۔دیوار پر لگی ہوئی گھڑی ہو یا چھت پر چلتا ہوا پنکھا، سب مشینیں ہی ہیں۔جن کے بغیر ہماری زندگی کا وجود ہی ممکن نہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ انسان خود مشینوں میں ڈھلتا جارہا ہے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔آنے والا وقت اس سے بھی زیادہ حیران کن ہوگا۔کیوں کہ مستقبل میں یہ مشینیں ہمارے جسم کے اندر پیوست کردی جائیں گی۔عصر حاضر کے سائنس فکشن کا مطالعہ کریں تو 'ٹرانس ہیومنزم' (Transhumanism) کا تصور دیکھنے کو ملتا ہے۔یہ ایک ایسا تصور ہے جس میں جینیاتی انجنیئرنگ، نینوٹیکنالوجی، بائیونکس اور برین-مشین انٹرفیس (انسانی دماغ اور مشین کا باہمی رابطہ) کی مدد سے مصنوعی انسانی نسل تیار کی جائے گی۔جس کے کام کرنے کی طاقت اور ذہنی صلاحیت آج کے انسان سے کہیں زیادہ ہوگی۔ٹھیک کسی مشین کی طرح انسان بغیر تھکے ہوئے مسلسل کام کرتا رہے گا۔اس کے جذبات اور احساسات پر قابو کر کے اسے کسی کام کے لیے تیار کیا جاسکے گا۔ان کے اندر شیر کی طرح بہادری، چیتے جیسی پھرتی، ہاتھی جیسی طاقت، کتے کی طرح تیز قوتِ شامہ، باز کی طرح دور تک دیکھنے کی صلاحیت کا ملکہ ہوگا۔آج کا انسان اس کے مقابلے میں ایسا تصور کیا جائے گا جیسے ہمارے سامنے بندر اور لنگور کی حیثیت ہے۔یہ سب ٹیکنالوجی کے سبب ممکن ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔

ساغر صدیقی کا ایک شعر دیکھیں جو ٹرانس ہیومنزم کا ترجمان نظر آتا ہے۔

انقلاب حیات کیا کہیے
آدمی ڈھل گیا مشینوں میں

عصر حاضر میں اشیا میں ہونے والی ملاوٹ ایک اہم مسئلہ ہے جس نے انسانی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔آج انسان زیادہ سے زیادہ نفع کمانے اور لالچ میں آکر خود اپنی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔نقلی غذا، اور ادویات تیار کی جارہی ہیں جس سے انسانی زندگی اور صحت متاثر ہو رہی ہے۔خوردونوش کی چیزوں میں ملاوٹ کر کے انسان ان چیزوں کو زہریلا بنا رہا ہے۔اگر ان اشیا کو کوئی استعمال کرتا ہے تو اس کے مضر اثرات صحت پر نظر آتے ہیں۔دودھ اور اس سے بننے والی اشیا مٹھائیاں، کھوا وغیرہ کو کیمیکل کے ذریعے تیار کیا جارہا ہے۔جو انسانی صحت کے لیے زہر ہیں۔مرچ مصالحوں میں بھی کیمیکل ملائے جارہے ہیں۔نقلی ادویہ بھی بڑے پیمانے پر تیار ہو رہی ہیں۔جس کو استعمال کرنے کے بعد فائدہ نہیں ہوتا بلکہ انسانی جسم میں زہر پہنچ جاتا ہے۔پھل اور سبزیوں کو زیادہ دیر تک تروتازہ رکھنے کے لیے ان میں کیمیکل کا چھڑکاو ہو رہا ہے۔کھیتوں میں زیادہ پیداوار حاصل کرنے لیے جراثیم کش دوائیں ڈالی جارہی ہیں

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے عصر حاضر کی انسانی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا کیاہے لیکن اس کے بے جا استعمال سے انسانی زندگی پر برے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔آج ہم اپنے چاروں طرف مشینوں کو دیکھتے ہیں اور پوری طرح ان پر منحصر ہوگئے ہیں۔

جس سے زمین کی ذرخیزی پر اثر پڑتا ہے اور فصلیں بھی زہریلی ہو جاتی ہیں۔جب یہ کیمیکل مٹی سے ہوتے ہوئے زیر زمین پانی تک پہنچتے ہیں تو وہ بھی زہریلا ہو جاتا ہے۔ساغر صدیقی کی غزل کا ایک شعر دیکھیں جو ملاوٹی نظام پر کیا خوب طنز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مجھ کو اک زہر کا چھلکا ہوا ساغر دے دو
مجھ کو اس دور کے انساں پہ ہنسی آئی ہے

الغرض ساغر صدیقی کے کلام میں ایسے اور بھی اشعار ہیں جو سائنس کی صداقتوں پر پوری طرح کھرے اترتے ہوئے نظر آتے ہیں جس پر ایک مکمل کتاب تحریر کی جاسکتی ہے۔

ساغر صدیقی نئی تصویر شوق بنانے کا فن جانتے ہیں۔انھیں سائنس کی ترجمانی کرنے والے شعرا کا امام قرار دیا جاسکتا ہے۔آخر میں ان ہی کی غزل کے ایک شعر پر بات مکمل کرتا ہوں۔

ہم بنائیں گے یہاں ساغر نئی تصویر شوق
ہم تخیل کے مجدد ہم تصور کے امام

کتابیات

* کلیات ساغر
* ساغر صدیقی کے شعری مجموعے زہر آرزو، غم بہار، شب آگہی، شیشہ دل، لوح جنوں، سبز گنبد، مقتل گل۔
* 'جسم کے عجائبات' تحقیق' جے ڈی ریٹ کلف' ترجمہ' محمد علی سید'
* ماحولیات (محمد شمس الحق) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
* ماحولیاتی سائنس (ماحولیات کے بنیادی تصورات) ڈاکٹر شاذلی حسن خاں (ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ)
* The Hidden life of Trees:What they feel: How they Communicate
* بادلوں میں تصویریں کیوں نظر آتی ہیں
https://www.punjnud.com

■

Er. Mohd Adil
Hilal House, H. No.: 4/114, Jagjeevan Colony
Naglah Mallah Civil Line
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9358856606

فیصل نذیر

ناصر الدین الاسد

تحقیق کی جوئے شیر کا فرہاد

مشہور اردنی محقق و ادیب، شاہ فیصل انعام یافتہ ناصر الدین الاسد 1922 میں اردن میں پیدا ہوئے، اس وقت اردن آزاد نہیں تھا، انھوں نے تعلیم کے لیے فلسطین کا رخ کیا۔ ان کے والد اور والدہ اس دار فانی کو اسی وقت الوداع کہہ گئے جب ناصر الدین اور ان کے بھائی دس سال سے بھی کم عمر کے تھے۔ ناصر نے تب سے محنت ومشقت جاری رکھی، کسب معاش وکسب علم دونوں جاری رکھا، کسی ایک کو دوسرے میں حائل نہیں ہونے دیا اور ابتدائی مرحلے سے پی ایچ ڈی تک کا سفر طے کیا۔ وہاں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر اعلی تعلیم اور پی ایچ ڈی کے لیے علوم وفنون کے مرکز مصر تشریف لے گئے۔ مصر اس وقت علما ادبا فقہا اور ماہرین فن وادب سے بھرا ہوا تھا۔ مصر کا علاقہ خان الخلیلی علم وادب میں سوق عکاظ سے کم نہ تھا۔ آپ نے علمی و ادبی حلقوں سے خوب استفادہ کیا۔ ہر گوشے سے خوشہ چینی کی اور ہر چشمے سے سیرابی حاصل کی۔ جامعہ ازہر کی لائبریری اور اساتذہ سے خوب استفادہ کیا۔ وہاں کی علمی و ادبی مجلسوں اور شعری نشستوں سے فیض اٹھایا اور اپنی علمی تشنگی دور کی۔

تحقیق اپنے آپ میں ایک محنت طلب عمل ہے، تحقیقی مقالات لکھنے کے لیے جہد مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے، ایک دھن چاہیے کہ محقق کو اپنی تحقیق کے علاوہ کچھ اور نظر ہی نہ آئے، تب جا کر ایک قابل تحسین واستفادہ تحقیقی وتصنیفی کام معرض وجود میں آتا ہے۔

ایسے ہی چند عالمی سطح کے محققین ومفکرین میں سے ایک ناصر الدین الأسد ہیں، جن کی نمایاں صفت تحقیق و ریسرچ کا دلدادہ ہونا ہے۔

ناصر الدین الأسد نے جب مصر کا رخ کیا اور قاہرہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے لگے تو دیکھا کہ وہاں بڑے بڑے محققین وادبا کس طرح عالمی سطح کا ادب تخلیق کر رہے ہیں اور ان کے ریسرچ کی سارے عالم میں دھوم ہے، جو لوگ اس وقت لکھ رہے تھے ان میں نوبل انعام یافتہ نجیب محفوظ، مصطفیٰ صادق رافعی، می زیادہ، طہ حسین، محمد تیمور، ہیکل برادران وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس علمی فضا نے ناصر الدین کے اندر بھی ایک محقق بننے کا شوق وجذبہ پیدا کیا۔

ناصر الدین الأسد نے اپنی پی ایچ ڈی کا عنوان عہد جاہلی کی شاعری کے مصادر کی تلاش وتحقیق رکھا، تحقیق کے دوران جاہلی دور کی شاعری کی بنیاد وساخت تک پہنچے اور اس کے اصل مصادر ومراجع کی تحقیق کی، طہ حسین کی کتاب 'فی الأدب الجاھلی' میں کیے گئے سارے اعتراضات کا جواب دیا۔ بعد میں جب یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ بطور کتاب منظر عام پر آیا تو لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ کتاب دراصل طہ حسین پر رد ہے۔ حالانکہ ناصر اس کا انکار کرتے رہے۔

جب یہ کتاب موضوع بحث بنی تو اس وقت طہ حسین یورپ کے سفر پر تھے۔ جب وہ آئے تو ان کے سکریٹری نے ناصر الدین الأسد کو بتایا کہ تیار رہیں، طہ حسین مجھ سے آپ کی کتاب سن رہے ہیں، (چونکہ طہ حسین نابینا تھے اور پڑھ نہیں سکتے تھے)، وہ بہت جلد آپ سے ملیں گے۔ ناصر کہتے ہیں کہ میں ایک دن قاہرہ یونیورسٹی میں بیٹھا تھا کہ اچانک طہ حسین میرے چیمبر میں آئے، ان کے آگے آگے ان کے سکریٹری تھے، وہ مجھ پر برس پڑے، میں نے ایک لفظ نہیں کہا، کیونکہ وہ میرے استاد تھے۔ برا بھلا کہنے کے بعد وہ واپس چلے گئے، جب انھوں نے پوری کتاب سن لی تو پھر میرے پاس آئے اور مذاق کرتے ہوئے کہا: کیا ناصر ناراض ہو؟ تو میں نے ان کو خوش مزاجی کے موڈ میں دیکھ کر کہا: جی بہت ناراض ہوں تو وہ ہنسنے لگے اور پھر انھوں نے میری کتاب اور میرے طریقہ استدلال وتحقیق کی تعریف کی۔ ایسے ہوتے ہیں بڑے لوگ، جن کے دل بھی بڑے ہوتے ہیں۔

ناصر الدین کی سب سے مشہور کتاب یہی 'مصادر الشعر الجاہلی' ہے، جو علمی دنیا کے لیے یہ ایک سند کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب ادب وتحقیق کا شاہکار ہے 700 صفحات پر مشتمل یہ کتاب تحقیق کا گوہر نایاب ہے۔ اس کتاب میں ناصر الدین نے حسین اور دیگر مستشرقین کے ان اعتراضات کا نہایت ہی علمی رد کیا ہے۔ جو یہ مانتے ہیں کہ معلقاتی شاعری اور زمانۂ جاہلیت کے دیگر شعرا کی شاعری مکمل طور پر بے بنیاد اور سرقہ ہے۔ کسی بھی شعر کا انتساب کسی بھی شاعر سے کر دیا گیا ہے۔ ڈیوڈ صمویل مرجلیوث نامی ایک مستشرق جو آکسفورڈ میں عربی زبان و ادب کے پروفیسر تھے، انھوں نے اس شک کو مزید استحکام پہنچایا اور ایک مضمون لکھا 'شعر جاہلی کی بنیادیں' (Origin of Arabic poetry)، اس مضمون میں انھوں نے یہ دعوی کیا کہ شعر جاہلی کوئی چیز ہی نہیں ہے، بلکہ بعد کے شعرا نے اپنی شاعری کو معلقات و دیگر شاعروں سے منسوب کر دیا ہے جس کی مختلف وجوہات تھیں۔ لوگ خودستائی کے لیے غیر مانوس بحر و قافیہ کے ساتھ شاعری کرتے اور یہ کہتے کہ یہ امرءالقیس کا شعر ہے اور دل ہی دل میں خوش بھی ہوتے کہ دیکھو میرے اشعار لوگ اعشی اور امرءالقیس کا کلام سمجھ کر پڑھ رہے ہیں۔ زمانہ جاہلی میں شاعری ہی عربوں کی پہچان تھی، تمام اصناف ادب میں شاعری ہی تفوق رکھتی تھی، اس زمانے کی تمام باتیں، تاریخ، جنگ، رہن سہن، معاشرت سب شاعری سے ہی معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے 'الشعر دیوان العرب' یعنی شاعری اہل عرب کی کھتونی/رجسٹر ہے۔

بعض راویوں نے اپنے قبیلے کو اونچا دکھانے کے لیے شاعری کی اور اسے قدیم شعرا کی طرف منسوب کر دیا تاکہ سماج میں اس کے قبیلے کے عزت واحترام میں اضافہ ہوجائے۔ کبھی ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ نحو وصرف میں ان کی رائے کو فوقیت دی جائے۔ کوفہ وبصرہ کا نحوی، صرفی اختلاف مشہور ہے کہ کس لفظ کو کیسے پڑھا جائے؟ کیسے لکھا جائے؟ اس اختلاف کے درمیان کوفیوں نے اپنا طریقۂ قرات مدلل کرنے کے لیے شعر گڑھنا شروع کر دیا اور اسی طریقے سے الفاظ کا استعمال کیا، جو ان کے مطابق صحیح ہے اور اس شاعری کو معلقاتی شعرا کی طرف نسبت کی وجہ سے لوگوں نے بھی اسے صحیح مانا۔ دوسری طرف بصریوں نے بھی اپنے اصول و قواعد کو درست ٹھہرانے کے لیے ایسی ہی حرکت کی۔ معلقاتی شاعری کے غیر معتبر ہونے پر دلیل دینے والوں کا کہنا ہے کہ زمانہ جاہلی میں جس طرح کے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے، وہ اس زمانے میں رائج ومستعمل زبان تھی ہی نہیں۔ جو لفظیات (Vocabulary) استعمال کی گئی یہ صاف بتاتی ہے کہ بعد کے دور یعنی زمانہ اسلام یا اموی وعباسی دور میں لوگوں نے کسی

نہ کسی مقصد کے تحت بڑھادی ہے۔بعض ایسی خالص اسلامی تعبیرات ہیں جو خاص کر اسلام آنے کے بعد رواج میں آئی ہیں۔اس سے پہلے وہ استعمال ہوتی ہی نہیں تھیں۔بعض معترضین کا یہ کہنا ہے کہ یہود و نصاریٰ اس وقت موجود تھے، اور اسلام کے مد مقابل تھے۔مگر پوری شاعری میں ان کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔جنگ داحس وغبراء چالیس سال تک چلتی رہی، اور اس عہد کی ایک جنگ عظیم مانی جاتی ہے،مگر جاہلی شاعری میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

یہ تمام شواہد اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تمام جاہلی ومعلقاتی شاعری فرضی اور خیالی ہے اور اس بات کا ثبوت ایسے بھی مل جاتا ہے کہ شعر جاہلی کے جتنے راوی ہیں سب پر کذب وافترا اور غلط بیانی کا الزام ہے۔جیسے حماد الراویہ، خلف الأحمر، جناد، محمد بن اسحاق، مبرد، یہ تمام راوی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے روایت میں خرد برد کیا ہے۔یہ باتیں ثابت کرتی ہیں کہ زمانہ جاہلی کی اصل شاعری کہیں گم ہوگئی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''اسلام آنے کے بعد لوگ شاعری سے غافل ہوگئے۔'' لہٰذا بعد میں جیسے تیسے اشعار بھی لوگ جاہلی شعرا سے منسوب کردیتے تھے۔

مختلف محققین و ناقدین نے جاہلی دور پر کیے گئے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے ،جن میں ناصرالدین الاسد سرفہرست ہیں۔طہ حسین نے اس دور کی شاعری پر ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ وہ اس دور کے عادات واطوار کو نہیں بتاتی۔اس زمانے میں جو ادیان رائج تھے مثلاً یہودیت و نصرانیت اور بت پرستی ان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ناصر ان کے اس اعتراض کے جواب میں امرؤ القیس کا یہ شعر پیش کرتے ہیں کہ۔

فعنّ لنا سربٌ كأنَّ نعاجه
عَذارَى دَوارٍ فی المُلاءِ المُذَيَّلِ

اس میں لفظ 'دوار' ایک بت کا نام ہے۔اسی طرح ان کا ایک اعتراض یہ تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ عربوں کا تعلق باہر کے لوگوں اور قریبی سلطنتوں سے تھا،مگر شعر جاہلی سے ایسا کہیں معلوم نہیں ہوتا۔جواب میں وہ امرؤ القیس کا ہی دوسرا شعر پیش کرتے ہیں۔

تَرَى بَعَرَ الآرَآمِ فی عَرَصَاتِهَا
وَقِيْعِ انِها كَأَنَّهٗ حَبُّ فُلْفُلِ

اس میں جو لفظ فلفل (مرچ) آیا ہے،عرب میں اس کی پیداوار نہیں تھی، بلکہ وہ ہندوستان سے لایا جاتا تھا۔ایسے ہی کئی اشعار میں 'حریر' کا ذکر آیا ہے جو کہ ملک شام سے لایا جاتا تھا۔لہٰذا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عرب کے تعلقات دیگر ممالک سے استوار تھے اور ان کا ذکر شاعری میں موجود ہے، اور جہاں تک راویوں کے کمزور ہونے کی بات ہے،تو معلوم ہونا چاہیے کہ اہل عرب کا حافظہ غضب کا تھا اور معلقاتی شاعری تو اتنی مشہور تھی کہ بچہ بچہ اسے ازبر رکھتا تھا،نسلا بعد نسل وہ غیر شعوری طور پر نقل ہوتی رہتی تھی۔اس میں کسی ایک نامانوس اور غیر مشہور شعر کا آنا بھی تقریباً ناممکن ہے۔

اسی طرح یہ اعتراض کہ تمام جاہلی شاعری میں لہجوں کا فرق کیوں نہیں دکھتا، حالانکہ اس وقت عربوں میں کئی لہجے رائج تھے۔اس کا جواب دیتے ہوئے ناصرالدین کہتے ہیں کہ یقیناً عرب میں کئی لہجے رائج تھے،مگر اسلام کی آمد سے قبل ہی ایک اعلی علمی زبان کے استعمال پر سوقِ عکاظ میں ایک طرح سے اتفاق تھا،اور شاعری چاہے جس قبیلے کا انسان کرے،اس میں وہ اعلی اور معیاری زبان ہی استعمال کرے گا۔شاعری میں اپنے گھر اور قبیلے میں بولی جانے والی زبان استعمال نہیں کی جاتی۔لہٰذا یہ اعتراض بھی بے بنیاد اور واہمہ ہے۔

اس طرح اپنی کتاب میں ناصر الدین الأسد نے ایسے سارے اعتراضات کا بھرپور اور دلائل کے ساتھ جواب دیا ہے اور ہر اعتراض کے جواب میں وہ زمانہ جاہلی کے اشعار سے استدلال کرتے ہیں۔

ناصرالدین الأسد کی دوسری کتاب 'الحياة الأدبية الحديثة فی فلسطين والأردن' (اردن اور فلسطین کی ادبی سرگرمیاں) ہے۔ یہ اپنے موضوع پر بہت اہم کتاب ہے۔یہ دراصل ایک تاریخی دستاویز ہے۔جس میں ناصرالدین نے دونوں پڑوسی ملکوں کے ادبی وعلمی و صحافتی احوال کا جائزہ لیا ہے اور دونوں ملکوں سے چھپنے والے رسائل، علمی جرائد اور اخبارات کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے۔اس کتاب میں دونوں ملکوں کی اہم ادبی شخصیات کے نام اور ان کے علمی کارنامے بھی شامل ہیں۔اس میں مؤلف کی محنت ومشقت اور ارض مقدس وموعود سے ان کی محبت صاف نظر آتی ہے۔آپ نے دونوں ملکوں کی تاریخ کے ہر باب کو روشن کیا ہے، اور آنے والی نسلوں، ادیبوں اور محققین کے لیے ایک انمول سرمایہ چھوڑ گئے ہیں۔

ان کی ایک اور تحقیقی کتاب کا نام ہے 'الجراد فی التراث العربی' (عربی تہذیب وتاریخ میں ٹڈی)، یہ کتاب میں ایک بہت ہی اہم اور وقیع اضافہ ہے۔اس میں انھوں نے قرآن کریم میں مذکور بنی اسرائیل پر نازل کیے گئے ٹڈیوں کے عذاب سے لے کر، دیگر اہم کتابوں میں اس پرندے کا ذکر کہاں کہاں اور کیسے کیسے آیا ہے، اسے بھی نہایت ہی مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔یہ کتاب علامہ دمیری کی 'حياة الحيوان' سے اس معنی میں مختلف ہے کہ علامہ دمیری نے اپنی کتاب میں تمام جانوروں، چرند پرند ودرند اور ان کی خصوصیات کا اجمالی ذکر کیا ہے،مگر کسی ایک پرندے پر مکمل ایک کتاب لکھ دینا اور اس کے متعلق نہایت اہم معلومات جمع کرنا یہ ناصرالدین الأسد کی ایک لاجواب ولازوال تحقیق قرار دی جاسکتی ہے۔

عربی ادب کے ذخیرے میں جو اہم اضافے اس اردنی ادیب نے کیے ہیں ان میں سے ایک کتاب کا نام ہے "القيان والغناء فی العصر الجاهلی" (جاہلی دور میں مجرا اور رقص وسرود کی محفلیں) یہ کتاب زمانہ جاہلی کے احوال اور اس معاشرے کی بہترین عکاسی کرتی ہے اور اُس عہد کی اس شاعری کو جاننے میں بہت معاون ہے جو عموماً عربی ادب کے نصاب تدریس میں شامل نہیں ہے۔اس میں صاحب کتاب نے زمانہ جاہلی میں موجود طوائفوں، باندیوں اور مغنیوں کا ذکر کیا ہے، اور ان کی مکمل تفصیلات جمع کی ہیں۔

عرب اکثر صحرا میں نکل جاتے، وہاں ریت میں خیمہ تان کر شراب کی محفلیں جماتے اور یہ مغنیہ مسحور کن الفاظ میں انھیں گانے سناتیں، یہ عورتیں اگرچہ سماج میں کم حیثیت تھیں اور دیگر شریف زادیوں وآزاد عورتوں کی طرح محترم نہیں تھیں،مگر ان کے گانوں کے ذریعے بھی عربی شاعری کا ایک حصہ ہم تک پہنچا اور ان کی یادداشت کی بدولت محفوظ رہ سکا ہے۔اس شاعری میں استعمال ہونے والے مفردات، الفاظ وتراکیب وغیرہ یقیناً عربی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ناصرالدین الأسد سے قبل کسی نے ان طوائفوں ومجرا کرنے والیوں کے اشعار اور ان کے احوال وکوائف جمع نہیں کیے تھے۔ ہندوستانی محققین میں سے وہ جن سے متاثر تھے اور جن کے علمی کاموں سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، ان میں ڈاکٹر حمید اللّٰہ حیدرآبادیؒ، عبد العزیز میمنیؒ، امتیاز علی خاں عرشیؒ، ٹیگور، نہرو و گاندھی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔خلاصۂ کلام یہ کہ اپنی علمی وتحقیقی کاوشوں کے لیے شاہ فیصل انعام یافتہ یہ اردنی محقق وادیب یقیناً اس لائق ہے کہ ہر علمی و ادبی طبقہ اسے جانے اور اس کی تحقیقات وتخلیقات کا اردو و دیگر زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔

مصادر ومراجع:

مصطفیٰ صادق رافعی،تحت رایۃ القرآن۔
انور الجندی، محاکمۃ فکر طہ حسین۔
پروفیسر خالد حامدیؒ، تاریخ ادب عربی۔
محمد الخضر حسین، نقض کتاب فی الشعر الجاہلی۔

■

Faisal Nazir
Research Scholar, Dept of Arabic
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:9818697294

رمیشا قمر

میں اپنے افسانوں کے ہر کردار میں خود جیتا ہوں

جن شخصیات نے پچھلی چند دھائیوں میں اردو فکشن میں نمایاں مقام حاصل کیا ھے ان میں نورالحسنین کا نام بے حد اہم ھے۔ نورالحسنین جنوبی ہندوستان کے ان گنے چنے ادیبوں میں سے ایک ھیں جو شمالی ہندوستان میں بھی یکساں طور پر مقبول ھیں۔ جو ایک نئے رنگ و آھنگ کے ساتھ ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کر رھے ھیں۔ انھوں نے ناول بھی خلق کیے اور افسانے بھی ان کے قلم سے، تنقیدی تحریریں بھی وجود میں آئیں اور ڈرامے بھی، ادب اطفال کو بھی موضوعِ بنایا اور نصابی کتابیں بھی لکھیں، ادبی صحافت اور براڈ کاسٹنگ کے میدانوں سے بھی وابستہ رھے اور حالات حاضرہ پر تجزیہ نگاری بھی کی۔ ان پر مختلف یونیورسٹیوں میں ایم۔ فل اور پی۔ ایچ ڈی کے مقالے بھی لکھے جاچکے ھیں۔

رمیشا قمر: نورالحسنین صاحب! پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ کا اصل میدان ادب ہے یا ریڈیائی صحافت؟ کیونکہ میں آپ کو دونوں ہی میدانوں میں کافی فعال دیکھتی آئی ہوں یہ سوال میں اس لیے بھی پوچھ رہی ہوں کہ چونکہ آپ ادب اور میڈیا سے یکساں طور سے جڑے رہے ہیں تو آپ بہتر طور پر سمجھا سکیں گے دونوں میں کیا رشتہ ہے؟

نورالحسنین: قمر صاحبہ شکریہ، دراصل میں سب سے پہلے ڈرامے سے جڑا ہوا تھا، پانچویں جماعت ہی سے میں اسٹیج ڈراموں میں کام کیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اورنگ آباد میں اسکولوں کے علاوہ کئی گروپس تھے جو ہر مہینے یا دو مہینے میں ڈرامے اسٹیج کیا کرتے تھے۔ مجھے ان میں کام کرکے بڑی مسرت ہوتی تھی اور اکثر انعام اول پر میرا قبضہ رہتا تھا۔ اسی ڈرامے کی وجہ سے میں نے ادب پڑھنا اور لکھنا شروع کیا تھا میں نے خود اپنا تعارف اپنی ایک کتاب 'انسان امر ہے' میں ان الفاظ میں کروایا تھا۔

''ڈرامہ میری پہلی شناخت ہے لیکن بحیثیت ڈرامہ نگار نہیں بلکہ ڈرامہ آرٹسٹ۔ اسی آرٹسٹ نے مجھ سے کئی کام کروائے، بچپن میں شرارتیں، تو بامعنیٰ گفتگو کی چاہ نے مطالعے کا شوق پیدا کیا، جوانی میں قدم رکھا تو وہ سارے اسرار مجھ پر کھول دیے جس کا سحر مقابل کو باندھے رکھتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے افسانہ نگار بنانے میں بھی اسی آرٹسٹ کا ہاتھ ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے افسانوں کے ہر کردار میں خود جیتا ہوں، جوجھتا ہوں، الجھتا ہوں، کبھی سمٹ جاتا ہوں اور کبھی بکھر جاتا ہوں۔''

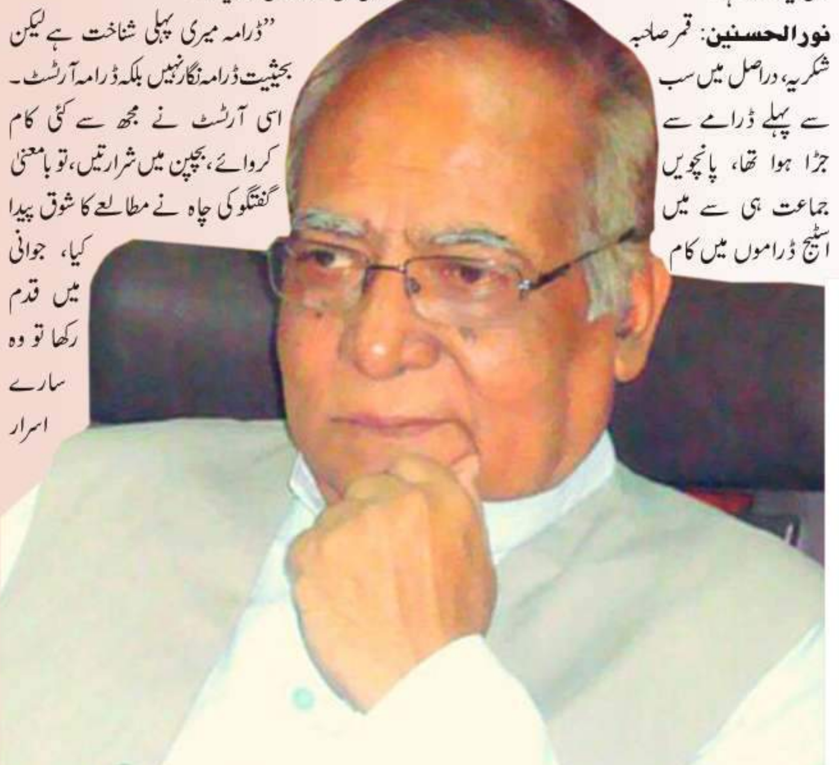

یہ بھی سچ ہے کہ میں ادب اور میڈیا سے جڑا رہا، ریڈیو سے بہت پہلے میں اخبارات سے وابستہ ہوا اور ڈیلی ایک مزاحیہ کالم برسوں تک لکھتا رہا، لیکن میں نے پوری کوشش کی کہ میڈیا کے اثر سے اپنے ادب کو محفوظ رکھ سکوں۔ میری ریڈیو میں ملازمت نیوز سیکشن میں نہیں بلکہ پروگرام سیکشن سے متعلق تھی جس میں ادبی پروگرام، ڈرامہ، ادبی اشخاص سے انٹرویو، ایسے پروگرام ترتیب دینا جو اصلاحی ہو، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میڈیا کی ملازمت کی وجہ سے وہی موضوعات افسانے اور ڈراموں میں در آتے ہیں۔ میں نے اس قسم کے موضوعات سے احتیاط برتی لیکن ریڈیو میں برتی جانے والی تکنیک کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں ضرور برتا ہے۔ جیسے Echo، فلیش بیک اور فلیش فارورڈ تکنیک، کرداروں کے مکالموں میں برجستگی، چستی، اور کم سے کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنا وغیرہ۔ ریڈیو کا ادب سے گہرا رشتہ ہے۔ بلکہ ادب ہی ریڈیو کی خوراک ہے۔ میں نے ریڈیو کو ایک نئی چیز بھی دی جسے ہم لوگ ریڈیائی فلمیں کہتے تھے۔

ر ق: تو ڈرامے نے آپ کو ادب سے قریب کیا، جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ بچپن ہی سے بہت ہی فعال رہے ہیں۔ حسنین صاحب ویسے تو آپ نے افسانے اور ناول دونوں میں طبع آزمائی کی ہے مگر اچانک آپ کی توجہ افسانے سے ہٹ کر ناول پر کیوں مرکوز ہوگئی؟ میرے

سوال کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے افسانے پر کم اور ناول پر اپنی توجہ بڑھادی ہے؟

ن ح: ریشا صاحبہ، میں شروع ہی سے افسانہ نگاری کے علاوہ، ڈرامہ نگاری، ریڈیو کے لیے مختلف فیچرز، خاکہ نگاری اور تنقیدی مضامین بھی لکھتا رہا ہوں، چونکہ میرے افسانے قدرے طویل ہوتے ہیں اس لیے ناول لکھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا، میرے ذہن میں جیسے ہی ناول 'آہنکار' کا موضوع آیا میں نے لکھنا شروع کر دیا اور وہ ناول کلک ہوگیا تو ایک حوصلہ بن گیا کہ میں کوئی بڑا ناول بھی لکھ سکتا ہوں، یہ بات مجھ سے میرے بڑے بھائی حمایت علی شاعر نے بھی کہی تھی اور پھر میرے دوست مشرف عالم ذوقی نے بھی اصرار کیا تھا، بس اسی کا نتیجہ ہے کہ میں نے ناولیں لکھنا شروع کیا جن کے باعث مجھے خاصی شہرتیں ملیں، رہی افسانہ نگاری تو وہ تو جاری رہی۔

د ق: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ افسانوی صنف ناول اس وقت زیادہ اہم ہوگیا؟

ن ح: یہ تو شروع ہی سے طے ہے۔ افسانے کا کینوس محدود ہوتا ہے جب کہ ایک ناول کا مقصد کاغذ کی سطح پر پوری ایک بستی کو تمام تر تاریخی و جغرافیائی حدود، بازار ہاٹ، بولی ٹھولی کے ساتھ آباد کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح ناول کا کینوس وسیع تر ہوتا ہے۔ ناول ایک ایسی تخلیق ہے جو دیرپا ہے۔ میں ایک ہی مثال دیتا ہوں عالمی شہرت یافتہ ادیبہ قرۃ العین حیدر نے افسانے بھی بہت سارے لکھے ہیں لیکن جب بھی ان پر گفتگو ہوتی ہے تو ان کے ناولوں پر ہی ہوتی ہے۔ اور آج نہ صرف ناول پڑھے جارہے ہیں بلکہ ان پر مکالمہ بھی قائم ہورہا ہے، رسائل ناولوں پر اپنے نمبر شائع کر رہے ہیں، مختلف احباب ناول نگاری پر کتابیں بھی مرتب کر رہے ہیں۔

د ق: جی بالکل ایسا لگتا ہے کہ یہ صدی ہی ناول کی صدی ہے... یہ بتائیں کہ مختصر افسانہ اور ناول میں آپ خود کو کہاں کمفرٹیبل محسوس کرتے ہیں؟ یہ سوال آپ سے اس لیے بھی بنتا ہے کہ آپ نے درجنوں افسانے لکھے ہیں اور آپ کے ناولوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے؟

ن ح: مجھے نثر کی کسی بھی صنف کو لکھنے میں دقت نہیں آتی۔ افسانہ تو عموماً میں ایک ہی بیٹھک میں لکھ لیتا ہوں، اور کچھ دن تک اسے ہاتھ نہیں لگاتا کہ وہ میرے ذہن سے اتر جائے۔ بعد میں جب میں اسے پڑھتا ہوں تو وہ نظریں بڑی بے مروت ہوتی ہیں اور جو تبدیلیاں مجھے کرنی ہوتی ہیں وہ میں کر لیتا ہوں، جہاں تکلف کے آنے کی بات ہے تو وہ مجھے ناول لکھتے وقت محسوس ہوتی ہے۔ ناول کی لکھائی جب شروع ہوتی ہے تو ناول مسلسل ذہن میں چلتا رہتا ہے اس وقت کوئی دوسرا خیال ذہن میں نہیں آتا ہے، حتیٰ کے ان دنوں میں نہ کوئی افسانہ پڑھتا ہوں نا کسی ناول کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ بس ذہن پر ناول سوار ہوتا ہے اور اس کے موضوع سے متعلق جو مواد ممکن ہوسکتا ہے اس کی تلاش رہتی ہے اور جس دن وہ مکمل ہوجاتا ہے تو ایک طرح کی عجیب سی مسرت ہوتی ہے۔

د ق: بہت خوب جناب! حسنین صاحب 'آہنکار، ایوانوں کے خوابیدہ چراغ، چاند ہم سے باتیں کرتا ہے، اور تلک الایام یہ جو آپ کے ناول ہیں ان کے موضوعات بھی مختلف ہیں اور ہر ایک کی زبان بھی الگ محسوس ہوتی ہے مجھے تو یہ سبھی پسند ہیں مگر آپ ان میں سب سے بہتر کسے سمجھتے ہیں۔ اپنی پسند کے اسباب پر بھی روشنی ڈالیں پلیز؟

ن ح: سچ پوچھو تو ابھی وہ ناول میں نے لکھا ہی نہیں، مجھے بھی اس ناول کا انتظار ہے۔ میرا ایک طریقہ ہے جب تک میرا کوئی ناول یا افسانہ شائع نہیں ہوتا، تب تک میں اس پر محنت کرتا رہتا ہوں اور جب وہ چھپ جاتا ہے تو میں اس کے سحر سے نکل جانے کی کوشش کرتا ہوں، اور چھپ جانے کے بعد پھر اسے نہیں پڑھتا۔ آپ نے پوچھا کہ ہر ناول کی زبان بھی الگ ہوتی ہے اور موضوع بھی مختلف رہتا ہے۔ تو عرض کروں کہ ہر وہ ادیب جس کا مطالعہ خوب ہو، جس کا مشاہدہ وسیع ہو، جو زندگی کے مختلف تجربات سے گزرا ہو، اسے کوئی چیز لکھتے وقت پریشانی نہیں ہوتی۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ناول کا موضوع اور جس علاقے پر وہ لکھا جارہا ہو، وہی خود اس کی زبان طے کرتا ہے، معاشرہ بناتا ہے، کردار سجھاتا ہے، ان کی نفسیات بھی طے کرتا ہے ان کے عمل اور ردعمل تیار کرتا ہے۔ اب ناول نگار کا کام ہے کہ وہ خود اس نہج پر کام کرے، 'آہنکار' کے لیے میں نے مراٹھواڑہ کے دیہات پیپری چینا راجہ اور تعلقہ کنڑ کا انتخاب کیا تھا، اس کے لیے میں بار بار گاؤں گیا تا کہ وہاں کی بولی ٹھولی، کھیتی کرنے کے طریقے، کس موسم میں کھیتوں میں کیا کام ہوتا ہے۔ کھیتی کے اوزار، ان کے نام جاننے کی کوشش کی، اسی ناول میں لوہار کی بھٹی میں کلہاڑی بنانے کا طریقہ، گھن مارنے کا انداز، بھاتہ کیا ہوتا ہے جب آگ بنا ہوا لوہا کسی اوزار کی شکل میں ڈھلتا ہے تو اور اسے پانی میں ڈالا جاتا ہے تو اس کی آواز اور خود لوہار کا عمل کیا ہوتا ہے۔ اس کی خاطر میں لوہار کی بھٹی میں گھنٹوں بیٹھا تا کہ میرا مشاہدہ درست ہو، ہر ناول کے موضوع کے حساب سے ان کتابوں کو تلاش کرنا اور اسے پڑھنا اور ان کے نوٹس بنانا اور پھر اسے فکشن میں ڈھالتا تھا۔ یہی محنت ناول کی لفظیات بھی طے کرتی ہے۔ میں نے تو افسانوں کے لیے بھی ہمیشہ یہی کوشش کی جس موضوع پر ایک بار لکھ دیا دوبارہ نہیں لکھا، اور اگر کبھی دہرانے کی نوبت بھی آئی تو اس کی تکنیک، اور اسلوب اتنا مختلف ہو کہ وہ نیا ہی محسوس ہو سکے۔

د ق: حسنین صاحب موضوعات اور زبان و بیان کے تعلق سے بہت ہی مدلل جواب بہت شکریہ... اور ایک اہم سوال، آپ کا تعلق دکن سے ہے اور مجھے یقین ہے کہ دکن والوں کے لیے شمال والے جو رویہ رکھتے ہیں اس کا احساس آپ کو بھی ہوگا، اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ادھر احساس برتری کیوں ہے اور ہم میں سے بہت سے لوگ احساس کمتری کا شکار کیوں ہوجاتے ہیں؟ شمالی ہندوستان کے بہت کم رائٹرز ہیں جو دکن کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں اور جو دکن کے ادب پر معروضی رائے دیتے ہیں۔ ہاں کچھ لوگ ضرور ہیں جو اہل دکن کی بھی قدر کرتے ہیں، جیسے ابھی ابھی غضنفر صاحب نے مثنوی 'قمر نامہ' لکھی تو اس میں انھوں نے دکن کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا ہے اور تفصیل سے ابتدا سے اب تک کے ادیبوں کا ذکر نہایت خلوص اور محبت سے کیا ہے لیکن ایسے بہت کم لوگ ہیں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ن ح: آپ کا سوال یا شکایت بہت حد تک درست ہے۔ لیکن اب یہ فضا چھٹ رہی ہے۔ البتہ پہلے یہ کام دیدہ

دانستہ کیا جاتا تھا۔ جس زمانے میں ریاست حیدرآباد تھی۔ اور یہاں کے بادشاہ نواب میر عثمان علی خان تھے تو انھوں نے شمال کے تقریباً ہر بڑے ادیب وشاعر کو نہ صرف نوزا بلکہ ان کے ماہانہ وظائف بھی مقرر کیے، ان کی کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی مدد دی، لیکن ان لوگوں نے دکن کے کتنے شاعروں وادیبوں پر مضامین لکھے، اور اگر لکھے بھی تو بحکم صاحبِ اقتدار، خود مولوی عبدالحق بابائے اردو نے یہاں کے تذکروں کو شائع کرنے کے بجائے انھیں منتخب کیا جنھیں وہ چاہتے تھے۔ آپ کو علم ہوگا کہ بابائے اردو کا خطاب انھیں سرکاری کی جانب سے نہیں بلکہ میرے شہر اورنگ آباد کے ایک طالب علم نے انھیں کہا تھا اور یہ خطاب بن گیا اور سارے برصغیر میں پھیل گیا۔ میں اپنی بات کروں تو بحیثیت افسانہ نگار مجھے سب سے پہلے ریاست بہار نے قبول کیا، اسی لیے میرے دوستوں کی تعداد بہار ہی میں ہے کن کن کے نام لوں، شوکت حیات، حسین الحق، عبدالصمد، مشتاق احمد نوری، شموئل احمد، سید احمد قادری، احمد صغیر اور فخر الدین عارفی وغیرہ۔ اسی لیے بہار میرے دل میں بستا ہے۔ دکن کے فنکاروں کو نہ تو احساس کمتری ہے اور نا ہی احساس برتری، ہاں ان میں انکساری اور مروت ہے۔ خود انھوں نے بھی شمال کی طرف نہیں دیکھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن کا علاقہ اتنا بڑا تھا کہ اگر ریاست ہی میں نام ہوجائے تو یہی ان کے لیے بہت تھا۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں نئی نسل کے افسانہ نگار شمالی ہند میں انگلیوں پر گنے جانے کے برابر تھے، تب انھوں نے ممبئی کے افسانہ نگاروں کو گود لیا تھا، لیکن جب بہار سے افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ دہلی اور شمال میں آباد ہوا تو پھر انھوں نے ممبئی کے افسانہ نگاروں سے اپنی گود خالی کرلی، کیونکہ اب بہار سے آنے والے قلم کار وہاں موجود تھے۔ آپ نے سوال میں شمال کے حوالے سے غضنفر صاحب کا نام لیا ہے تو عزیزہ ان کا تعلق بھی ریاست بہار ہی سے ہے۔

جیسا میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ اب فضا بدل گئی ہے مجھ پر کم وبیش سبھی نے لکھا ہے۔ پھر بھی میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، نگار عظیم، صغیر افراہیم، ارتضی کریم، خواجہ اکرام الدین وغیرہ کا مشکور ہوں۔

ر ق: جی اس تفصیلی جواب سے خوشی ہوئی! میں بھی مانتی ہوں کہ آپ کی تحریریں ہی لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتی ہیں خود میری کتابوں پر سید محمد اشرف، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی وغیرہ نے لکھا ہے اس کے باوجود اس حوالے سے حسنین صاحب ایک بات اور ذہن میں آرہی ہے، کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں کہ مرکز حاشیوں پر حاوی ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا حاوی ہوتا ہے کہ حاشیے سے ابھرنے والی تیز روشنی بھی دکھائی نہیں دے پاتی ؟

ن ح: دیکھیے مرکز با اختیار ہوتا ہے، اور زیادہ تر نقاد کبھی شمال میں ہی رہتے تھے۔ وہاں ہونے والی ادبی محفلوں میں آپس میں ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یہ قربتیں ایک فنکار اور نقاد کو قریب تر کردیتی ہیں تو پھر اس کی نگاہیں حاشیوں تک نہیں جاتیں، سچ پوچھو تو اسی بے نیازی نے علاقائی فطرت کا بیج بویا اور تنقید دوستی، علاقائیت میں منقسم ہوگئی، اور آج ناموں کی کھتونی دیکھ کر ہی ناقد کے علاقے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ آپ کی یہ بات بھی درست ہے کہ دور دراز کے قلمکاروں پر نظر بھی نہیں جاتی اور نا ہی وہ اپنی تخلیقات کو تواتر سے شائع کرتے ہیں۔ ان کا علاقہ تو ان کے کام سے واقف ہوتا ہے لیکن مرکز تک ان کا کام نہیں پہنچتا۔ یہ بھی ایک سبب ہوسکتا ہے، لیکن جو قلم کار اپنی تخلیقات کو پھیلاتے ہیں وہ تو روشنی میں آ ہی جاتے ہیں۔ اس لیے سارا الزام مرکز پر لگانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ایک بات اور سو کروڑ کی آبادی میں اگر ہم اردو طبقے کی کم سے کم آبادی پانچ لاکھ بھی تصور کرلیں تو ہماری کتابیں تین سو کی تعداد میں آج چھپتی ہیں تو یہ کتابیں کتنے لوگوں تک پہنچیں گی، جو ادبی رسائل ہیں ان کی تعداد بھی پانچ چھ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی تو ایک المیہ ہے۔

ر ق: جی بالکل صحیح !! میرا طریقہ کار یہ ہے کہ میں تخلیق کار سے اس کے تخلیقی پروسیس کو بھی جاننا چاہتی ہوں اس لیے کہ تخلیقی پروسیس سے تخلیق کار کی تخلیقات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اس کی قدر و قیمت کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔ میں نے پچھلے انٹرویو میں بھی تخلیق کے حوالے سے سوال کیے تھے جس سے اس فن کار کے فن کو سمجھنے میں رہنمائی بھی ملی۔ چونکہ میرے نزدیک آپ اہم ہونے کے ساتھ ساتھ میرے پسندیدہ فکشن نگاروں میں شامل ہیں اور میں آپ کے فن کو بھی اچھی طرح سمجھنا چاہتی ہوں اس لیے آپ سے آپ کے تخلیقی عمل پر گفتگو کرنے کی درخواست کررہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا جواب آپ کے فن کے راستے میں مشعل راہ ثابت ہوگا ؟

ن ح: ریشا صاحبہ کچھ باتیں تو میں اوپر بیان کرچکا ہوں۔ میں خاص طور پر ناول لکھتے وقت چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی بہت غور وخوض کرتا ہوں۔ مثلاً ناول 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' کے منظر نامے کے لیے میں دوبار دہلی گیا تھا اور لال قلعہ کے اندرون کی نہ صرف تصویریں اور نوٹس بنا کر لایا تھا بلکہ دہلی کے مختلف علاقوں میں بھی گھوم کر آیا تھا، پھر میں نے اس موضوع پر کم سے کم پچیس کتابوں، روز نامچوں کا مطالعہ کیا تھا۔ قدیم نقشوں کی مدد سے پرانے راستوں کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ دلی کی بیگمات کی زبان کے لیے پرانی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، اسی طرح لکھنؤ کے بانکوں کی زبان، ان کے لباس، وہاں کے اس زمانے کے حکیم اور کوٹھوں کے محل وقوع کے لیے عبدالحلیم شرر کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' کا مطالعہ کیا، جنگ کے مناظر کے لیے بھی میں نے جنگی نقشے تلاش کیے اور پھر اسی مناسبت سے کاغذ پر فوجوں کو ترتیب دیا تھا۔ ان ساری باتوں کے میں نوٹس بناتا تھا اور رات کو اسے فکشن میں ڈھالتا تھا۔

ناول 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' اس میں موجود ہر داستان کے لیے وہاں کے محل وقوع اور وہاں کی معاشرت کی اسٹڈی کی، تاریخ اور جغرافیہ کا مطالعہ کیا، ہر علاقے کی مناسبت سے وہاں کے کھیت کھلیان، درخت، پھول، پھل، لباس کو بھی جاننے کی کوشش کی۔ پہلی داستان جس کا تعلق دراوڑ نسل سے ہے میں نے ان کے ماحول کو جاننے کی خاطر قدیم پینٹنگ کا سہارا لیا، آریوں کی رومانی کہانی ترتیب دیتے ہوئے میں ان کے مذہبی عقائد، رہائش، ان کے انتظامی اصول اور پھر ایک رومانی قصے کو قلم بند کیا، جس وقت میں مدھیہ پردیش کی رومانی داستان 'باز بہادر اور روپ وتی' پر کام کرنے لگا تو میں چاہتا تھا کہ وہاں کی مخصوص بولی کو استعمال کروں جو مجھے نہیں آتی تھی۔ اس کی خاطر میں نے اپنے دوست اور مشہور افسانہ نگار خورشید حیات سے فون پر بات کی جو اس وقت مدھیہ پردیش میں رہتے تھے میں ان سے کسی ایسی کتاب کی بابت جاننا چاہتا تھا جس کی مدد سے میں وہ بولی سیکھ سکوں تو انھوں نے مشورہ دیا کہ میں وہاں کی لوک گائیکی کو سنوں چنانچہ میں نے ہفتہ بھر وہ فوک گائیکی سنا اور اس کے بعد اسے لکھنے کی کوشش کی، کلاسیکی گائیکی کو استعمال کرنے کے لیے حضرت امیر خسرو کی گائیکی پر مرتب کی ہوئی کتاب حاصل کی اور اس کی بندشوں کو استعمال کیا، اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جب میرا ہوم ورک پورا ہوگیا تو میں نے پھر اس ناول کو تکمیل تک پہنچایا۔ یہی سب کچھ میں اپنے افسانوں کے لیے بھی کرتا ہوں۔

ر ق: تو یہ ہے آپ کی کامیابی کا راز... ایک کامیاب کہانی کے لیے ستر کنویں جھانکنے پڑتے ہیں۔ حسنین صاحب ہر علاقے کی اپنی علاقائی زبان کی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ آپ اپنی نگارشات میں علاقائی زبان کو اہمیت دیتے ہیں یا ان سے گریز کرتے ہیں، اگر استعمال کرتے ہیں تو کیوں اور گریز کرتے ہیں تو کیوں؟ برائے کرم اس پر کچھ

روشنی ڈالیں؟

ن ح: جب بھی کبھی اپنے علاقے سے متعلق افسانہ لکھنا ہوتا ہے تب میں ضرور استعمال کرتا ہوں، بلکہ علاقائی زبانوں میں مکالمہ نگاری کرتے وقت لطف بھی ہوتا ہے۔ ویسے میرے افسانے مختلف ماحول اور ان کی بولیوں ٹھولیوں کے ساتھ ہیں۔

د ق: ایک سوال یہ بھی کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب کچھ لوگ یہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے لیے لکھتے ہیں۔ خاص طور پر جدیدیوں نے اس طرح کا جواب دیا، دوسرا جواب یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھتے ہیں جیسا کہ ترقی پسندوں کا جواب تھا مجھے امید ہے کہ نورالحسنین کا جواب ممکن ہے کچھ اور ہو؟

ن ح: عزیزی ریشا!! بظاہر یہ بڑا مشکل سوال ہے لیکن اتنا ہی آسان بھی ہے میں قاری کے لیے لکھتا ہوں کیونکہ میرے قاری مجھے پڑھنا چاہتے ہیں اگر کچھ ماہ میں خاموش رہ جاؤں تو مجھے ان کے فون اور خطوط آنے لگتے ہیں۔ کیونکہ میرے افسانوں میں کوئی راست پیغام نہیں ہوتا بلکہ افسانے کا بطن اسے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ بہر حال کوئی اچھا افسانہ ہو جائے تو مجھے بھی تسکین ملتی ہے۔

د ق: بہت خوب!! اچھا یہ بتائیں کہ تخلیقی اظہار کے لیے کس طرح کی زبان ہونا چاہیے؟

ن ح: میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ تخلیق خود اپنی زبان لے کر آتی ہے، اور افسانہ آفاقیت کی بات نہیں کرتا زمین کی بات کرتا ہے، میں اس سلسلے میں میر کا مقلد ہوں کہ پر مجھے گفتگو عوام سے ہے۔ میرا خیال ہے یہی تخلیقی زبان ہو سکتی ہے۔

د ق: بالکل گفتگو تو بہر حال عوام سے ہی ہے!! اردو ادب کے موجودہ منظرنامے سے آپ مطمئن ہیں یا نہیں؟ میری مراد یہ ہے کہ آج جو کچھ لکھا جا رہا ہے یا لکھا گیا ہے وہ آپ کی نظر میں اطمینان بخش ہے یا نہیں، اگر جواب مدلل اور منطقی ہو تو اردو قارئین کو سمجھنے میں اور موجودہ صورت حال کو جاننے میں آسانی ہو سکتی ہے؟

ن ح: دیکھیے ہر دور میں اچھا برا ادب لکھا جاتا رہا ہے۔ وہی ادب باقی رہتا ہے جو اچھا لکھا گیا ہو۔ یہی کیفیت اس دور کی بھی ہے۔ لیکن میں پھر بھی سوچتا ہوں، آج ادب جو تخلیق ہو رہا ہے یہی بہت بڑی بات ہے۔ ذرا غور کیجیے آج کون لوگ اپنے بچوں کو اردو پڑھا رہے ہیں؟ امیر طبقے کے بچے انگریزی میڈیم میں پڑھتے ہیں۔ متوسط طبقے کے افراد بھی بہتر مستقبل کی چاہ میں اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم ہی میں داخل کرتے ہیں۔ اب باقی رہتا ہے غریب طبقہ، جو اردو میڈیم اسکولوں سے بندھا ہوا ہے۔ پہلے شعر و سخن کی محفلوں میں لوگ اس لیے شرکت کرتے تھے کہ کچھ سیکھنے کو ملے گا، آج بھی لوگ آتے ہیں لیکن ہلڑ مچانے کے لیے۔ آپ سمیناروں کا حال دیکھیے ان میں کتنے نوجوان شریک ہوتے ہیں؟ نئی نسل کی تربیت کے لیے نہ اب ہوٹلوں میں ہونے والی ادبی گفتگو کے مواقع ہیں نا ہی اسکول کالجوں میں کوئی ان کی تربیت کرتا ہے۔ اب ایسے دور میں جو بھی لکھا جا رہا ہے میں اسے غنیمت جانتا ہوں بلکہ اس امید پر ان کی ہمت افزائی بھی کرتا ہوں کہ آج نہیں تو کل یہ لوگ اچھا لکھنے لگیں گے۔ اگر ہم ان پر تنقید کریں تو یہ جو کچھ نئے نوجوان آ رہے ہیں وہ بھی بھاگ جائیں گے۔ اس کے باجود کچھ نوجوان بہت اچھا لکھ رہے ہیں ان کی تخلیقات پڑھ کر خوشی اور اطمینان بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی زوال آمادہ دور میں کچھ نہ کچھ ایسے ادیب و شاعر نکل آتے ہیں جو زبان و ادب کو بہت کچھ دے جاتے ہیں۔ آج لاکھ مایوسی کا دور ہو لیکن ہمیں مستقبل سے اچھی امیدیں رکھنا چاہیے۔

د ق: جی ٹھیک کہا آپ نے کہ ہمیں مستقبل سے اچھی امیدیں رکھنی چاہیے۔ مگر جہاں تک میں نے دیکھا جانا اور سمجھا ہے میری دانست میں مجھے لگتا ہے کہ اب صرف امیدیں وابستہ کرنے کا دور نہیں ہے بلکہ ہمیں عملی طور پر میدان میں آنا ہے اور اپنی زبان کے تحفظ اور اس کے ارتقا کے لیے ہر فرد کو اپنا رول ادا کرنا ہوگا۔ حسنین صاحب ہماری جو نئی نسل ہے، وہ ادب تخلیق تو کرنا چاہتی ہے لیکن ایسا لگتا ہے وہ بہت عجلت میں ہے اسی لیے بعض نئے لکھنے والوں کی تحریروں میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں ہماری نئی نسل ایسا کیوں کر رہی ہے اور اس سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ صرف نئی نسل ہی نہیں بلکہ بعض سینئر کے یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

ن ح: قمر صاحبہ! یہ آپ کی نسل کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جو بھی نسل ابتدا میں قلم تھامتی ہے وہ عجلت کا شکار ضرور ہوتی ہے۔ پکی سیاہی میں اپنا نام دیکھنے کی خواہش اور اپنے ہم عمروں میں امتیاز حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ہم ان سے امید رکھ سکتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھے گا اور ان کا تجربہ آگے بڑھے گا، ان کا شعور بیدار ہوگا وہ راہِ راست پر آ جائیں گے۔ زبان و بیان میں غلطیوں کی ایک وجہ یہ ہے کہ ذہن میں جو تلفظ ہوتا وہی روانی میں لکھا جاتا ہے اس کے لیے تلفظ صحیح ہونا چاہیے۔ دوسری وجہ مطالعے کی کمی ہے۔ نئی نسل کو خوب مطالعہ کرنا چاہیے اور لکھنا بھی چاہیے۔ تعریفیں اکثر گمراہ کرتی ہیں اسے بھی انھیں سمجھنا چاہیے۔ رہی بات سینئرز کی تو انھیں چاہیے کہ وہ اس پر توجہ دیں۔

د ق: یہ بڑے قلم کاروں کا وطیرہ رہا ہے ان کی اعلی ظرفی ہے جس کا اس وقت میں عملی ظاہرہ دیکھ رہی ہوں آپ کا تعلق چونکہ میڈیا سے بھی رہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے جڑے رہے۔ جہاں بہت سی سرگرمیاں ہوتی ہیں مگر دباؤ بھی ہوتا ہے تو کیا آپ نے اپنی تحریروں میں اس دباؤ کو بیان کیا ہے؟

ن ح: یہ بالکل سچ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے اپنے کچھ اصول ہیں جن کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔ میں نے ریڈیو کے بے شمار ڈرامے اور فیچرز کے ساتھ ہی ساتھ تقریباً کلاسیکی ادب کو ڈرامہ ٹائز کیا ہے۔ جو تیرہ تیرہ اپی سوڈ پر مشتمل ہوتا ہے ان میں میں نے لیڈ رول بھی کیے۔ لیکن میں نے ریڈیو سے کبھی اپنا افسانہ نشر ہی نہیں کیا تو میرے ادب میں دباؤ کہاں سے آتا اور میں اس کا کیا اظہار کرتا؟

د ق: جی شکریہ! ایک سوال آپ سے یہ بھی ہے کہ نئے ذرائع ابلاغ سے اردو زبان کو فائدہ پہنچ رہا ہے یا نقصان؟

ن ح: عزیزہ! دونوں باتیں ہیں مگر میرا خیال ہے نقصان ہی زیادہ پہنچ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے خطوط نگاری کی صنف کو سب سے زیادہ نقصان بلکہ اس کا خاتمہ ہی ہو گیا ہے۔ پھر فیس بک اور واٹس ایپ پر ہم انگریزی کے ذریعے اپنی بات لکھتے ہیں اس کی وجہ سے بھی ہمارا معاملہ خراب ہوا ہے۔ پہلے کبھی فلموں میں اردو کا خوب استعمال ہوتا تھا۔ اب اس کی جگہ پنجابی لے رہی ہے۔ اداکار اردو زبان سے واقف نہیں ہیں انھیں مکالمے انگریزی الفابیٹ کی مدد سے لکھ کر دینا ہوتا ہے، گانوں میں بھی اب عجیب عجیب الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ وہ جو پرانی فلموں میں گانوں کے ساتھ ہی مکالموں کی جادو بیانی تھی اب کہاں ہے؟

د ق: سوشل میڈیا نے ادب کے معیار کو گھٹا دیا ہے ان سائٹس کے ذریعے ہر شخص بڑا ادیب بڑا شاعر اور بڑا نقاد بن گیا ہے۔ حسنین صاحب آپ کا بے حد شکریہ آپ نے میرے سوالوں کا بہت ہی بے باکی، خلوص اور سنجیدگی سے جواب دیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے قیمتی خیالات کو نئے تخلیق کار اپنے لیے مشعل راہ بنائیں گے۔ بہت بہت شکریہ...

ن ح: عزیزہ آپ کا بھی بہت بہت شکریہ۔

د ق: شکریہ۔ اللہ حافظ

■

Dr.Ramisha Qamer
Near Mahindra Showroom
Sedam Road
Kalaburagi - 585105 (Karnataka)
Cell.: 7259673569

نگر نگر اردو

ارشاد احمد

سیوان میں اردو غزل کا ارتقائی سفر

زمانۂ قدیم سے ہی اردو غزل مقبول ترین صنف ِشاعری رہی ہے۔ اس کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہر متبدی شاعر اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے ہی کرتا ہے۔ قدیم شعرا نے اس صنف کو محدود زاویۂ نظر سے دیکھا اور برتا۔ لیکن جدید شعرا نے اس میں ہر طرح کے مضامین کو شامل کر کے اسے حسن و عشق، گل و بلبل، عشوہ و غمزہ اور صنف نازک کی ناز وادا جیسے روایتی اور یک رخی موضوعات سے آزاد کرایا ہے اور مختلف رنگوں اور موضوعات پر اشعار کہہ کر اپنی شاعری کے ایسے کمالات دکھائے کہ نئی نسل کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں میں بھی یہ صنف کافی مقبول ہونے لگی ہے۔ دورِ جدید میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے اس صنف میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اردو کی طرح ہندی، پنجابی، میتھلی، بھوجپوری اور دیگر علاقائی زبانوں میں بھی غزلوں کے مجموعے کثیر تعداد میں شائع ہو رہے ہیں اور مقبول و معروف بھی ہو رہے ہیں۔ یہ صنفِ غزل کے حسن کا کمال ہے۔

علاقائی سطح پر ریاست بہار کو اردو زبان و ادب کے فروغ کے معاملے میں ابتدا سے ہی خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بہار کے شعر و ادب کا سب سے بڑا اختصاص یہ ہے کہ یہ طفیلی نہیں بلکہ مقامی اور اصلی ہے۔ بالخصوص شاعری کے معاملے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کسی غیر کی رہینِ منت نہیں رہی ہے۔ 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' میں اختر اورینوی نے مختلف حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ''بہار کا اردو ادب خالص بہار کا ہے جس سے ساری دنیا کے ادیبوں نے اکتساب فیض کیا ہے۔''

سیوان ضلع بہار کا ایک مردم خیز، ادب نواز اور ادب ساز خطہ رہا ہے۔ عظیم آباد میں شعر و ادب کے آغاز کے ساتھ ہی سیوان میں بھی شاعری اور نثر نگاری کی ابتدا ہوگئی تھی۔ سیوان کی ادبی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں کے متعدد شعراء عظیم آباد، کولکاتا، ڈھاکہ، لاہور، دہلی اور ممبئی جیسے دور دراز ادبی مراکز میں آباد تھے۔ جب یہ قلم کار سیوان آتے تھے تو یہاں کی مقامی ادبی محفلوں کو رونق بخشتے تھے۔ اس کے برعکس متعدد شعرا ایسے تھے جو ہندوستان کے دیگر خطوں سے آکر سیوان میں سکونت گزیں ہوئے اور مقامی شعرا کے ساتھ مل کر ان میں خود اعتمادی پیدا کی، نیز ان کے خلاق و ذہن کو تخلیقی اڑان سے ہموار کیا۔ اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ دونوں طرح کے شاعروں کا تعارف ہو جائے۔

سیوان میں قدیم غزل گوئی کو درج ذیل تین ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ (1) ابتدا تا آزادی (2) آزادی کے بعد 2000 تک اور (3) 2000 سے دورِ حاضر تک۔ اس مضمون میں اوّل الذکر دو ادوار کا تذکرہ ہے۔ سیوان کے قدیم اردو غزل گو شعرا میں برق رانی پوری، امیر حسن رانی پوری، مظہر حسن مظہر، یوسف سیوانی، شام عنایت پوری، قسیم سیوانی، یکتا سیوانی، بسمل سیوانی، شیدا رانی پوری اور علی بہادر خاں بہار وغیرہ شامل ہیں۔ دورِ اوّل کے مذکورہ بالا شعرا نے اردو غزل گوئی کو کوئی خاص مقام و مرتبہ تو نہیں عطا کیا لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو غزل کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ چونکہ صوبہ بہار

> علاقائی سطح پر ریاست بہار کو اردو زبان و ادب کے فروغ کے معاملے میں ابتدا سے ہی خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بہار کے شعر و ادب کا سب سے بڑا اختصاص یہ ہے کہ یہ طفیلی نہیں بلکہ مقامی اور اصلی ہے۔ بالخصوص شاعری کے معاملے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کسی غیر کی رہین منت نہیں رہی ہے۔

کے شعر و ادب پر کسی خاص دبستانِ ادب اور تحریکِ ادب کا اثر نہیں تھا، اس لیے مذکورہ شعراء کی شاعری میں کوئی خاص رجحان، رنگ اور اسلوب نظر نہیں آتا۔ بیشتر شعراء نے غزل کو اپنے اپنے طور پر برتا ہے اور اپنے خلاقانہ ذہن سے الگ الگ رنگ، طرز اور اسلوب اختیار کیا ہے۔

سیوان میں ابتدائی دور کے شعرا میں غیاث الدین احمد المتخلص بہ برق کا نام اردو غزل گوئی میں اہم اور نمایاں ہے۔ حکومتِ فرنگ میں مختلف عہدوں پر مامور رہتے ہوئے معیاری اور پر کشش غزلیں لکھی ہیں۔ غزلوں کا انداز اور مضامین روایتی ہیں اور ان میں حسن و عشق کی جلوہ گری ہے۔ زبان و بیان شستہ اور رواں ہے۔

دشت و ویرانہ کبھی اور کبھی صحرا مجھ کو
وحشتِ دل نے دکھایا ہے نہ کیا کیا مجھ کو
دیر میں اس کا ہے جلوہ، تو حرم کیا جاؤں
شیخ کو کعبہ مبارک ہو کلیسا مجھ کو
بے ردا بام پہ شب کو مرا دل بر بیٹھے
چادرِ ابر میں چھپ کر مہہ انور بیٹھے
کیوں بگڑتے ہو، مکر جاتے ہو جھٹلاتے ہو
ساتھ دشمن کے تمھیں دیکھا ہے اکثر بیٹھے

مثنوی رنجیت رانی رمبھا (مطبوعہ 1974) کے

خالق مولوی شمس الحق المتخلص بہ حسن کا شمار سیوان کے استاد غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا مشغلہ درس وتدریس تھا۔ اس کے علاوہ آپ سیوان کی تاریخی 'بڑی مسجد'' میں امامت وخطیب کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کی استعداد اچھی تھی۔ آپ کی غزلوں کا اسلوب روایتی ہے لیکن مضامین جدا ہیں۔ انداز بے تکلف اور رواں ہے۔ خیالات پاکیزہ اور نیک ہیں۔ غزلوں میں اثر آفرینی ہے۔ اس لیے قارئین پسند کرتے ہیں۔ آپ کے حلقہ تلامذہ میں درجنوں شاعر شامل ہیں۔

اٹھ چلے بالیں سے جب وہ مجھ کو بے جاں چھوڑ کر
منتظر ہم موت کے بیٹھے ہیں درماں چھوڑ کر
باغباں ! کیوں تو نے اس کو بے سبب پھنکوا دیا
آشیاں جھاڑوں پہ تھا، تیرا گلستاں چھوڑ کر
ان دنوں حال زبوں ہے ترے دیوانے کا
مرحلہ طے ہوا غم خواروں کے سمجھانے کا
شمع رونے لگی، پروانے لگے سر دھننے
ابھی آغاز ہوا تھا مرے افسانے کا

مستند ذرائع کے مطابق مرزا دبیر کے حلقۂ تلامذہ میں ملک گیر سطح پر متعدد شعرا کے علاوہ سیوان (بہار) کے حسن کھجوئی، فقیر حسن عظیم، دوست محمد فہیم، سید مظہر حسن مظہر اور شمیم کھجوئی شامل ہیں۔ ان معروف ومستند شعرا نے رثائی ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، جن کا تذکرہ متعدد کتابوں میں مل جاتا ہے۔ لیکن ان شعرا کی غزلیں بجز مظہر حسن، تلاشِ بسیار کے باوجود میری نظروں سے اوجھل ہیں۔ تذکرہ شعرائے سارن کے مولف سمیع بہواروی نے سید مظہر حسن مظہر کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ نمونۂ کلام بھی لکھے ہیں۔ دفتر ابتر ان کے مختصر شعری مجموعے کا نام ہے۔ وہ مشہور ومعروف شاعر علامہ جمیل مظہری کے والد تھے۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ معیاری غزلیں بھی کہی ہیں۔ غزلوں کا انداز روایتی ہے اور مضامین عشقیہ ہیں۔

جس دل میں تو نہ ہو مجھے اس دل سے کیا غرض
لیلیٰ نہ ہو تو قیس کو محمل سے کیا غرض
مظہر اب ان کے پاس کسی حال میں رہے
دل دے چکے تو آپ کو پھر دل سے کیا غرض

سیوان کے قدیم شاعروں میں یوسف سیوانی حضرتِ ظریف لکھنوی کے شاگرد تھے اور اکبر الہٰ آبادی سے خاصے متاثر تھے۔ آپ نے اکبر کے رنگ میں شاعری کی ہے۔ آپ نے مزاحیہ غزلوں کے ساتھ ساتھ سنجیدہ اور نعتیہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ انور سیوانی نے آپ کے کلام کا مجموعہ 'آئینۂ ظرافت' کے نام سے ترتیب دیا تھا، لیکن شائع نہیں ہو سکا۔ اس مخطوطے کو ڈاکٹر التفات امجدی نے دوبارہ مرتب کر کے 2012 میں شائع کرایا۔ غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

شاد ہیں بدھو میاں رسم بزرگاں چھوڑ کر
عید کے دن کیک کھاتے ہیں سویاں چھوڑ کر
کیا کروں مجبور ہوں مشکل ہے اب ہونا گزر
گھر میں کھا لیتا ہوں جا کر در پہ مہماں چھوڑ کر
رنگ اکبر کا ظرافت میں کرو تم اختیار
فحش گوئی عادتِ بے ہودہ طفلاں چھوڑ کر

بابو شیام کشور شری واستو شام کا اصل وطن ضلع سارن ہے لیکن سیوان میں وکالت کا پیشہ کرتے تھے۔ اس لیے مستقلاً سیوان میں سکونت پذیر رہے۔ سیوان اور سارن کے سارے تذکروں میں آپ کا ذکر موجود ہے۔ آپ قادرالکلام شاعر تھے اور سیوان کی ادبی محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کر کے رونق بخشتے تھے۔ شاعری میں کوئی اپنا رنگ اور اسلوب تو نہیں پیدا کر سکے، لیکن ہم عصر شعری رجحانات اور روایت کا خیال رکھا اور اسی طرح کی شاعری کی۔ دیکھیں چند اشعار۔

یہ لے جاں ہے اپنی، یہ ایمان اپنا
چڑھاوے کا تیرے ہے سامان اپنا
محبت، محبت، محبت، محبت
یہ مصرع ہے گویا کہ دیوان اپنا
دکھا روئے انور کہ ہو صبح محشر
اندھیرا پڑا ہے شبستان اپنا

سیوان کے رؤسا میں شمار محمد قاسم ابن گلزار حسین المتخلص بہ قسیم سیوانی ایک قادرالکلام، مستند ومعروف شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی کارکن بھی تھے۔ وہ عرصۂ دراز تک حکومتِ فرنگ میں اعزازی مجسٹریٹ (1936-1927) کے عہدے پر فائز رہے۔ 14 فروری 1934 سے 13 فروری 1937 تک بہار قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ آپ کی شاعری کا مذاق صاف ستھرا تھا۔ سیوان کی ادبی محفلوں میں اپنا کلام سناتے تھے اور دادِ تحسین پاتے تھے۔ دولت اور شہرت کے باوجود کلام کی اشاعت کے تئیں سنجیدہ نہیں تھے۔ شاعری میں عشرت لکھنوی سے اصلاح لی۔

دوست دشمن نے سمجھ کر اس قدر بے داد کی
حسرتیں روئیں، تمناؤں نے بھی فریاد کی
پوچھتے حالت ہو تم کیا عاشقِ ناشاد کی
خاک میں جب مل گیا تب آہ! تم نے یاد کی

نور الہدیٰ یکتا کا شمار سیوان کے استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ یکتا نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ متعدد نثری رسالے بھی لکھے ہیں۔ آپ نے بچوں کے لیے درسی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ بچوں کا ایک رسالہ 'المفید' شائع کیا لیکن اس رسالے نے بہت جلد دم توڑ دیا۔ ڈاکٹر مفتاح الہدیٰ نے آپ کے کلام اور حالاتِ زندگی پر محیط ایک کتاب ' یکتا سیوانی: احوال وتدوین کلام' کے نام سے 2011 میں شائع کرائی۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ ان کی تخلیقات ضائع ہونے سے بچ گئیں۔ یکتا غزل گوئی کے میدان میں تاحیات سرگرم رہے اور ادبی محفلوں کی آبیاری کرتے رہے۔ آپ نے نظمیہ پیرایے میں لمبی لمبی غزلیں کہی ہیں جن میں دلی جذبات وکیفیات کی فراوانی ہے۔ آپ کی غزلوں کی زبان شستہ اور رواں ہے۔ اسلوب دلکش اور دل پذیر ہے۔

شرم کرتے ہیں نہ کچھ آپ حیا کرتے ہیں
برسرِ عام رقیبوں سے ملا کرتے ہیں
نالہ کرتے ہیں نہ ہم آہ و بکا کرتے ہیں
درد اٹھتے ہی جگر تھام لیا کرتے ہیں
حضرت عشق کے مکتب میں جناب یکتا
پانچواں باب گلستاں کا پڑھا کرتے ہیں

سیوان کے ایک مذہبی خاندان کے چشم و چراغ پنڈت بندیشوری دت دوبے کا تخلص بسمل تھا۔ آپ کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہنے کا ملکہ حاصل تھا۔ آپ کا مشغلہ وکالت تھا۔ اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ سیوان کی شعری محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ بعض اوقات اپنے دولت کدے پر بھی شعری نشست کا اہتمام کرتے تھے۔ آپ کی غزل گوئی کا رنگ اور لہجہ ہم عصر شعرا سے الگ تھا۔ آپ کو غزل کی ہیئت اور اسلوب میں نئے نئے تجربات کرنے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کا لہجہ نرم اور تجربات نئے ہیں۔

خیال گیسوئے جاناں بندھا ہے کچھ ایسا
کہ دیکھتا ہوں میں راتوں کو روز خواب میں سانپ
نہیں ہے زلف سے کالوں کو نسبت اے بسمل
لکھا کرے کوئی شاعر تو کیا کتاب میں سانپ

جگر مراد آبادی کے شاگرد رشید، شیدا رانی پوری کا شمار سیوان کے قادرالکلام شعرا میں ہوتا ہے۔ معاشی پریشانیوں میں مبتلا رہنے کے باوجود اردو غزل گوئی کے میدان میں فعال اور سرگرم رہے۔ آپ نے روزگار کی تلاش میں مختلف مقامات کی سیر کی اور جہاں بھی گئے اپنے مزاج کے موافق ماحول تلاش لیا۔ غزل میں جگر کا رنگ اور طرز

اپنایا۔زباں وبیاں آسان اور سلیس ہے۔آپ کی غزلوں میں اثر آفرینی کے عناصر بہ درجۂ اتم موجود ہیں۔

ساقیا! کیسی کشش ہے ترے پیمانے میں
شیخ مسجد سے چلے آتے ہیں مے خانے میں
نام ہوتا ہے ترے نام پہ مر جانے میں
زندگی ہوتی ہے دنیا سے گزر جانے میں
ہے گدائی میں بھی شیدا کو خیال شاہی
گنج مل جاتا ہے مسکین کو ویرانے میں

سیوان کے معروف غزل گوشعرا میں اہم مقام و مرتبے کے حامل علی بہادر خاں کا تخلص بہار تھا۔مولوی عبدالعلیم آسی کے شاگرد اور حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔فن غزل گوئی پر کامل دستگاہ حاصل تھی۔آپ مشاعروں میں اپنے خاص انداز اور طرزِ ادا کے لیے جانے جاتے تھے۔ہم عہد شعرا کی طرح آپ کی غزلوں کا رنگ، لہجہ اور اسلوب روایتی ہیں۔ہم عصر رسالوں میں آپ کے کلام شائع ہوتے تھے۔

بلبل ناداں بڑی تھی کیا تجھے فریاد کی
کیا خبر اس کی نہ تھی بن آئے گی صیاد کی
شوق کہتا ہے کہ پہنچوں جلد کوئے یار میں
چرخ کہتا ہے تمنا کر عدم آباد کی
حور سے واصل ہے جنت میں بہار شاد کام
دھوم ہے فردوس میں ہر سو مبارکباد کی

عباس علی جذب کی پیدائش 1916 میں موضع گوپال پور ضلع سیوان کے ایک مذہبی خاندان میں ہوئی۔مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسہ عباسیہ، پٹنہ سے تحصیلِ علم کے بعد حسین گنج ہائی اسکول میں اردو و فارسی کے استاذ کے طور پر بحالی ہوگئی۔لیکن ملازمت کا سلسلہ دراز نہ ہو سکا۔اسکول سے مستعفی ہونے کے بعد گوشۂ تنہائی اختیار کر لی۔اسی قعرِ گمنامی میں 1971 میں انتقال کیا۔جذب ایک کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر تھے۔وہ کلاسیکی روایتوں کے زائیدہ و پروردہ تھے۔عام طور پر شعری نشستوں کے علاوہ محفلِ مسالمہ ومقاصدہ میں بھی شریک ہوتے تھے اور بزم رثائی میں مرثیہ خوانی بھی کرتے تھے۔ان کے قصیدوں کا مجموعہ 'قصائدِ جذب' 1993 میں شائع ہو چکا ہے۔ 2019 میں ان کا دوسرا مجموعۂ کلام 'برق و باراں' کی اشاعت ہوئی۔ان دونوں کتابوں کے مرتب ڈاکٹر سید حسن عباس ہیں۔ان کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ مرزا غالب کے طرزِ سخن سے زیادہ متاثر تھے۔کہیں کہیں اقبال کا بھی رنگ پایا جاتا ہے۔وہ غزلوں کی صالح روایات اور بلند اقدار کے حامل تخلیق کار ہیں۔

زباں کو نا شناس شیوۂ دشنام رہنے دو
وفا تجھ سے کیا ہوگی وفا کا نام رہنے دو
جناب شیخ جو حوران نادیدہ پر مرتے ہیں
گر اپنی بزم میں ان کو کوئی گلفام رہنے دو

سیوان میں غزل گوئی کا دوسرا دور آزادی کے بعد شروع ہوا۔اس دور کے بعض شعرا کی تخلیقی ثروت مندی اور فکر و فن کی بلندی سے سیوان میں غزل گوئی کو ایک اعتبار حاصل ہوا۔ان شعرا کی غزلوں کی وجہ سے پوری اردو دنیا بالخصوص بہار کے ادبی منظرنامے میں سیوان کے شعرا اپنا نام اور کارنامے درج کرانے میں کامیاب ہوئے۔ان میں سے متعدد شعرا کی غزلیں اور ان کے مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ بھی ہوئے۔اس دور کے کامیاب شاعروں میں افسر ماہ پوری، انور بہمن بروی، جمیل مظہری، حمید تمنائی، زاہد فیروز پوری، طالب درویشی رضا مظہری، کوثر سیوانی، مجنوں قطبی، معین افغانی اور صفی فیروز پوری جیسے با کمال، بلند اقبال، فکر رسا اور فکر طبع شعرا کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

افسر ماہ پوری استحصال زدہ فن کار ہیں۔گھریلو حالات اس طرح بگڑے کہ دیارِ غیر کی ہجرت میں عافیت سمجھی اور اپنی شرافت، نکوکاری اور صلح جو مزاج کے باعث اکثر فریب کھاتے رہے۔افسر ماہ پوری کو جو مقام و مرتبہ اردو غزل گوئی میں ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا۔'غبار ماہ' اور 'دیارِ ماہ' کے نام سے ان کی غزلوں کے دو مجموعے شائع ہوئے جن کی کافی پذیرائی ہوئی۔آپ کو نثر نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔چند نثری تخلیقات بھی شائع ہو چکی ہیں۔آپ نے کراچی (پاکستان) میں آخری سانس لی۔آپ کی غزلوں میں احساسات و جذبات کی حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔غزلیں پرلطف اور اثر انگیز ہیں۔

وہ اک بلا ہے مصیبت ہے کیا کیا جائے
ہمیں اسی سے محبت ہے کیا کیا جائے
ہم اس کے در پہ گدا بن کے جا نہیں سکتے
یہ اپنی اپنی طبیعت ہے کیا کیا جائے
مرا بھی حوصلہ بڑھتا ہے داد سے افسر
یہ اہلِ فن کی ضرورت ہے کیا کیا جائے

انور بہمن بروی کا اصل نام محمد انوار الاسلام ہے۔طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر و ادب سے شغف پیدا ہو گیا۔ناکام از دواجی زندگی کی تلخ سچائیوں نے یاس آمیز حقیقت نگاری کی ترغیب دی۔انور کی غزلوں میں زندگی کے سلگتے مسائل فنکارانہ تجربات کے ساتھ نظر آتے ہیں۔وہ اپنے بعض ہم عصر شعرا کی طرح زبان و بیان کے تخلیقی استعمال کی جستجو اور شعری طریق کار کے نت نئے انداز اور اسلوب کو برتنے سے زیادہ انسانی رشتوں کی المناک شکستگی اور پامالی پر توجہ دیتے ہیں۔آپ کی غزلیں زیست کی کربناکیوں کا عمدہ بیانیہ ہیں۔ڈاکٹر صابر علی سیوانی نے آپ کی غزلوں، قطعات اور سوانحی کوائف پر مشتمل کتاب 'انوارِ سخن' کے نام سے 2004 میں شائع کرائی۔ڈاکٹر انور پاشا نے آپ کی شاعری کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے۔

''ڈاکٹر انور بہمن بروی کی شاعری پہلی نظر میں ہی ان کی کہنہ مشقی کی غمازی کرتی ہے۔وہ شاعری کو صداقت نگاری کا مصداق تصور کرتے ہیں۔زمانے کی زہرناکیوں، انسانی اقدار کا زوال، بدلتا تہذیبی و اخلاقی مزاج اور پر آشوب سماجی سیاسی صورتحال جب بندش الفاظ میں ڈھل کر غزل کی شکل میں نمو پذیر ہوتی ہیں تو قاری کے فکر و احساس کو مرتعش کیے بغیر نہیں رہتیں۔''

(انوارِ سخن، مرتب، ڈاکٹر صابر علی سیوانی، ص 05)

دل کی بستی سے نہ تم اپنے نکالو مجھ کو
اتنا چاہو نہ مرے چاہنے والو مجھ کو
ٹوٹ بھی جاؤں تو آئینہ ہی کہلاؤں گا
یوں نہ پتھر کی طرح راہ میں ڈالو مجھ کو
ٹوٹ جائے گا یہ احساس کی ایک ٹھوکر سے
کچی مٹی کا گھروندا ہے بچا لو مجھ کو
اس سے پہلے کہ بکھر جاؤں میں تم سے انور
ان خلاؤں سے کسی طرح نکالو مجھ کو

علامہ جمیل مظہری عالمی شہرت یافتہ قلم کار ہیں۔آپ کو نثر اور نظم دونوں اصناف پر کامل قدرت حاصل تھی۔لیکن شاعری سے ہی حیاتِ دوام ملی۔جمیل مظہری کی شاعری لطیف احساس اور بلندیِ فکر سے عبارت ہے۔آپ کی شاعری میں محبت کی شرینی بھی ہے اور ہجر کی چاشنی بھی۔جمیل مظہری کے شعری سرمایے میں اگر 'نقش جمیل' 'عرفان جمیل' 'وجدان جمیل' اور مثنوی آب و سراب کو یکجا کر دیا جائے تو غزلوں کے مقابلے میں نظموں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ان کی غزلیں زیادہ تر فکرِ جمیل میں ہی ملتی ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نظر کو پاک کیا فکر کو بلند کیا
دلوں کو تیری محبت نے درد مند کیا
پڑھو کتابِ وفا ہے جمیل کا چہرہ
بنا دیا ہے محبت نے ترجماں اس کو
ہم نے کچھ پھول کھلائے ہیں بڑی محنت سے
اس طرف بھی کبھی اے باد صبا ہو لینا

پروفیسر حمید تمنائی اردو شاعری علی الخصوص اردو غزل کا ایک معتبر نام ہے۔ ابتدائی دور کی شاعری پر جعفر علی خاں اثر سے مشورہ سخن لیا اور بعد میں تمناً عمادی پھلواروی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ انہی کی نسبت سے اپنے نام کے آگے تمنائی کا لاحقہ جوڑ لیا۔ سیوان میں آل انڈیا سطح کے مشاعروں کے انعقاد کا آغاز آپ کی ہی دین ہے۔ سیوان کے دیگر ادبی پروگراموں میں بھی کلیدی رول نبھاتے تھے۔ آپ نے چار درجن سے زیادہ شعراء کی فنی وفکری آبیاری کی ہے۔ آپ کے شاگردوں میں پربھو نرائن ودیارتھی بھی شامل تھے جو تقریباً چالیس کتابوں کے مصنف ومؤلف ہیں اور سیوان میں بہار سرکار کے اعلیٰ افسر (اے ڈی ایم) رہے ہیں۔ حمید تمنائی کی غزلوں میں پاکیزہ خیالات، نادر تشبیہات اور حقیقی احساسات کا پرتو ہے۔ صدق جذبات کی پیش کش نے آپ کی شاعری کو پرکشش اور پرلطف بنا دیا ہے۔ 'لمعات' اور 'متاع شائیگاں' آپ کے مجموعۂ کلام ہیں۔ آپ کے صاحبزادے ضیاء الحمید نے بتایا کہ ''کلیاتِ پروفیسر حمید تمنائی'' زیر اشاعت ہے۔ ان کے علاوہ 'سخن وران سارن' کی تالیف کی اور 'لذات مسکیں' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ احمد جمال پاشا اپنے مضمون 'پروفیسر حمید: ایک رنگارنگ شخصیت' میں رقم طراز ہیں:

''حمید تمنائی ایک قادر الکلام اور مسلم الثبوت استاد ہیں، جنھوں نے ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک کیفیت تغزل اور استادانہ فنکاری ہے۔ شیخ سے چھیڑ چھاڑ، خودداری، عشق و عاشقی، صبر و رضا، بے ثباتیِ عالم، اتحادِ وطن، عزائم پیغام عمل، حالِ زار، بے وفائی، حقیقتِ فطرت اور ساقی ان کے موضوعات ہیں۔''

(نذر حمید: احمد جمال پاشا، ص 29)

تباہی و بربادی جو پھیلی ہے زمانے میں
حقیقت میں یہ شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
ہے شباب عشق بلبل بعد از تکمیل گل
حسن کا انجام ہی تو عشق کا آغاز ہے
حسن کی تزئین کو کیا حاجت مشاطگی
حسن تو خود حسن فطرت کا حسیں انداز ہے
ہیں افق پہ مہر عالم تاب کی ضوپاشیاں
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
برستی ہے کالی گھٹا خوب برسے
نہیں جیت پائے گی اس چشم تر سے

سیوان کے اوّل تذکرہ نگار محمد حفیظ اللہ المتخلص بہ زاہد موضع فیروز پور (آندر) سیوان کے مکیں تھے۔ حمید تمنائی کے ساتھ مل کر 'سخن وران سارن' (مطبوعہ 1972) کی تالیف کی۔ ادبی صحافت میں بھی پیش پیش رہے۔ زاہد کی غزل گوئی کا مذاق صاف ستھرا ہے۔ طرزِ ادا سلیس اور رواں ہے۔ جذبات نیک اور انداز عاجزانہ ہے۔

گرائی جائیں گی ہم پر ستم کی بجلیاں کب تک
دل نازک پہ یوں ہوتی رہیں گی سختیاں کب تک
مری نغمہ سرائی پر لگا کر مہر پابندی
کرو گے اس طرح آخر مری رسوائیاں کب تک
بری حالت ہے اب ضبط الم سے اپنی اے زاہد
گراتے جائیں گے وہ بجلیوں پر بجلیاں کب تک

موضع درویش پور (سیوان) کے باشندے ابوالحسن صدیقی کا قلمی نام طالب درویشی تھا۔ سیوان میں کوثر سیوانی اور کولکاتا میں قیصر شمیم کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ عرصہ دراز تک کولکاتا میں ٹیکس کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ طالب درویشی خوش فکر اور خوش خیال شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپ نے کثیر تعداد میں قوالیاں لکھی ہیں جن کی اس زمانے میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ ان کے کلام کا مجموعہ 'افکار طالب' اور ان کی شخصیت وفن پر محیط 'طالب درویشی: شاعری اور شخصیت' کے نام سے دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سلسلہ رکھیے آنے جانے کا
در کھلا ہے غریب خانے کا
چھوڑ کر ہاتھ اس کا مجبوراً
ساتھ دینا پڑا زمانے کا
خار میں رہ کے بھی گلوں جیسا
حوصلہ رکھیے مسکرانے کا
درد کا کیا علاج ہے طالب
درد ہے نام آنے جانے کا

جمیل مظہری کے برادر خرد رضا مظہری کی بیشتر زندگی کولکاتا میں گزری۔ وہیں مدرسہ عالیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ آپ نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نثری خدمات بھی انجام دی ہیں۔ وحشت کلکتوی کے سایۂ عاطفت میں شاعری کا آغاز ہوا۔ ہم عصر مقتدر رسائل و جرائد میں آپ کا کلام شائع ہوتا تھا۔ رضا مظہری ایک تجربہ پسند غزل گو ہیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ اپنی غزلوں کی روایتی زبان کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے اشعار خوبصورت بن جاتے ہیں۔ موصوف کا شعری مجموعہ 'خاروخس' کی اشاعت ہو چکی ہے۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے آپ پر ایک فردنامہ بھی شائع کیا ہے۔

اک نئی سمت پہ چلیے تو سہی
راستہ اپنا بدلیے تو سہی
نئے احساس قدیم اندازے
اپنے پیمانے بدلیے تو سہی
میں مٹ کے خاک ہوا بھی مگر خودی کی قسم
کسی کی راہ گزر کا غبار ہو نہ سکا

سیوان میں کوثر سیوانی کا شمار سنجیدہ اور استاد شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ آپ شاعری میں داغ اسکول کے پروردہ تھے۔ آپ ابر احسنی گنوری کے تلامذہ میں شامل تھے۔ کوثر سیوانی نے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن سب سے زیادہ غزل گوئی پر توجہ دی ہے۔ آپ کی غزلیں حقیقی جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہیں۔ آپ نے عشقیہ غزلیں کہنے سے گریز کیا ہے۔ کوثر سیوانی کے یہاں جابجا طنز کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن ان میں نشتر زنی نہیں ہے بلکہ دھیماپن ہے۔ ''عکسِ تخیل'' آپ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ بعد از مرگ ڈاکٹر ظفر کمالی نے آپ کی شاعری اور حالات زندگی پر مشتمل ایک کتاب 'جنوں کی آگہی' کی اشاعت کرائی۔ آپ کی غزلیں ہندوستان کے مقتدر رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔

دھن کا ارمان کم سے کم رکھیے
دل پریشان کم سے کم رکھیے
لوگ کیا کیا نہ کہتے رہتے ہیں
بات پر کان کم سے کم رکھیے
خود نمائی میں جگ ہنسائی ہے
ظاہری شان کم سے کم رکھیے
کم نگاہوں کے روبرو کوثر
اپنی پہچان کم سے کم رکھیے

مجنوں قطبی کا اصل نام عبد المعید تھا۔ آپ کا پیشہ درس و تدریس تھا۔ شعر و ادب کا شوق طالب علمی کے زمانے میں پیدا ہو گیا۔ ابتدائی شاعری پر یکتا سیوانی سے اصلاح لی۔ سیوان کی ادبی محفلوں میں شرکت کی وجہ سے شاعری میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ سیوان اور دیگر شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ مجنوں کے کلام میں تجربات کی پختگی، خیالات کی طرفگی اور متصوفانہ رنگ و آہنگ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ 'پروازِ تخیل' کے نام سے ایک شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

تو ہی میرا ساز ہے تو ہی مری آواز ہے
یہ محبت کا کرشمہ 'عشق کا اعجاز ہے
ضبط کرتا ہوں تو جل اٹھتا ہے ہر تار حیات
آہ کرتا ہوں تو ہر سانس شرر ہوتی ہے
وہ ایک قطرہ ہے قطرے کی ہے حقیقت کیا
کبھی بھی بحر کا نگراں حباب ہو نہ سکا

دل سے نکل کے چلتی ہے سایے میں عرش کے
اللہ رے رسائی کہاں تک ہے آہ کی

معین افغانی کا تعلق سیوان کے باکمال اور مستند شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ ریلوے میں ملازم تھے۔ سیوان کے ادبی حلقوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ادبی محفلوں کے لیے آپ کی حیثیت لازم وملزوم کی تھی۔ آپ نے غزلوں کے علاوہ سلام، منقبت، نوحے اور مرثیے بھی لکھے ہیں اور اپنی شاعرانہ انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ آپ نے غزلوں میں شعری تلمیحات کا استعمال برمحل اور موزوں کیا ہے۔ غزلوں کی لفظیات عام فہم ہے، لیکن خیالات نادر اور فکر بلند ہے۔

ابتدا اک نہر شیریں انتہا اندھا کنواں
تم ابھی واقف نہیں ہو عشق کے انجام سے
یہ کیا ضرور کہ موسیٰ کی یاد تازہ ہو
نہیں ہے تاب نظارہ تو پھر نظر نہ ملا
نفرتوں کو نگل گیا وہ شخص
گرتے گرتے سنبھل گیا وہ شخص
بعد مرنے کے سب کہیں گے معین
ایک مصیبت تھا ٹل گیا وہ شخص

سیوان کے غزلیہ افق کو منور کرنے والے اور مجموعی طور پر غزلیہ شاعری کی چمن بندی میں اہم کردار نبھانے والے شاعروں میں ایک اہم نام صفی فیروز پوری کا ہے۔ آپ نے لمبی عمر پائی تھی اور تمام عمر میدانِ شعروادب میں برسرِ پیکار رہے۔ آپ کی تخلیقی ثروت مندی قابل رشک ہے۔ تارنفس' آشیان غزل' صفی کی غزلیں اور کلیات صفی (زیرِ طبع) آپ کی غزلوں کے مجموعے ہیں۔ صفی کی غزلوں میں گردشِ لیل ونہار کے پرتو ہیں، انسانی رشتوں اور رویوں کی حقیقی ترجمانی ہے اور ناکام زندگی سے مرتب ہونے والے اثرات کا نگارخانہ ہے۔

نہیں ہے اعتبار اپنے پرائے کا یہاں کوئی
کہ ہر اک دوستی میں دشمنی معلوم ہوتی ہے
کون کہتا ہے کہ حالات سے ڈر جاؤں گا
میں کوئی وقت نہیں ہوں کہ گذر جاؤں گا

سیوان سے تعلق رکھنے والی قدیم شاعرات میں بی بی سیدہ، شمع سیوانی، اور کماری رشمی جیسوال مشہور ومعروف ہیں۔ ان خواتین نے معیاری، پرکشش اور قابلِ توجہ شاعری کی۔ بی بی سیدہ نے تاریخ گوئی میں درجۂ کمال حاصل کیا اور رسالہ تہذیب نسواں (لاہور) کی مستقل تاریخ گوشاعرہ بن گئیں۔ لیکن غزل کے میدان میں پچھلی صف میں کھڑی نظر آتی ہیں۔ شمع سیوانی اور نورقاسمی کا شمار سیوان کے رؤسا میں ہوتا ہے۔ دربار کے نام سے موسوم ان کا گھرانہ علم وادب کا قدیم مرکز تھا۔ دربار کے وسیع و عریض صحن میں ملک گیر سطح کا مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ نور قاسمی کے بھائی ڈاکٹر مظفر حسین قاسمی اسی مقام سے 'الحق' رسالہ نکالتے تھے۔ جب تک حمید تمنائی کی بودوباش دربار کے کیمپس میں رہی، وہاں شعرا و ادبا کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ پروفیسر صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں چار درجن سے زیادہ شعرا تھے جو ان سے شعروادب کے رموز و نکات سیکھتے تھے۔ ایسے ہی علمی وادبی ماحول میں شمع اور نورقاسمی کی ادبی وفکری ذہن سازی ہوئی۔ نذرِ حمید (مرتبہ۔ احمد جمال پاشا) میں ڈاکٹر مظفر حسین قاسمی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ''حمید تمنائی کی بلیغ نظر اور بہتر تربیت نے شمع اور نور کو قادرالکلام شاعرات کی صف میں لا کھڑا کیا۔''

زہے نصیب کہ ٹوٹا حجابِ آزادی
الٹ گیا سرِ محفل نقابِ آزادی
صلیب و دار پہ لکھا گیا ہے درسِ جنوں
ہوا ہے جب کہیں کامل نصابِ آزادی

شمع سیوانی

تڑپ کے دل شرارے سلام کرتے ہیں
اٹھ کے آنکھوں کے تارے سلام کرتے ہیں
جو کائنات تھی اے نور اپنی الفت کی
وہی لطیف اشارے سلام کرتے ہیں

نورقاسمی

رشمی جیسوال نے طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ استاد شاعر قمر سیوانی سے شاعری کی مبادیات سیکھیں اور مقامی مشاعروں میں شامل ہونے لگیں۔ رشمی کی غزلوں میں خالص تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ محبت کے لطیف جذبات کی ترجمانی نہایت چابکدستی سے کرتی ہیں۔ انچل (دیوناگری رسم الخط کا تذکرہ) میں ان کی دو غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ چند اشعار

تیری نظروں سے گروں گی تو کدھر جاؤں گی
تیری پلکوں کا میں گوہر ہوں بکھر جاؤں گی
پیکرِ عزم ہوں تم دیکھنا رشمی ایک دن
شعلۂ درد سے ہنس ہنس کے گزر جاؤں گی

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیوان ضلعے میں اردو غزل گوئی کا سفر مضبوط اور منضبط ہے۔ قدیم شعرا کی غزلوں میں ہم عصر روایت کی پاسداری بھی ہے اور جدت سے یاری بھی۔ ہم عصر رجحانات کا بیانیہ بھی ہے تو تلمیحات و تاریخ نگاری کا آئینہ بھی۔ احساس محبت کی حسین اور باریک ترجمانی بھی ہے تو حالاتِ حاضرہ کی نفیس عکاسی بھی۔ تمثیلات و ترکیبات کے برمحل استعمال کا طریقہ ہے تو رموز وعلائم کو موزوں برتنے کا سلیقہ بھی۔ قدیم شاعروں نے اپنی ذات کے اندرونی حالات و کیفیات کو بھی شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان میں سے بیشتر کا مزاج قلندرانہ تھا اور تشہیری کارسازیوں سے دور رہتے ہوئے گیسوئے غزل کو سنوارتے تھے۔ ان میں سے چند شعرا ایسے تھے جن کا شمار سیوان کے متمول اشخاص میں ہوتا تھا اور ان کے پاس اشاعت کے تمام وسائل موجود تھے۔ لیکن ان شعرا نے بھی اپنے کلام کی طباعت میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ یہ اس وقت کے ماحول اور مزاج کا بھی اثر ہوسکتا ہے۔ آج ان شعراء کی بیشتر تخلیقات یا تو ضائع ہوگئی ہیں یا ان کے نااہل ورثا کے گھروں میں دیمک کی خوراک بن گئی ہیں۔

کتابیات

1 بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا: اختر اورینوی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ 1989
2 تذکرہ شعرائے سارن: سمیع بہواروی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2012
3 مثنوی رنجیت رانی رمبھا: مرتب، امر امیری، اقتدار کتاب گھر، کولکاتا، 1974
4 آئینۂ ظرافت، یوسف سیوانی: مرتب، ڈاکٹر التفات امجدی، دارالاشاعت، خانقاہِ امجدیہ، سیوان۔ 2012
5 یکتا سیوانی: احوال وتدوین کلام: ڈاکٹر مفتاح الہدیٰ، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2011
6 انچل (ہندی تذکرہ) پربھو نرائن ودیارتھی، ساہتیہ سنگم، سیوان۔ 1999
7 مژگاں، جلد 19-18 شمارہ 54-50 نوشاد مومن، علیم الدین اسٹریٹ، کولکاتا، 2017
8 انوارِ سخن: مرتب، ڈاکٹر صابر علی سیوانی، بزمِ قلم، چوکی مخدوم، 2004
9 علامہ جمیل مظہری (مونوگراف) جہاں گیر کاظمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتا، 2017
10 نذرِ حمید: مرتبہ، احمد جمال پاشا، کبیر وچار منچ، سیوان 1983
11 رضا مظہری (مونوگراف) ظہیر انور، مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتا، 2018
12 تارِ نفس: صفی فیروز پوری، نشیمن، فیروز پور، سیوان 2000
13 طالب درویش: شاعری اور شخصیت، صفی فیروز پوری، نشیمن، فیروز پور، سیوان۔ 2017
14 سدسیہ پریچے: بہار ودھان پریشد، بہار ودھان بھاچیوالیہ، پٹنہ 2002

■

Dr. Irshad Ahmad
1731, Amna Manzil, Islamia Nagar
Distt.: Seewan - 841226
Mob.:9771443219

کوٹہ کا علمی و ادبی پس منظر

محمد فہیم احمد

راجستھان کی تاریخ اور یہاں کی علمی وادبی خدمات کے مطالعے سے یہ حقیقت مترشح ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ دہلی، لکھنؤ اور دیگر خطوں کی طرح کوٹہ بھی ادبی حوالے سے زرخیز رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے کوٹہ ریاست کی بنیاد سترہویں صدی عیسوی میں عہد جہانگیری کے دوران راؤ مادھوسنگھ ہاڑا (1599-1648) نے 1632 میں رکھی تھی۔ یہ ابتدا میں ریاست بوندی کا حصہ تھی۔ راؤ مادھوسنگھ بوندی کے راجا رتن سنگھ کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس ریاست کے راجاؤں کو مہاراؤ کا خطاب ملا تھا۔ مہاراؤ بھیم سنگھ اول (ولادت: 1682۔ وفات: 1720) نے مغل حکومت سے پانچ ہزاری منصب پایا۔ 26 دسمبر 1817 کو یہ ریاست انگریزی حکومت کے ماتحت آگئی۔ 1822 میں حکومت انگلشیہ نے اردو کو دفتری زبان بنانے کا ملک گیر اعلان کردیا۔ المیہ یہ ہوا کہ اردو کی ترقی غدر کے ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد ہی ہوسکی جب راجپوتانہ کے باہر سے اردوداں حضرات کی آمدورفت شروع ہوئی۔ دریائے چمبل کے کنارے بسا ہوا یہ خوبصورت شہر مقامی وغیر مقامی نامور ادبا وشعرا اور فنکاروں کا مسکن رہا ہے جنھوں نے اس کا نام دنیا بھر میں روشن کیا۔ راجستھان کے پٹھاری خطہ کوٹہ کے حوالے سے احتشام اختر کا یہ شعر زبان زد خاص وعام ہے۔

ندی کا ہے یہ کرشمہ جو ہوگئی رونق
کہ ریگزار میں مثل بہار ہے کوٹہ

کوٹہ میں اردو زبان وادب کی ترقی میں بیرونی شعرا وادبا کا رول بھی اہم ہے۔ اس فہرست میں منشی فیاض الدین احمد فدا (تلمیذ: غلام محمد رہا اکبرآبادی) عبداللطیف یکتا (تلمیذ: انور دہلوی، داغ دہلوی) افضل حسین ثابت لکھنوی، (تلمیذ اوج لکھنوی وامیر مینائی) سید محمد حسن ثاقب دہلوی (تلمیذ ذکی دہلوی تلمیذ غالب) مذاق بدایونی، ریاض الحسن ریاض متھراوی، عبدالقادر رندا اکبرآبادی، ہیرالال سود شیدا اکبرآبادی، حکیم سید احمد حسین لکھنوی، مولوی مظہر الہادی امروہوی وغیرہ کی شمولیت ہے جن کا تذکرہ ثابت لکھنوی کی حیاتِ دبیر میں کیا ہے۔ کوٹہ میں 1857 کے بعد کا عہد اردو شاعری کے ارتقا کے باب میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ دلّی اجڑی، لکھنؤ، رامپور اور حیدرآباد ریاستیں آباد ہوئیں۔ ان کے انتشار کے بعد مزید چھوٹی بڑی ریاستیں مہاجرین اردو کی آماجگاہ بنیں۔ راجستھان کے دیگر خطوں کی طرح کوٹہ بھی اجڑے دیار کے لوگوں سے آباد ہوگیا۔ بقول دیانرائن نگم:

''غدر کے بعد انگریزوں کی ایما پر نواب فیض علی خاں کوٹہ کے وزیراعظم مامور ہوئے اور ریاست کے دفاتر میں اردو زبان استعمال کی جانے لگی۔ 1857 میں مطبع فیض کے نام سے پریس قائم ہوا۔ اس پریس پر سرکاری قوانین اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع کیے جاتے تھے۔ اس دوران ریاست کے سرکاری ملازمین میں ایسے حضرات شامل ہوئے جن کو شعروسخن کا شوق تھا۔''

(ماہنامہ زمانہ کانپور دسمبر 1943، ص 286)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نواب فیض علی خاں جب کوٹہ کے وزیراعظم مقرر ہوئے تو اردو ادب کو ترقی وترویج ملی۔ دراصل کوٹہ میں اردو کی آمد اور اس کے استحکام کا سہرا بھی ان ہی کے سر جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ادبی سطح پر کوٹہ میں اردو اُس وقت عام ہوئی جب حاجی سید جعفر حسین (سیشن جج کوٹہ) کے ہمراہ منشی افضل حسین ثابت لکھنوی نے یہاں کی بودو باش اختیار کی۔ کوٹہ کی ادبی فضا کو خوشگوار بنانے میں نواب فیض علی خاں کے شانہ بہ شانہ ثابت لکھنوی کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں جنھوں نے نثر ونظم دونوں اصناف میں اپنی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ ان کے علاوہ تلامذہ غالب کے طور پر منشی گوبند سہائے نشاط الہ آبادی بہ حیثیت سیشن جج اور محسن الدولہ سفیر الملک نواب سید محمد جمشید علی خاں جم حاکم بن کر کوٹہ میں وارد ہوئے۔ اس سے از خود ادبی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں۔ 1880 میں کوٹہ کے افق شاعری پہ جگمگانے والا اولین ستارہ ثابت لکھنوی تھے جنھوں نے باقاعدہ طور پر کوٹہ میں اردو شعرا کا حلقہ تیار کیا۔ کوٹہ کے استاد شاعر مفتوں کوٹوی اپنے مضمون 'ثابت لکھنوی مرحوم کی ضیا پاشیاں' میں رقم طراز ہیں:

''ثابت مرحوم 1862 میں بمقام لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انقلاب 1857 کے مابعد نے انھیں معاشی ضرورتوں کے تحت ترک وطن پہ مجبور کیا۔ 1880 میں بہ عمر 18 سال کوٹہ راجستھان آئے۔ پہلے سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے، بعد ازاں وکالت شروع کردی۔ ریاست کوٹہ سے انھیں وظیفہ ادبی بھی ملتا تھا اور دربار میں ان کی نشست بھی مقرر تھی۔ حیات دبیر حصہ اول ودوم اور دربار حسین ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ خود ان کے اعزائی اصناف کا مجموعہ صبر جمیل (تاریخی نام برق غم) شائع ہوچکا ہے۔ حالانکہ انھوں نے کافی غزلیں، نظمیں اور رباعیات کہی ہیں۔

شاید حوادث روزگار کی زد میں آ گئیں۔ 1947 کا طوفان انھیں بھی کہیں اڑا لے گیا۔ یہ (ثابت لکھنوی) 1941 میں بہ عمر 79 سال رحلت فرما گئے۔ کوئٹہ ہی میں پیوند خاک ہوئے۔

(سہ ماہی نخلستان اودے پور راجستھان، شمارہ 1،2، اشاعت: اپریل وجولائی 1964)

ثابت لکھنوی دبستان لکھنؤ سے بلا واسطہ اور دبستان دبیر سے بالواسطہ مرزا اوج لکھنوی سے وابستہ تھے۔ ثابت لکھنوی اپنے کلام پر اوج لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے اور دیگر اصناف سخن میں امیر مینائی سے مشورہ سخن فرماتے تھے۔ ان کی قابل قدر تصنیف 'حیات دبیر' شبلی نعمانی کی 'موازنہ انیس و دبیر' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ ثابت کے دیگر ادبی کارناموں میں 'دربار حسین 1921'، صبر جمیل، جلوہ گاہ پیغمبر، بہار غم اور ریاض فکر المعروف قول ثابت قابل ذکر ہیں۔ اس عہد کی ایک قابل ذکر تصنیف 'حارق الاشرار' ہے مولوی فتح اللہ کی یہ کتاب کوئٹہ کی اولین تصنیف مانی جاتی ہے۔ 1932 میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا کوئٹہ میں دیوان مقرر ہونا بھی اردو ادب کے لیے فال نیک ثابت ہوا۔ انھوں نے 1938 اردو، فارسی، یوروپین اور انڈو یوروپین شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ انگریزی میں تحریر کیا۔ 1943 میں 'یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین' کے نام سے نول کشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا۔ اس کتاب کے ساتھ 500 صفحات کا اردو ضمیمہ بھی تھا جس میں شعرا کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ یہ کتاب بھی کوئٹہ میں علمی و ادبی خدمات کے اعتبار سے میل کا پتھر مانی جاتی ہے۔

اردو زبان و ادب کے فروغ میں جہاں ایک طرف کوئٹہ میں مختلف انجمنوں اور اداروں نے ادبی کاوشوں کو نمایاں کیا وہیں دوسری طرف شعرائے کوئٹہ نے اصناف سخن میں نت نئے تجربے کر کے اردو ادب کا دامن وسیع کیا۔ بعض شعرا روایتی شاعری تک محدود رہے تو بعض شعرا نے حالات حاضرہ سے متاثر ہو کر اپنے طرز سخن میں تبدیلی کی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ غزل کی زلف برہم کو سنوارا بلکہ پابند نظموں کی روایات کو بھی آگے بڑھایا۔ چند نظم گو شعرا نے پابند نظموں سے گریز کرتے ہوئے آزاد اور نثری نظم کی طرف رجوع کیا۔ ایسے شعرائے کوئٹہ میں عقیل شاداب، احتشام اختر، ظفر احمد پرواز، ظفر غوری، فاروق انجینئر، شکور انور، چاند شعری، پرشوتم یقین، یقین الدین یقین (فرزند مفتوں کوٹوی) رؤف اختر، ارشد سراج، فرخ ندیم (فرزند عقیل شاداب) اور نعیم دانش قابل ذکر ہیں جنھوں نے صنف غزل اور پابند نظم کے علاوہ آزاد اور نثری نظموں کو اپنا پیرایہ بیان بنایا۔

راجستھان کی ادبی تاریخ کے مطالعے سے اب تک کی تحقیق کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کوئٹہ میں اردو شاعری کے لیے 1873 سے 1879 تک فضا سازگار رہی اور باقاعدہ طور پر آغاز 1880 ثابت لکھنوی کی تشریف آوری سے ہوا۔ یہ بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ غزل اور مرثیہ میں انھیں ید طولی حاصل تھا۔ انھوں نے اردو ادب کے لیے جو سازگار ماحول تیار کیا اس کے سبب دیگر حضرات بھی میدان ادب میں سرگرم ہوئے۔ اگرچہ وہ ان کے شاگرد نہیں تھے پھر بھی بہترین شاعری کرتے تھے جن میں عثمان غنی مائل، چھوٹے خاں رشید، نیاز احمد نیاز، احمد حسین زور، عبدالعظیم خاں بسمل اور راجندر کمار مجبور کی شمولیت ہے۔ ثابت لکھنوی کے اثرات سے کوئٹہ میں شاعری کے افق پہ کئی تلامذہ ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے آگے چل کر کوئٹہ میں اردو شاعری کی مشعل کو فروزاں کیا۔ ایسے شعرا میں بابو بال مکند گپت، مفتوں کوٹوی۔ سراج کوٹوی، تمکین کوٹوی اور عبدالعظیم بسمل اکبر آبادی قابل ذکر ہیں۔ ان میں مفتوں کوٹوی عالم گیر سطح پر معروف ہیں۔ ہاڑوتی کے ساتھ ساتھ راجستھان کے ادبا و شعرا میں بحیثیت شاعر و ادیب اور محقق و نقاد ان کی شخصیت منفرد ہے۔ وہ قادرالکلام شاعر ہی نہیں بلکہ بہترین نثر نگار بھی تھے۔ ان کے درجنوں مضامین ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ وہ راجستھان ساہتیہ اکادمی اور راجستھان اردو اکادمی کے رکن بھی رہے۔ ساہتیہ کلا مندر کوئٹہ نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کئی اعزازات سے نوازا۔ مفتوں کوٹوی کے انتقال کے بعد عقیل شاداب کا ایک مضمون 'مفتوں کوٹوی: ایک شاعر' ماہنامہ شاعر ممبئی جلد 52، شمارہ 1 تا 3 میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں موصوف نے مفتوں کوٹوی کی غیر مطبوعہ کتب کی ایک فہرست بھی شامل کی جن میں 14 شعری مجموعے اور 22 نثری تخلیقات شامل ہیں۔ راجپوتانہ اردو ریسرچ اکادمی جے پور کے خادم ڈاکٹر شاہد احمد جمالی نے 'راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر، جلد اول از مفتوں کوٹوی' کو مرتب کر کے ان کے 90 مضامین کی فہرست نقل کی ہے۔ سرزمین کوئٹہ میں کوئی دوسرا ان کا ہم سر نظر نہیں آتا۔ درحقیقت مفتوں کوٹوی نے اس زمانے میں تحقیق کا بیڑا اُٹھایا جب کالج اور یونیورسٹی کے طلبا اردو میں ریسرچ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مفتوں کوٹوی کی تحقیقات میں تحقیق، تاریخ، ادب، معلومات، مذہب و سوانح کے علاوہ چند افسانے بھی شامل ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے محمد عثمان عارف نقشبندی اپنے مضمون 'مفتوں کوٹوی: ماہ نو کے آئینے میں' میں لکھتے ہیں۔ اگر مفتوں صاحب کے مضامین کو جمع کیا جائے تو ہزاروں صفحات کا نثری سرمایہ اکٹھا ہو سکتا ہے۔

(ایضا ص 36)

ثابت لکھنوی کے مشن کو مفتوں کوٹوی نے عام کیا۔ کوئٹہ اور اطراف کوئٹہ میں شعرا کی کثیر تعداد نے اس تربیت میں حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مفتوں کوٹوی کے تلامذہ کی

اردوزبان وادب کے فروغ میں جہاں ایک طرف کوٹه میں مختلف انجمنوں اور اداروں نے ادبی کاوشوں کو نمایاں کیا وھیں دوسری طرف شعرائے کوٹه نے اصناف سخن میں نت نئے تجربے کرکے اردو ادب کا دامن وسیع کیا۔ بعض شعرا روایتی شاعری تک محدودرھے توبعض شعرا نے حالات حاضرہ سے متاثر ھوکر اپنے طرزسخن میں تبدیلی کی۔ انھوں نے نه صرف یه که غزل کی زلف برھم کو سنوارا بلکه پابند نظموں کی روایات کوبھی آگے بڑھایا۔

طویل فہرست ہے۔ ثابت لکھنوی کی کاوشوں کی بدولت کوئٹہ کی ادبی نشستوں کو جو عروج حاصل ہوا جنھوں نے اس حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے۔

"شروع شروع میں یہ ادبی محفلیں سید کا باغ، سیٹھ کنولال نوہرا اور راج کنہاری کی حویلی میں منعقد ہوتی تھیں۔ خاص نشستوں میں ثابت لکھنوی، سہیل امروہوی اور وکیل محمد ثاقب شریک ہوتے تھے۔"

(مضمون: راجستھان میں فروغ اردو کا صدسالہ جائزہ، رسالہ اردو ادب علی گڑھ ص 83، اشاعت 1966)

بیسویں صدی کے نصف اول میں یہاں اردو زبان و ادب کو عروج حاصل تھا۔ ہر خاص و عام اس کا والہ و شیدا تھا۔ جب کوئٹہ میں باقاعدہ شعر و شاعری کا آغاز ہو گیا تو تیزی سے ادبی انجمنوں کی تشکیل ہونے لگی۔ شعری نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد ہونے لگا جن کی بدولت کوئٹہ کا ادبی ماحول سازگار رہا۔ ان میں بھارتیندو سمیتی کوئٹہ، انجمن تنظیم المومنین کوئٹہ، انجمن ہلال احمر، مشاعرہ پریم

منڈل، مشاعرہ ریلوے انسٹی ٹیوٹ کوٹہ جنکشن، بزم افکار کوٹہ، بزم شوکت کوٹہ، بزم اطفال کوٹہ، بزم شعرا کوٹہ، ہربرٹ کالج کوٹہ کے سالانہ ڈنر پر منعقد ہونے والی شعری نشستیں، بزم ادب کوٹہ، ہندی اردو پوئٹس ایسوسی ایشن، مشاعرہ ہربرٹ کالج (اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کوٹہ) فی البدیہہ مشاعرہ، میلہ دسہرہ کے موقعے پر ہونے والے سالانہ مشاعرے، جشن قیس، ہندی اردو سنگم مشاعرے اور بزم سخن کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں سے یہاں کی ادبی فضا جگمگا اُٹھی۔ یہ فہرست ان انجمنوں، اداروں اور مجالس کی ہے جو کوٹہ میں اردو ادب کے فروغ کے لیے کوشاں رہیں۔

کوٹہ کے استاد شاعر مفتوں کوٹوی نے اپنے مضمون 'کوٹہ میں اردو' میں لکھا ہے کہ 1930 کوٹہ کے راجا بھیم سنگھ کی شادی کے سلسلے میں سہرے اور قصائد لکھے گئے۔ مارچ 1930 میں ان کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا۔ مذکورہ مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا کی تعداد اور نام کوٹہ کی علمی وادبی حیثیت کو واضح کردیتی ہے۔ بحیثیت مجموعی 1857 تا حال کوٹہ میں ادبا و شعرا کی چار نسلیں سرگرم نظر آتی ہیں جن کی درجہ بندی مقامی وغیر مقامی سطح پر کی جاسکتی ہے۔ 1857 کے بعد شعرائے کوٹہ میں مفتوں کوٹوی، ڈم ڈم کوٹوی، روشن کوٹوی، توفیق کوٹوی، امین نشاطی، عزیز مانگرولی، راغب کوٹوی، قیس کوٹوی، تمکین کوٹوی، جوہر کوٹوی، عبداللطیف کوٹوی، عبدالستار عبد اور حافظ حکمت علی حکمت کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے۔ مابعد آزادی کے شعرا میں ظفر غوری، ظفر احمد پرواز، عقیل شاداب، بشیر احمد لطفی، امین الدین اثر، آزاد ارمی، شکور انور، رؤف اختر، جلال توقیر، عبدالحمید حیراں، امیر محمد صابر، سعید محوی، مضطر صدیقی، یقین الدین یقین، نارائن لال گوڑ شیل اور دیگر اس قافلے کے سابقون الاولون ہیں۔ تیسری نسل سے تعلق رکھنے والے شعرا وہ ہیں جن کا وطن اگرچہ کوٹہ نہیں تھا لیکن ملازمت اور طویل قیام کی وجہ سے انھوں نے اسے وطن ثانی بنایا۔ ایسے شعرا میں ثابت لکھنوی، للتا پرساد شاد میرٹھی، بہار صدیقی، فضا جوکالوی، احتشام اختر، فاروق بخشی، عبدالجبار واہی، راہی ٹونکی، اکرام راجستھانی، فاروق انجینئر اور کنور جاوید کے نام قابل ذکر ہیں۔ شعرا کی جدید نسل میں فرخ ندیم، نعیم دانش، احمد سراج فاروقی، یوسف راز، چاند شعری، جمیل قریشی، سلیم آفریدی، سلیم عباسی، ڈاکٹر فرید خان، ڈاکٹر زیبا دختر خدا داد مونس، عزیز ناچیز، الیاس ناز، غلام مصطفیٰ، اطہر اجینی اور بشیر احمد میوخ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ قدیم و جدید شعرائے کوٹہ کا کلام بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

کم ظرف سے نہ مانگ کہ ثابت نہ ہو دلیل
قطرہ بھی نام کو نہیں جام حباب میں
(ثابت لکھنوی)

غیر کیا جانیں کیا راز ہے اس میں پنہاں
آنکھ سے آنکھ جو محفل میں لڑی جاتی ہے
(للتا پرساد شاد میرٹھی)

بات باتوں سے بنتی ہے قاصد
اپنی جانب سے کچھ کہا ہوتا
(فضا جوکالوی)

مری بربادیاں دیکھی ہیں میں نے خوب اے جوہر
مرے آگے جلایا جارہا تھا آشیاں میرا
(جوہر کوٹوی)

سوزِ غم حیات کے نغمے مچل گئے
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل گئے
(عبدالکریم شاد کوٹوی)

مفتوں ہمارے شعر پہ ہوگایہ سخت ظلم
پہنچے اگر نہ چشم سخن داں کے سامنے
(مفتوں کوٹوی)

جب میرے گھر نے آگ پکڑی تھی
ملنے آیا تھا وہ ہوا کی طرح
(عقیل شاداب)

سیکڑوں ظلمت کدوں کو توڑ کر آئے گا پھر
اک نیا سورج جو مضطر شب کے پیراہن میں ہے
(مضطر صدیقی)

بھاری بھرکم پیڑ اکھڑتے جاتے ہیں
کیسے کیسے لوگ بچھڑتے جاتے ہیں
(فاروق بخشی)

تو نہ امرت کا پیالا دے ہمیں
صرف روٹی کا نوالا دے ہمیں
(چاند شعری)

ماقبل آزادی و مابعد آزادی چند برسوں تک کوٹہ میں ادبی سرگرمیاں سرد رہیں جس کی وجہ 1947 کے ناسازگار حالات تھے۔ اس سے کوٹہ کی ادبی فضا بھی خاصی متاثر رہی۔ اس جمود کا خاتمہ 1960 میں مابعد جدیدیت کی بدولت ہوا۔ ایک بار پھر سے ادبی نشستوں کا انعقاد ہوا اور شعرا کی محفلیں آباد ہونے لگیں۔ اس زمانے کی نشستوں میں باہر کے شعرا کو مدعو کیا جاتا تھا۔ بقول احتشام اختر کوٹہ کے بارے میں ایک خاص بات قابل ذکر ہے کہ کوٹہ کے ادبی ماحول پر کبھی جمود طاری نہیں ہوا۔

کوٹہ کے نوجوان شعرا اپنے پیش رو شعرا سے زیادہ سرگرم عمل اور فعال ہیں۔ کوٹہ جیسے صنعتی شہر میں رہنے والے نوجوان شعرا کی فکر بھی جدید اور سائنٹفک ہے۔ ان کی فکر ان کی شاعری میں بھی منعکس ہوتی ہے۔
(انداز نظر، مضمون، کوٹہ کا جدید شعری ادب: ایک جائزہ، ص 44، 2010)

مذکورہ اقتباسات سے یہ مترشح ہوجاتا ہے کہ ہاڑوتی میں آزادی سے قبل ثابت لکھنوی، ان کے شاگرد مفتوں کوٹوی، تلامذہ غالب للتا پرساد شاد میرٹھی اور ان کے ہمعصروں کے علاوہ کوٹہ کے کئی اساتذہ وریسرچ اسکالر نے تحقیقی حوالوں سے اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر فاروق بخشی، پروفیسر احتشام اختر، ڈاکٹر قمر جہاں بیگم اور ڈاکٹر حسن آرا کا تعلق گورنمنٹ پی جی کالج کے شعبہ اردو سے رہا ہے۔ ڈاکٹر نعیم فلاحی جو فی الوقت صدر شعبہ اردو پی جی کالج کوٹہ ہیں اردو کے حوالے سے مختلف خدمات کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ڈاکٹر نادرہ خاتون اور ڈاکٹر نصرت فاطمہ کی تحقیقی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ فاروق بخشی اور احتشام اختر کے کئی شعری مجموعے اور تنقیدی مضامین ادبی ذخائر میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ اسی طرح 'راجستھان کی نثری خدمات: ایک صدی کا جائزہ، راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی 1857 تا 1957' ایسے کارنامے ہیں جسے ڈاکٹر قمر جہاں نے انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر نادرہ خاتون کا تحقیقی مقالہ 'راجستھان میں شعری گلدستوں کی روایت' اور ڈاکٹر نصرت فاطمہ کا تحقیقی مقالہ 'راجستھان میں رثائی ادب کا ارتقا' میل کا پتھر مانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حسن آرا کا تعلق بھی گورنمنٹ پی جی کالج کوٹہ سے رہا ہے۔ انھوں نے 'سلیم الدین تسلیم: حیات اور کارنامے' پر تحقیقی کام کیا۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران کئی ریسرچ اسکالرس نے تنقیدی مضامین اور تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ اس میں بطور نمونہ ڈاکٹر شاہد پٹھان، ڈاکٹر شریف، صابر احمد، شاہنواز اختر، آمنہ خاتون، انجم آرا، محمد اشفاق منصوری، شاہین پروین، نیلوفر اکرام، ڈاکٹر بے بی شبانہ اور راقم الحروف کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ ریاست کوٹہ کا علمی وادبی سفر مختلف نشیب وفراز سے گزر کر ارتقا کی جانب گامزن ہے۔ عہد گزشتہ کے ادبا وشعرا نے نئی نسل کے لیے جو راہیں ہموار کی ہیں ان پر چل کر ہی نسل نو نے روایات کو زندہ وتابندہ رکھا ہے۔

■

Mohd Faheem Ahmad
C 41, Raza Nagar
Rang Talab
Kota - 324002 (Rajasthan)
Mob.:9413404264

ایم اے کنول جعفری

ہندی غزل کا بیباک شاعر: دشینت کمار

ہندی شاعری کی روایت کافی پرانی ہے۔ چھند، دوہے، سورٹھے، چوپائی، سویے اور مُکتک وغیرہ ہندی کی مقبول ومعروف اصناف ہیں۔ شعر گوئی کا خوبصورت اور ہر دلعزیز فن ہندی، عربی، ترکی، فارسی اور پنجابی زبانوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ یہ فارسی کے عمیق دریا کو عبور کرتے ہوئے اردو کے سبز میدان میں بھی داخل ہوگیا۔ اردو میں شعر کہنے کی ابتدا اردو زبان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔ فارسی اور انگریزی سے وابستہ افراد عام لوگوں کی زبان بولنے، سمجھنے اور لکھنے لگے تھے۔ ایسے خوشگوار ماحول میں یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کا اثر شاعری پر نہ پڑے۔ فارسی زبان میں اشعار کہنے والے شعرا نے وقت کی نزاکت کو محسوس کیا اور عوام کی نبض ٹٹولتے ہوئے عام فہم اردو زبان میں شعر کہنے شروع کیے۔ امیر خسرو وہ واحد شاعر ہیں، جنھوں نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہنے والوں کو بے حد متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی والے خسرو کو بڑے گرو سے اپنا کوی اور اردو والے بڑے فخر کے ساتھ اپنا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

اردو شاعری کی اہم صنف شعر، قطعہ، رباعی، مثلث، مخمس، مسدس، مثنوی، نظم، آزاد نظم، غزل، مرثیے، دوہے، سانیٹ، ترائیلے اور ماہیے وغیرہ قلم کی نوک سے اُتر کر قرطاس ابیض کی زینت بنے۔ ان کے علاوہ رزمیہ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی گئی۔ غزل کے لغوی معنیٰ خواتین سے گفتگو کرنے کے ہیں۔ وہ صنف سخن، جس میں عموماً حسن وعشق، وصال وفراق، شراب وشباب، یاس وحرماں اور تصوف ومعرفت وغیرہ کی باتیں کہی جائیں، کو غزل کہا گیا، لیکن غزل اس حد بندی کی پابند نہیں رہی۔ اب اس میں ہر قسم کے موضوعات ومسائل نظم کیے جاتے ہیں۔ غزل ہی وہ صنف ہے جس میں سب سے زیادہ لکھا گیا۔ اردو شعرا کے ذریعے غزل میں پیش کی جانے والی رومانیت اور ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر ہندی کے کویوں نے تجربے کے طور پر غزل کہنی شروع کی۔ اس طرح غزل کی مقبول ترین صنف بیسویں صدی کے وسط میں ہندی ادب میں داخل ہوگئی۔ مہاکوی سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، جے شنکر پرساد، جانکی ولبھ شاستری اور سمترا نندن پنت جیسے نامچین ہندی غزل کاروں نے دیگر زبان کے شعرا کی طرح رومانی شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس سب کے باوجود ہندی کے کویوں کو غزل گوئی میں وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا، جو اردو غزل میں مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، قائم چاندپوری، میر تقی میر، انشاء اللہ خان انشا، حیدر علی آتش، بہادر شاہ ظفر، ابراہیم ذوق، مرزا اسد اللہ خاں غالب، دیا شنکر نسیم، نواب مرزا داغ دہلوی، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، شبلی نعمانی، ڈاکٹر محمد اقبال، حسرت موہانی، شوکت علی خاں فانی بدایونی، برج نارائن چکبست، سیماب اکبرآبادی، تلوک چند محروم، علی سکندر جگر مرادآبادی، شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی، پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، اختر شیرانی، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، پنڈت بال مکند عرش ملسیانی، ن۔م۔ راشد، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، جاں نثار اختر، اختر الایمان، شکیل بدایونی، جگن ناتھ آزاد، کیفی اعظمی، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، قتیل شفائی، نریش کمار شاد، شاد عظیم آبادی، ساحر لدھیانوی، احمد فراز، جون ایلیا، شہریار، گلزار، ندا فاضلی، بشیر بدر اور جاوید اختر وغیرہ حاصل کر چکے تھے۔

دراصل، اس کی ایک وجہ یہ رہی کہ اردو میں کہی جانے والی غزلیں اردو کے علاوہ ہندی کے اخبارات و جرائد میں بھی شائع ہو رہی تھیں۔ اس طرح ہندی کے قاری اور شائقین کے ذہن کو متاثر کرنے اور قلوب کو چھونے والی اردو غزلیں دیوناگری رسم الخط میں آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی میں غزل کی شروعات کرنے والے کوی غزل گوئی ترک کرکے پھر سے اپنی روایتی شاعری کی طرف لوٹ گئے۔ دوسری جانب 1960 کی دہائی میں ہندی میں غزل کہنے والا ایک ایسا نام سامنے آیا، جسے شعر و اَدب کی دُنیا میں دشینت کمار تیاگی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دشینت کمار کے بھتیجے منوج کمار تیاگی نے بتایا کہ دشینت کمار کا اصلی نام دشینت نرائن سنگھ تیاگی تھا۔ اس بابت ان کے پاس دشینت جی کے ہاتھ کا لکھا ہوا دستاویز موجود ہے۔ انھوں نے شروعات میں پردیسی تخلص کے ساتھ شاعری کی، لیکن بعد میں دشینت کمار کے نام سے کوتائیں لکھیں۔

دشینت کمار کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع بجنور کی تحصیل نجیب آباد کے تھانہ منڈاولی کے چھوٹے سے گاؤں راج پورنوادا میں ایک زمیندار خاندان میں ہوئی۔ اُن کے والد کا نام بھگوت سہائے اور والدہ کا نام رام کشوری دیوی تھا۔ دشینت کمار کی شادی نومبر 1949 میں ضلع سہارن پور کی تحصیل ناگل کے گاؤں ڈنگیڑھا میں راجیشوری دیوی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان کی ایک بیٹی ارچنا تیاگی کے علاوہ دو بیٹے آلوک تیاگی اور اَپورو تیاگی ہیں۔ آکاش وانی دہلی میں کام کرنے والی بیٹی اور اس کے شوہر کا ایک ساتھ سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔ دشینت کمار کے جنم کو لے کر بھی ایک رائے نہیں ہے۔ دشینت کمار کی کتابوں میں ان کی پیدائش کی تاریخ یکم ستمبر 1933 درج ہے۔ اسکول کے دستاویز میں بھی دشینت کمار کے جنم کی تاریخ یکم ستمبر تحریر ہے، لیکن ہندی ساہتیہ پر گہری نگاہ رکھنے والے وجے بہادر سنگھ اس تاریخ کو درست نہیں مانتے۔ ان کے مطابق دشینت کمار کا جنم 27 ستمبر 1931 کو ہوا۔ یہ بات اپنے آپ میں کافی عجیب

اور حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ دشینت کمار کی شائع شدہ کتابوں میں درج ان کی تاریخ پیدائش کو دو برس چھبیس دن پہلے کی تاریخ کو اصلی قرار دیا جائے۔ تاریخ پیدائش کی بابت دشینت کمار کے بیٹے آلوک تیاگی کا اپنی ماں راجیشوری دیوی کے حوالے سے کہنا ہے کہ مہینے کی 27 تاریخ آتے آتے تنخواہ ختم ہو جاتی تھی اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے یومِ پیدائش پر فراخ دلی سے خرچ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے کنجوسی کے ساتھ جنم دِن منانے کی بجائے اپنی پیدائش کی تاریخ یکم ستمبر کر لی۔

دشینت کمار نے گاؤں کے پرائمری اسکول سے پنڈت چرنجی لال کی قربت کا فیض پاتے ہوئے بنیادی تعلیم حاصل کی۔ ہائی اسکول تحصیل دھام پور کے قصبہ نہٹور کے ایس این ایس ایم انٹر کالج سے کیا، جبکہ انٹر میڈیٹ کی تعلیم ضلع چندوسی کے اسکول میں مکمل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور وہیں سے ہندی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ دنوں تک کرتپور (بجنور) کے انٹر کالج میں درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ اس کے بعد میرٹھ چلے گئے۔ میرٹھ میں بھی مستقل سکونت اختیار کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ مرادآباد سے بی ایڈ کی ٹرینگ کرنے کے بعد 1958 میں آکاش وانی دہلی میں اسکرپٹ رائٹر کی نوکری لگ گئی۔ اس دوران دشینت کمار کو ڈاکٹر دھیریندر ورما اور ڈاکٹر رام کمار ورما جیسے بڑے ناموں کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا۔ حالانکہ اُنھوں نے 'پردیسی' تخلص کے ساتھ ہائی اسکول سے ہی شعر کہنے شروع کر دیے تھے، لیکن کہانی کار کملیشور اور مارکنڈے کے علاوہ دھرم ویر بھارتی، وجے دیو نرائن وغیرہ کی قربت میں ان کے اَدبی ذوق اور دلچسپی کو نئی جلا ملی۔ 1960 میں دشینت کمار اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی پا کر آکاش وانی بھوپال آگئے۔ انھوں نے مدھیہ پردیش کے سنسکرت ڈپارٹمنٹ کے تحت ہندی سیکشن میں بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ آکاش وانی میں پروڈیوسر بننے کی راہ ہموار ہوئی، تو عمر نے وفا نہیں کی اور ہندی غزل کا یہ درخشندہ ستارہ، جسے ہندی غزل کا سمراٹ کہا جاتا ہے، 30 دسمبر 1975 کو بھوپال میں غروب ہوگیا۔

دشینت کمار نے بھوپال میں سکونت کے دوران شاعری کی جانب اپنی توجہ مرکوز کردی۔ اس وقت وہاں اردو زبان کے ترقی پسند شاعر تاج بھوپالی اور کیف بھوپالی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بیسویں صدی کی جس دہائی میں تاج بھوپالی اور کیف بھوپالی کی غزل گوئی عروج پر تھی، اسی دورانیہ میں اَگیے اور گجانن مادھو کی مشکل نظموں نے ہندی اَدب میں دھوم مچا رکھی تھی۔ ناگارجن اور دھومل جیسے کچھ کوی ایسے ضرور تھے، جنھیں کسی خاص طبقے کی بجائے عام آدمی کے قریب محسوس کیا جاتا تھا۔ دشینت کمار اردو اور ہندی کے گھال میل سے پیدا ہوئے ہندوستانی شعری ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انھوں نے عام لوگوں کے درد، تکلیف اور پریشانی کو محسوس کیا اور اردو غزل کی طرز پر ہندی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ غزل کو ہندی میں گیتکا بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کی کتاب 'سائے میں دھوپ' کے پیش لفظ میں لکھا بھی ہے۔

'کہ اردو اور ہندی اپنے اپنے سنگھاسن (تخت) سے اتر کر جب عام آدمی کے بیچ آتی ہے، تو اس میں فرق کر پانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ میری نیت اور کوشش یہی رہی ہے کہ اِن دونوں بھاشاؤں کو زیادہ سے زیادہ قریب لا سکوں۔ اس لیے یہ غزلیں اس بھاشا میں لکھی گئی ہیں، جسے میں بولتا ہوں۔'

(سائے میں دھوپ': رادھا کرشن پرکاشن دریا گنج نئی دہلی، اشاعت؛ جنوری 2008، ص 1)

دشینت کا زمانہ رومانی شاعری کا دَور تھا۔ زیادہ تر شعرا حسن و جمال، حب وعشق، پیار و محبت، حزن وملال، وصل وفراق، کاکل وگیسو، لب ورخسار، سراپا اور معشوق کی اداؤں میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ اس نفیس قید سے باہر نکلنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ دشینت کمار نے اس دائرے کو توڑتے ہوئے غزلیں کہنی شروع کر دیں۔ انھوں نے لب ورخسار، حسن و شباب، طائر وصیاد اور گل وبلبل کے نغموں کو بالائے طاق رکھ کر غریب، نادار، مفلس، پریشان اور حال میں جی رہے عام آدمی کے درد کو محسوس کرتے ہوئے الگ راہ اختیار کی۔ ملک آزاد تھا، لیکن سیاسی شعور اور معاشرے میں پختگی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غلامی دَور میں دیکھا گیا آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے سے نہ تو غریبی دور ہو پا رہی تھی اور نہ ہی بھک مری رک پا رہی تھی۔ تعلیم زرداروں کی مٹھی میں قید تھی اور خوش حالی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ مزدور و زمیندار کے بیچ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ عوام سے کیے گئے وعدے کھوکھلے ثابت ہو رہے تھے۔ بدانتظامی کا یہ عالم تھا کہ عوامی نمائندے اور افسر شاہ سرکاری اسکیموں کو لوگوں تک پہنچنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ سرکاری امداد اور اسکیموں کے راستے میں ہی بندر بانٹ ہونے سے عوام پریشان تھے، جبکہ کچھ لوگ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سیاسی سطح پر نا اُمیدی کی جھلک معاشرے اور ادب میں صاف طور پر دکھائی دینے لگی تھی۔ کچھ اسی طرح کے خیالات ہندی کوی اَگیے کی کتاب 'کوی من' میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ستر کی دہائی میں لوگ بڑے بے چین اور فکر مند تھے۔ اسی بے راہ روی اور نابرابری کے سبب تلخ سے تلخ تر ہوتے حالات نے دشینت کمار کے قلب میں باغیانہ عنصر پیدا کر دیا۔ انتظامیہ کے ناکارہ پن سے نالاں دشینت کمار نے انقلاب زندہ آباد کے نعرہ اُگلتے پرچم کو ہی اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ وہ آگ اُگلتے شعر کہنے پر بھی مجبور ہو گئے۔ اس شاعر کے اشعار میں بدعنوانی، سرکار اور افسر شاہی کے خلاف ان کے باغیانہ تیور کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔

یہاں تک آتے آتے سوکھ جاتی ہیں کئی ندیاں
مجھے معلوم ہے پانی کہاں ٹھہرا ہوا ہوگا

دشینت کی غزلیں ہندی اَدب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ 1975 میں شائع ہونے والے 52 غزلوں کے مختصر شعری مجموعے'سائے میں دھوپ' میں اسی ہیئت کا کلام موجود ہے۔ دشینت کمار نے اردو میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی، لیکن اپنی غزلوں میں ہندی کے مقابلے اردو الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ این سی ای آر ٹی کے نصاب میں درجہ گیارہ کی ہندی کی کتاب میں شامل دشینت کی غزل 'کہاں تو طے تھا چراغاں ہر ایک گھر کے لیے،....' کے سات شعروں میں اردو کے 26 ایسے الفاظ ہیں، جن کے معنی ٹیچر کو ہندی میں بتانے پڑتے ہیں۔ شاید اسی بنا پر کچھ لوگ اُنھیں اردو کا شاعر مانتے ہیں، جبکہ دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی وجہ سے انھیں ہندی کا کوی کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔ دشینت خود کو ہندی غزل کار تو مانتے تھے، لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ان کی غزلیں کبھی بھی اردو یا ہندی کی پابند نہیں رہیں، بلکہ عام لوگوں کی ہندوستانی زبان میں کہی گئی ہیں، تاکہ ہر کوئی انھیں آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے۔ ان پر غزل کی بحر میں وَزن کا خیال رکھے بغیر اردو کے کئی الفاظ کا غلط استعمال کرنے کا الزام لگا۔ علم عروض سے واقفیت رکھنے والے لوگوں نے سخت اعتراض کیا۔ شعرا کے اعتراض کے جواب میں دشینت کا کہنا تھا کہ اردو کے لفظ 'شَہر' کو عام لوگ ہندی لفظ 'نگر' کے وزن میں 'شہَر' بولتے ہیں۔اسی لیے 'شَہر' کو 'شہَر' لکھا گیا۔ دشینت کمار غزلوں کے تعلق سے لکھے جانے والے مجموعوں کے لیے پیش لفظ کو ضروری نہیں مانتے۔انھوں نے اس بابت اپنی غزلوں کے مجموعے'سایہ میں دھوپ' کے پیش لفظ میں لکھا بھی ہے۔

'میں سویکار (قبول) کرتا ہوں....

کہ غزلوں کو بھومِکا (پیش لفظ) کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔لیکن ایک کیفیت اِن کی بھاشا کے بارے میں ضروری ہے۔ کچھ اردو داں دوستوں نے کچھ اردو شبدوں (الفاظ) کے پریوگ (استعمال) پر اعتراض کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ شبد (لفظ) 'شَہر' نہیں 'شہَر' ہوتا ہے، 'وَزَن' نہیں 'وَزن' ہوتا ہے۔

کہ میں اردو نہیں جانتا، لیکن ان شبدوں کا پریوگ یہاں اَگیا تو ش (نادانستہ طور پر) نہیں، جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ 'شَہر' کی جگہ 'نگر' لکھ کر اس دوش (خامی) سے مُکتی (خلاصی) پا لوں، کِنتو (لیکن) میں نے اردو شبدوں کو اس رُوپ (شکل) میں استعمال کیا ہے، جس روپ میں وے (وہ) ہندی میں گھل مل گئے ہیں۔ اردو کا 'شَہر' ہندی میں 'شہَر' لکھا اور بولا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے ہندی کا 'برہمن' اردو میں 'برہمن' ہوگیا ہے اور 'رِتو' 'رُت' ہوگئی ہے۔(ایضاً)

دشینت کی غزلیں انقلابیت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔شاید ہی کوئی ایسی غزل ہو، جس میں امارت اور بد نظمی کے خلاف باغیانہ تیور کے شعر موجود نہ ہوں۔ ان کے درجنوں اشعار کو ایسی شہرت ملی کہ اُنھیں جار حیت کے خلاف بطور احتجاج استعمال کیا گیا۔ احتجاجوں میں شامل لوگوں میں جوش وخروش کی چنگاریاں پیدا کرنے کے لیے نعروں کے طور پر ان کے اشعار استعمال کیے گئے۔

ہو گئی ہے پیر پربت سی پگھلنی چاہیے
اس ہمالہ سے کوئی گنگا نکلنی چاہیے

30 دسمبر 1975 کو حرکت قلب بند ہونے سے 42 برس کی کم عمر میں دشینت کا انتقال ہوگیا۔ حالانکہ اس ادیب و شاعر نے اپنے پیچھے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے، ان میں غزلیاتی مجموعہ'سائے میں دھوپ' کے علاوہ نظمی مجموعے 'سورج کا سواگت'، 'آوازوں کے گھیرے' اور'جلتے ہوئے بن کا بسنت'، نظمی ڈرامہ'ایک کنٹھ وِش پائی'، ڈرامہ'اور مسیحا مرگیا'، ناول'چھوٹے چھوٹے سوال'، 'آنگن میں ایک وِرکش' اور'دوہری زندگی' اور مختصر کہانیاں'من کے کونڑ' شامل ہیں، لیکن اُنھیں بام عروج پر پہنچانے میں ان کی غزلوں کا اہم کردار ہے۔

ہندی غزل کے ذریعے عام آدمی کے دل میں جگہ بنانے والے سادہ زندگی کے پیکر دشینت بالا بلند خیالات کے مالک تھے۔معاشرے کے تئیں ان کی فکر وسوچ میں بہت گہرائی تھی۔انھوں نے مزدور، کسان، غریب، مجبور، تفریق اور سماجی نابرابری کے تشدد کا نشانہ بنے لوگوں کا نہ صرف قریب سے مشاہدہ کیا، بلکہ ان کے درد کو اپنا درد سمجھتے ہوئے ان کی آواز کو اپنی شاعری کی پرواز دی۔اس زمانے میں اردو شعرا تو فارسی کے دقیق الفاظ کے سمندر سے باہر نکلنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے، لیکن ہندی شاعری میں مشکل الفاظ کے استعمال کو کوی کی قابلیت کا پیمانہ تسلیم کیا جاتا رہا۔ دشینت نے اسے سنجیدگی سے لیا۔ انھوں نے عام لوگوں کے سر سے گزر جانے والے سنسکرت اور فارسی کے غیر آسان الفاظ کو ترک کرکے ان کی جگہ آسان ہندی اور عام بول چال کے اردو الفاظ کو معاشرے سے اَخذ کرکے اَشعار کہے، جسے عام و خاص لوگوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

میں جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں
وہ غزل آپ کو سناتا ہوں

دشینت ہندی غزل کے ایسے عظیم شاعر ہوئے، جو اپنے آس پاس اور معاشرے میں موجود مسائل کا انتخاب کرکے شعر میں ڈھالنے کا ہنر تو جانتے ہی تھے، انتظامیہ پر زبردست چوٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

کہاں تو طے تھا چراغاں ہر ایک گھر کے لیے
کہاں چراغ میسر نہیں شہر کے لیے

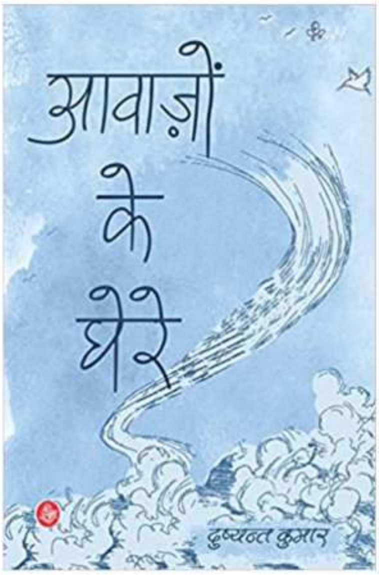

دشینت کو ہندی غزل کا بانی اور قائد اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جس زمانے میں شاعری کی وہ زمانہ اردو غزل کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ نوابوں کی مجلسوں اور بادشاہوں کی محفلوں سے باہر نکل کر رؤسا کے دالانوں کو رونق بخشنے والی اردو غزلیں مشاعروں کی شان ہوتی تھیں۔ دشینت نے غزل کی خوبصورت صنف کو نہ صرف اردو کی طرح ہندی میں آزمانے کا بیڑا اُٹھایا، بلکہ ہندی کے دلدادہ اس نوجوان شاعر نے وہ کارنامہ کر دکھایا، جس کی ہمت اس وقت کے بڑے سے بڑے ہندی کوی نہیں کر پائے۔

ہندی کے بیباک شاعر و ادیب دشینت نوکری کے سلسلے میں نہ صرف ضلع بجنور، بلکہ اتر پردیش سے باہر رہے۔ آخر میں وہ مدھیہ پردیش کے دارالخلافہ بھوپال پہنچے اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے۔انھوں نے بھوپال میں رہ کر اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔ مدھیہ پردیش کی حکومت نے ہندی غزل کے شہنشاہ دشینت کمار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بھوپال میں ان سے منسوب ایک میوزیم قائم کیا۔ ایک شاہراہ کا نام بھی دشینت کے نام پر رکھا گیا۔ 28 ستمبر 2009 میں مدھیہ پردیش کے گورنر نے ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا، لیکن ان کی جنم بھومی ضلع بجنور یا صوبہ اتر پردیش میں انھیں وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا، جس کے وہ حق دار تھے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اَب اُن کے گاؤں میں بھی لوگ انھیں بھولتے جا رہے ہیں۔

■

M. A. Kanwal Jafri
127/2, Jama Masjid, Neendru
Tehsil Dhampur
Distt.: Bijnor - 246761 (UP)
Mob.:9917767622

لعل و گہر

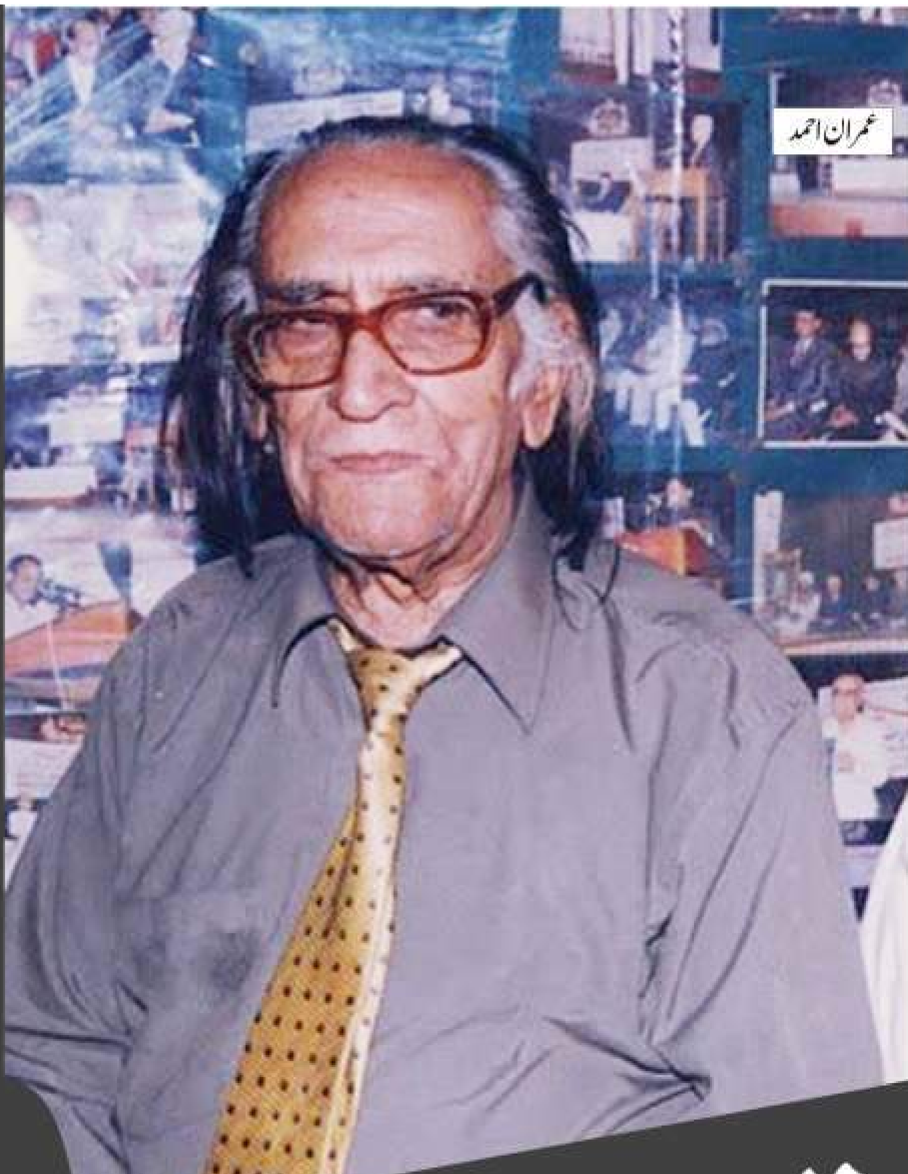

عمران احمد

تنویر احمد علوی بحیثیت شاعر

مجھے جیب خرچ کے لیے جو پیسے ملتے تھے ان سے میں غزلیہ شاعری کے چھوٹے چھوٹے مجموعے خرید لیتا تھا اور اس صندوقچی میں انھیں سینت کر رکھتا تھا۔ جواب کھلونوں سے خالی ہوگئی تھی۔ میں ان دنوں میں قرآن پاک پڑھتا تھا اور اردو کی لکھائی پڑھائی سے کوئی واسطہ نہ تھا لیکن اپنا جمع کیا ہوا یہ شعری سرمایہ مجھے بہت عزیز تھا اور بہت اچھا لگتا تھا۔

تنویر احمد علوی کا شمار اردو کے معروف و مشہور محققین میں ہوتا ہے۔ ان کی تحقیقی بصیرت اور محققانہ کاوشوں کو اردو ادب میں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے ترتیب متن جیسے اہم موضوع پر کام کر کے بہت سے ادبی سرمائے کی بازیافت کی ہے۔ تنویر احمد علوی نے تحقیقی کاوشوں کے ساتھ ادب کی دوسری اصناف میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ وہ تنقید کے ساتھ ساتھ تاریخ و ترجمے سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ علوی صاحب تحقیق اور تدوین کے علاوہ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔

تنویر احمد علوی اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر کے قصبہ کیرانہ کے محلہ انصاریان میں 23 جولائی 1923 کو پیدا ہوئے۔ تنویر احمد علوی کے والد کا نام حکیم صدیق احمد علوی اور والدہ کا نام صغرا بیگم تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا انتقال ہوگیا تھا۔ علوی صاحب کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں چچا منشی شفیق احمد نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز کیرانہ سے ہوا، اس کے بعد 1936 میں عربی و فارسی کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ 1942 میں فن طب کی تعلیم کے لیے پٹیالہ آئے۔ انھوں نے B.A. اور M.A کی تعلیم آگرہ یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے 1960 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 'ذوق: سوانح اور انتقاد' جیسے اہم موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1970 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں اپنی تاریخ کی پہلی ڈبل ڈاکٹریٹ (آرٹس زمرے میں) کی ڈگری عطا کی۔ یہ ڈگری علوی صاحب کے لیے کسی بڑے اعزاز سے کم نہ تھی۔ ہریانہ اردو اکادمی نے علوی صاحب کی تحقیقی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کل ہند سطح کے سب سے بڑے قومی ایوارڈ 'حالی ایوارڈ' برائے سال 1989-90 سے نوازا۔ اس کے ایک سال بعد اردو اکادمی دہلی نے تحقیق و تنقید ایوارڈ 'ازراہ علم' سے نواز کر علوی صاحب کی قدر دانی کی۔ اردو اکادمی دہلی نے علوی صاحب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں 'بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' 2004 سے سرفراز کیا۔ بالآخر 20 فروری 2013 کی شام وہ اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ تنویر احمد علوی کی ادبی زندگی کا آغاز دارالعلوم دیوبند سے ہوا۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شعر و شاعری سے کیا۔ وہ بچپن ہی سے شعر و سخن سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ کیرانہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں ضرور حصہ لیتے تھے۔ جب آپ دیوبند پہنچے تو اردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا اور یہ دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی۔ بچپن میں آپ کو اپنے خرچ کے لیے جو پیسے ملتے اس سے کتابیں خرید لاتے اور بڑے انہماک سے مطالعہ کرنے کے بعد اسے صندوق میں رکھ دیتے تھے۔ اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''مجھے جیب خرچ کے لیے جو پیسے ملتے تھے ان سے میں غزلیہ شاعری کے چھوٹے چھوٹے مجموعے خرید لیتا تھا اور اس صندوقچی میں انھیں سینت کر رکھتا تھا۔ جواب کھلونوں سے خالی ہوگئی تھی، میں ان دنوں میں قرآن پاک پڑھتا تھا اور اردو کی لکھائی پڑھائی سے کوئی واسطہ نہ تھا لیکن اپنا جمع کیا ہوا یہ شعری سرمایہ مجھے بہت عزیز تھا اور بہت اچھا لگتا تھا'' (لمحوں کی خوشبو ص 7)

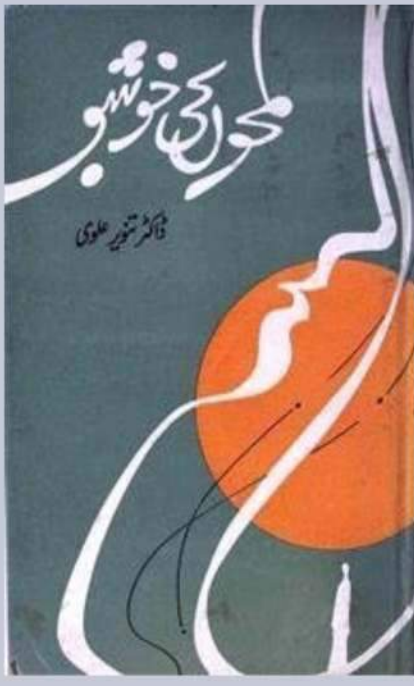

درج بالا اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ انھیں شعروشاعری سے کس قدر لگاؤ تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں شعرا کے کلام کو سنتے اور نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میلاد، شادی اور دوسرے اہم موقعوں پر یاد کیے گئے کلام کو سناتے اور اسی طرز پر خود لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کے کلام سے بے حد متاثر تھے۔ ان کا یہ تجسس اتنا بڑھا کہ ایک دن خود سے شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ایک دن انھوں نے چند شعر کہہ بھی ڈالے۔ اس کے بعدان سے شعر کہنے کی فرمائش کی جانے لگی۔ اس طرح علوی صاحب کے شعری سفر کا آغاز ہوا۔ علوی صاحب کی ایک فارسی غزل 'الہام فطرت' ہفتہ وار رسالہ 'دین دنیا' میں شائع ہوئی۔ یہ رسالہ اس وقت دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ علوی صاحب کی ادبی دنیا سے یہ پہلی تعارفی تخلیق تھی۔ انھوں نے یہ غزل اپنے استاد مولوی مسعود کی تقلید میں لکھی تھی۔ علوی صاحب اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

مشرقی امتحانات کی تیاری کے زمانے میں اپنے استاد مولوی مسعود صاحب کی دیکھا دیکھی خود میں نے اپنے طور پر شعر کہے، اس بار فارسی میں ایک غزل لکھی 'الہام فطرت' کے عنوان سے میری ایک شعری تخلیق 'دین دنیا' ہفتہ وار دہلی میں شائع ہوئی تھی اور میرا اس وقت کی ادبی دنیا سے پہلا تعارف تھا۔'' (لمحوں کی خوشبوص 9)

تنویر احمد علوی جب پٹیالے میں فن طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس زمانے میں ان کے شعری ذوق میں بے حد اضافہ ہوا۔ علوی صاحب جب پٹیالے میں زیر تعلیم تھے، اس وقت وہاں کے ایک مشاعرے میں نظم 'رقاصہ' پیش کی جسے بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک اور نظم 'زندگی کے لیے' کے عنوان سے لکھی۔ اس نظم کو علوی صاحب کی ادبی فکر میں ایک نیا ابتدائی نقش اور نقطۂ ہجرت یا Point of Departure کہا جاسکتا ہے۔ اس نظم پر چاند بہاری لال بھٹنا گر جو آپ کے عزیز دوستوں میں تھے، انھوں نے ایک تبصرہ لکھ کر علوی صاحب کے پاس بھیجا تھا۔ انھوں نے اس خط میں علوی صاحب کی شعری خوبیوں کی خوب پذیرائی کی تھی۔ تنویر احمد علوی، ساحر لدھیانوی کے شعری کلام سے بہت متاثر تھے۔ ساحر لدھیانوی کا انداز شعر گوئی علوی صاحب کو نہ صرف پسند تھا بلکہ وہ ان کی تقلید کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ 1947 میں تقسیم ملک کے وقت فسادات رونما ہوئے۔ ان فسادات نے اہل قلم کو لکھنے کے لیے مضطرب کردیا۔ علوی صاحب نے ان فسادات پر ساحر لدھیانوی کی طرز پر 'آگ کا بدن'، 'بے آواز چیخ' اور 'ننگے ہتھیار' جیسی نظمیں تحریر کی ہیں۔

تنویر احمد علوی جب 1940 میں دارالعلوم دیو بند سے فارسی کی تعلیم مکمل کر کے گھر آئے تو انھوں نے فرصت کے اوقات میں احسان دانش کے شعری مجموعے 'نوائے کارگر'، 'نفیر فطرت' اور 'جادۂ نو' کا بغور مطالعہ کیا۔ ان تینوں مجموعوں کو انھوں نے بڑے انہماک سے پڑھا، ساتھ ہی انھوں نے کچھ نظمیں بھی انھیں کی طرز پر تحریر کیں۔ علوی صاحب لکھتے ہیں:

''ان شعری مجموعوں کو میں نے بے حد شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا بار بار دیکھا یہاں تک کہ ان میں شامل بعض نظموں کے انداز پر خود بھی شعر کہے اور ایک دو نظمیں لکھیں، یہ میری شاعری کی پرانی بیاضوں میں کافی دنوں تک نقل ہوتی رہیں۔'' (لمحوں کی خوشبوص 8)

تنویر احمد علوی نے ابتدائی دور میں عرش ملسیانی اور ساغر نظامی کے شعری طریقۂ کار کے اثر کو بھی قبول کیا۔ انھوں نے سہارنپور کے ایک مشاعرے میں اپنی ایک نظم 'آئین اسٹائن' کو پڑھا تھا۔ اس مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد اور گلزار دہلوی موجود تھے۔ ان شعرا کی جانب سے علوی صاحب اور ان کے کلام کی خوب پذیرائی ہوئی۔ البتہ کسی رسالے میں شائع ہونے والی پہلی اردو نظم 'نذر شباب' تھی جو نگار میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کو نیاز فتح پوری نے بہت پسند کیا تھا۔ پٹیالے میں قیام کے دوران آپ نے جو نظمیں کہیں ان پر مشتمل دو شعری مجموعے انھوں نے ترتیب دیے۔ پہلا مجموعہ 'تار رباب' اور دوسرا 'نقش و نوا' ہے۔ دونوں مجموعوں کو انھوں نے احسان دانش کی شاعری سے معنون کیا تھا۔ لیکن ان دونوں مجموعوں کو کبھی شائع نہیں کیا۔ البتہ 'زندگی کے لیے'، 'آئین اسٹائن' اور 'نذر شباب' جیسی اہم نظموں کو بعد کے مجموعے میں شامل کیا۔ پٹیالے سے واپسی کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ریسرچ کے لیے داخلہ لیا۔ اس درمیان وہ تحقیق و تدوین کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دوران تحقیق مصروفیات کی وجہ سے شعروسخن پر توجہ نہ دے پائے۔ ان کا شاعری سے اس درمیان برائے نام ہی واسطہ رہا ہے۔ وہ ان حالات و واقعات کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''شعروسخن سے میری دلچسپیاں جاڑے کے عالم خواب کی طرح کافی زمانے تک میرے ذہن سے چھوٹی رہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اپنے ادبی سفر کے سلسلے میں میری بنیادی وفاداری شعروسخن ہی سے رہی۔ میں نے علمی و تحقیقی کام میں بھی شعروشعور کے تنقیدی تاریخی اور تہذیبی مطالعہ کو پیش نظر رکھا۔ میری زبان اور طرز بیان پر شاعرانہ دلچسپیوں کا گہرا اثر شروع سے آخر تک رہا۔''

(لمحوں کی خوشبوص 16)

درج بالا اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریسرچ کے زمانے میں علوی صاحب کی جتنی دلچسپی تحقیق وتدوین سے تھی اتنی شعر و شاعری سے نہ تھی۔ علوی صاحب ریسرچ کے بعد جب پاکستان کے سفر پر گئے تو ان میں ایک بار پھر شعر گوئی کی تحریک پیدا ہوئی۔ علوی صاحب میں یہ تحریک ہندی اور سنسکرت شاعری اور پراکرتوں کے مطالعے سے پیدا ہوئی۔ علوی صاحب نے ہندی کے وسیلے سے کہا تھا کہ میری سب سے خوبصورت یادگار شعری تخلیق 'پریہ سندیش' ہے۔ وہ کیرانہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں حفیظ میرٹھی کے ساتھ شرکت فرماتے اور اپنی نظمیں پیش کرتے تھے۔ البتہ دوسرے مقامات پر ہونے والے آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ دہلی اور سہارنپور میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں صدر مشاعرہ جگن ناتھ آزاد اور ناظم گلزار دہلوی کے علاوہ دیگر شرکا سے داد وتحسین ملی۔ علوی صاحب دہلی کے مشاعروں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''دہلی کے دو مشاعروں میں بھی شرکت کا موقع ملا، جہاں میں عرش ملسیانی اور ساغر نظامی کے ساتھ گیا تھا مشاعروں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے شاعر کی حیثیت سے اپنے ادبی مستقبل بالخصوص مشاعروں کی داد کی طرف سے خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اگر چہ عرش ملسیانی مرحوم میری شاعری کو پسند کرتے تھے۔ اور انھوں نے ایک بار میرا اور

لعل و گہر

صادقین صدق کا تعارف شاعر ان فردا Poets of tomorrow کے طور پر آل انڈیا ریڈیو سے کرانا چاہا تھا۔'' (لمحوں کی خوشبوص 12)

تنویر احمد علوی کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ پہلا مجموعہ 'لمحوں کی خوشبو' ہے جس کی اشاعت 1988 میں ہوئی۔ دوسرا شعری مجموعہ 'رقص لمحات' ہے جسے 1998 میں شائع کیا گیا۔ وہ شاعری میں تنویر تخلص کرتے تھے۔ پہلے شعری مجموعے میں نظموں کے انتخاب کے علاوہ چند غزلیات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان غزلیات کو 'عناصر اربعہ' کی حیثیت حاصل ہے۔ ان غزلوں میں کچھ فارسی غزلیات (گل خوشبو) کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ پہلے مجموعے میں شامل چند اہم نظموں میں پہلی نظم 'نذر شباب' ہے۔ دوسری نظموں میں 'قلوپطرہ، فراق، کرۂ ارض، سائنس داں، عوام اور کائنات، گوتم بدھ، اجنتا اور ایلورا، زلیخا اور سالومی وغیرہ اہم ہیں۔ مجموعہ 'لمحوں کی خوشبو' میں علوی صاحب کا ایک خودنوشت نامہ بھی ہے۔ اسی مجموعے میں شامل ایک نظم کتاب کے نام کی مناسبت سے 'لمحوں کی خوشبو' کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ علوی صاحب اپنے اس مجموعے کو متعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس مجموعے میں زیادہ تر نظمیں ہیں اور نظم نگاری ہی شروع سے آخر تک میری شعری دلچسپیوں کا مرکز بنی رہی۔ چند غزلیں بھی ہیں جن میں فارسی کی بھی دو تین غزلیں موجود ہیں اور غزلوں میں دو چار ایسی بھی ہیں جو سلیم احمد مرحوم کی وفات حسرت آیات کے بعد لکھی گئیں اور جو اس یار عزیز کے لیے میری طرف سے ایک نذرانہ خلوص ہے۔ آخر میں چند نظمیں فارسی زبان میں ہیں جنھیں 'گل خوشبو' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ اردو کی طرح فارسی میں کہے گئے بہت سے اشعار کا یہ انتخاب بھی مختصر ہے اور متعدد نظمیں اور بہت سے قطعات اس میں شامل نہیں ہیں۔'' (لمحوں کی خوشبوص 21)

درج بالا اقتباس سے یہ پتا چلتا ہے کہ مجموعہ 'لمحوں کی خوشبو' میں نظموں کے علاوہ چند غزلیات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ علوی صاحب ابتدا میں غزل کہتے تھے لیکن بہت جلد وہ نظموں کی طرف رجوع ہوئے۔ اس کی وجہ ان کا مطالعہ، تجسس اور اس عہد کے خارجی حقائق کا تجربہ تھا۔ علوی صاحب اپنی غزلوں اور نظموں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ تنویر احمد علوی نے اپنے محبّ جناب سلیم احمد کی وفات پر چند اشعار لکھے تھے۔ ملاحظہ ہوں۔

یہی تو حادثہ ناگہاں سا لگتا ہے
یقین تھا جو کبھی اب گماں سا لگتا ہے
لبوں سے جس کے سدا پھول جھڑتے رہتے تھے
یہی وہ شخص ہے جو بے زباں سا لگتا ہے

تنویر احمد علوی کے دوسرے شعری مجموعے کا نام 'رقص لمحات' ہے۔ اس میں پہلے اردو غزلیں اور پھر نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ اسی مجموعے میں نظموں کے مقابلے غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم 'صدائیں' ہے۔ دوسری اہم نظموں میں زوال آدم، اہرام، دیوار چین، کونارک اور آخر میں بعنوان اسلام اور راج گھاٹ وغیرہ اہم ہیں۔ اس مجموعے کا پیش لفظ پروفیسر قمر رئیس نے لکھا ہے جس میں انھوں نے علوی صاحب کی شعری خصوصیات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ علوی صاحب ان شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی غزلیں بہ یک وقت ان کے مشاہدے اور عملی تجربے کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے مطالعے کے ذریعے زندگی کے ہر موڑ پر کچھ نئے تجربے کیے ہیں۔ اس کا اندازہ قاری کو ان کے مجموعے پر ایک نظر ڈالنے ہی سے ہو جاتا ہے:

''ان کی غزل نئی عصری حسیّت کی بھی نمائندگی کرتی ہے اور تخلیقی شعریت کی بھی جو ان کے ادبی شعور سے عبارت ہے۔ بہت ہی کم غزلیں ایسی ہیں جو دوسروں کی سرزمینوں میں لکھے ہوں اور جہاں ایسا ہوا بھی ہے غالباً ان کی شعوری یا نیم شعوری کوشش یہ رہی ہے کہ وہ پیروی سے بچتے ہوئے آگے بڑھیں اور اس معنی میں ان کے قدموں کے نیچے ان کی اپنی زمین ہو۔ ان کی بیشتر غزلوں پر ان کے ذاتی تجربے اور ذہنی تجربے کی پرچھائیں کہیں واضح اور کہیں نیم واضح صورت میں ملتی ہیں ان میں تلخ مسکراہٹیں بھی شامل ہیں اور شیریں آنسو بھی۔'' (رقص لمحات ص 21)

تنویر احمد علوی کی غزلوں کے موضوعات میں بڑی وسعت نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے مطالعے اور تجربے کی روشنی میں زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ علوی صاحب کو تاریخ سے بے حد دلچسپی تھی۔ تاریخ انسانی تہذیب کا اثاثہ ہے۔ ان میں چاہے جو تاریخی شخصیات و مقامات ہوں، انھوں نے ان سب کو بنیاد بنا کر غزلوں کی تخلیق کی ہے۔ ان کے اشعار ہر طرح کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ اگر خوبصورت شے کے دلدادہ تھے تو دوسری طرف انھوں نے سماجی و معاشرتی پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے۔ ان کے اشعار میں خاص کر مسلم معاشرے کی تعلیمی زبوں حالی کا عکس نظر آتا ہے۔ قوم و ملّت کے تئیں ہمدردانہ رویہ طالب علمی کے زمانے سے ہی رہا ہے۔ علوی صاحب نوجوان طبقے سے مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ انھیں غم و ویاس کے دائرے سے باہر نکل کر منزل کو دیکھنا چاہیے جس کے ذریعے انسان سماج و معاشرے کے ساتھ ساتھ خود اپنی زندگی کے چراغ کو روشن کر سکے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کچھ عجب حالت ہے راہ منزل مقصود کی
جتنا جتنا میں بڑھا میرا سفر بڑھتا گیا
یہ کائنات یہ تنظیم ثابت و سیار
فقط زمین و زماں کے سوا کچھ اور بھی ہیں
مُسکرائیں جس طرح تارے، نقاب ابر سے
سرو کی آغوش سے، جس طرح اُبھرے ماہتاب

تنویر احمد علوی کی نظموں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر موضوعاتی نظمیں لکھی ہیں۔ حیات وکائنات سے متعلق مختلف موضوعات پر ان کی نظمیں ان کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ علوی صاحب نے جہاں ایک طرف عوام و کائنات سے متعلق نظمیں لکھی ہیں تو وہیں دوسری جانب انھوں نے عظیم شخصیتوں اور تاریخی مقامات سے متعلق نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان نظموں میں گوتم بدھ، زلیخا، قلوپطرہ، آئین اسٹائین، سالومی، اجنتا، ایلورا اور راج گھاٹ وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیگر اہم موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ انھوں نے 'سائنس داں، کسبی اور باندی، U.N.O پر نظمیں لکھ کر اہل ادب سے انھیں متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ تنویر احمد علوی نے اپنی نظم 'کرۂ ارض' میں مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے خیال و تصور کو اشعار کی کڑی میں پرو کر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

رنگ بھر دے، جس طرح پھولوں میں نقاش سحر
بخش دے پہلی کرن جیسے افق کو آب و تاب
نرم ہلکوروں سے جیسے کھلکھلا اُٹھیں کنول
اور ٹکرا کر کنول سے جس طرح ٹوٹے حباب
پھول افسانہ بھی افسوں بھی ہے لیکن تنویر
چشم خوں بستہ نیا طرز سخن مانگے ہے

درج بالا اشعار میں تنویر احمد علوی نے مناظر فطرت کے گوناگوں پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی اس نظم میں کائنات کے مختلف حصوں کی ترجمانی کی ہے۔ اس نظم میں صحراؤں کے خوب صورت نظارے، سمندر کی لہریں، چمن کے گل چیں، اندھیری راتوں میں ستاروں کا جگنوؤں کی طرح چمکنا، جنگلوں میں پپیہے کی آواز اور نظام شمسی کے تحت دن رات کا ہونا وغیرہ کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ علوی صاحب نے نظم 'قلوپطرہ' کو چھوٹی بحر میں لکھا ہے۔ اس بحر میں انھوں نے اپنی فنکارانہ بصیرت کے ذریعے نظم کے کردار کو سامنے

لانے کی کوشش کی ہے۔علوی صاحب کی بیشتر نظمیں توضیحی طور کی ہوتی ہیں لیکن کچھ نظمیں اس سے ہٹ کر بھی تخلیق کی گئی ہیں۔ان کی نظم 'فراق' اس پایے کی نظم ہے،جس میں شاعر نے نظم کو روانی اور بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس نظم میں آٹھ بندوں کے بعد 'بنسری بجتی رہی' کی تکرار ہوتی ہے۔بنسری بجنے سے مراد شاعر نے زندگی کو رواں دواں رہنے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

تنویر احمد علوی کی نظم 'اجنتا اور ایلورا' کا عنوان لافانی ہے۔اس نظم کے ذریعے اجنتا اور ایلورا کے فنون لطیفہ سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔اجنتا اور ایلورا میں پتھروں کو تراش کر انسانی مجسمے بنائے گئے ہیں جو اس عہد کی انسانی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔علوی صاحب نے بہت سی نظموں کی تخلیق مختلف تصویروں کو دیکھ کر کی ہے۔ وہ اپنی شعری خصوصیات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''لمحوں کی خوشبو، بساط شب، ملکۂ کوہسار مری، زلیخا اور سالومی اسی ذہنی زندگی اور تخلیقی حسیّت کے پرتوں کو پیش کرنے والی نظمیں ہیں۔میری شعری تخلیقات کے سلسلے میں ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ میں نے بعض نظمیں تصویروں کو دیکھ کر لکھی ہیں۔'قلو پطرہ' بنسری بجتی رہی، کھاجوراہو، زلیخا، مدارج حیات، فطرت سے دریوزہ کائنات اور سالومی، بنیادی طور پر ان کی تصویروں ہی کا تحریری عکس ہیں جنھیں میں نے اپنے تاثرات، مطالعہ اور مشاہدہ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔'' (لمحوں کی خوشبو ص 16)

تنویر احمد علوی اپنے پہلے مجموعے میں شامل نظم 'سالومی' کے بڑے دلدادہ تھے۔انھوں نے اس نظم کی شعری سطح، موضوع، کردار کے مطالعے کو اپنے طور پر سمجھنے اور اس کی بازیافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ علوی صاحب کو اس نظم سے جذباتی لگاؤ تھا۔دراصل اس نظم کا محرک ایک تصویر اور روایت کی تاریخ پر مبنی ہے۔اس نظم کی تاریخی روایت سے اہل ادب بخوبی واقف ہوں گے۔ اس نظم کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔سرزمین فلسطین کی ایک شہزادی سالومی کے واقعے کو اشعار میں پرو کر پیش کیا گیا ہے۔سالومی کا واقعہ مقدس کتاب انجیل میں بھی پایا جاتا ہے۔نظم 'سالومی' 88 بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں چار مصرعوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔نظم کے ابتدائی بندوں میں علوی صاحب نے سالومی کے حسن و جمال اور اس کی خوبصورتی کا حال پیش کیا ہے۔انھوں نے نظم میں مختلف تشبیہات و استعارات کے حوالے سے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

اور وہ زُلفوں کے ریشمی سائے
حلقہ در حلقہ دام پھیلائے
اپنی رعنائیوں سے نکھری ہوئی
جیسے پھولوں پہ رات بکھری ہوئی
گنجِ گل میں بہار آتی ہوئی
بوئے زلفِ نگاہ آتی ہوئی
خوشبوؤں میں وہ رنگ ملتے ہوئے
پھول شاخ ادا میں کھلتے ہوئے

درج بالا اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نظم سالومی کے ابتدائی بندوں میں اس کے حسن و جمال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔اس کے بعد جیسے جیسے اس کی عمر میں تبدیلیاں آتی گئیں، ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس نظم میں یوحنا اور سالومی کے جذبات عشق کا ذکر ملتا ہے۔

تنویر احمد علوی ایک ایسے شاعر تھے جن کا شعر و سخن میں کوئی استاد نہ تھا۔وہ اپنے کلام میں کسی سے اصلاح نہ لیتے تھے بلکہ خود ہی تنقید کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔وہ اپنے کلام کو بار بار پڑھتے اور ان کی اصلاح خود ہی کرتے۔ان کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ اپنے اشعار کو خوب سے خوب تر بنائیں۔علوی صاحب نے اپنی شعری تخلیقات کے تعارف اور ادبی شناخت کے لیے کبھی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ان کا خیال تھا کہ یہی نظمیں ان کی شناخت بنیں گی۔علوی صاحب اپنی شعری خصوصیات کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اپنی شاعری اور شعری تخلیقات کو میں نے ہمیشہ خود ہی تنقیدی نگاہ سے دیکھا ہے۔شعر و سخن میں میرا کوئی استاد نہیں۔ اپنے بہت سے شعروں اور نظموں میں جتنی تبدیلیاں میں نے کی ہیں اس سے زیادہ کا تصور میرے لیے تو ذرا مشکل ہے، بعض شعر اور متعدد نظمیں تو زبان قلم سے صفحہ قرطاس پر آنے کے بعد حک و اصلاح کے عمل سے اتنی بار گزری ہیں کہ ابتدا اور انتہا کے مابین نہ جانے کتنے ذہنی فاصلے اور واردے حائل ہو گئے۔میرے یہاں شعر گوئی کوزہ گری اور بت تراشی کے عمل سے مشابہ ہے محض آمد سخن سے نہیں۔'' (لمحوں کی خوشبو ص 17)

تنویر احمد علوی نے جہاں ایک طرف شعر کے لیے ضروری لوازمات کی طرف اشارہ کیا ہے تو دوسری جانب انھوں نے شاعر کے لیے بھی چند اہم نکات کی جانب توجہ مبذول کرایا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ شاعر میں بھی ایک طرح کا کمٹ منٹ ہوتا ہے۔شاعر کو شعر و ادب کے تقاضوں سے غفلت نہیں برتنی چاہیے ورنہ شعر کے مقاصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔موضوع زبان و بیان، ردیف و قافیہ، تشبیہ و استعارے اور بحر و وزن کے استعمال میں چابکدستی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔تنویر احمد علوی شاعر کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تنویر احمد علوی ایک ایسے شاعر تھے جن کا شعر و سخن میں کوئی استاد نہ تھا۔وہ اپنے کلام میں کسی سے اصلاح نہ لیتے تھے بلکہ خود ھی تنقید کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔وہ اپنے کلام کو بار بار پڑھتے اور ان کی اصلاح خود ھی کرتے۔ ان کی ھمیشہ سے یہ کوشش رھتی تھی کہ وہ اپنے اشعار کو خوب سے خوب تر بنائیں۔

''شعر کہتے وقت شاعر کو محو تماشائے دماغ رہنا ہوتا ہے۔اس لیے کہ جسے شاعری کہتے ہیں وہ ذاتی مشاہدہ کا پرتو، داخلی تجربے کا عکس، تخیل کی رنگ آمیزیوں کا مرقع اور جذبات کی پرکشش لہر غرض سبھی کچھ ہے شعر کا حسن ذہن اور زندگی کے رشتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ تجربے کی زبان بھی ہے اور زبان کا تجربہ بھی، جسے تخلیقی حسیّت کی نمود کہا جاتا ہے۔معلوم کو محسوس اور تصور کو تاثر بنائے بغیر ممکن نہیں۔اس کے بعد ہی تجربے کی صحت اور جذبے کی صداقت شعری سچائی کی شکل اختیار کرتی ہے۔اچھا پیرایہ اظہار کلاسکیت میں بھی موجود ہے، ترقی پسندی میں بھی اور جدیدیت میں بھی، لفظ و معنی کی مضمر قوت کی بازیافت اور احساس و ادراک کی شدّت کے بغیر اچھی شاعری نہیں کی جا سکتی۔'' (لمحوں کی خوشبو ص 17)

درج بالا اقتباس میں علوی صاحب نے جن نکات کی طرف نشاندہی کی ہے وہ ان تمام لوازمات کو اپنی شعری تخلیقات میں بروئے کار لاتے تھے۔وہ اپنی کاوشوں کو ہمیشہ نقاد کی نگاہ سے دیکھتے اور حتی الامکان اسے درست کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔وہ جب شعری تخلیق کے قلم کو زور دیتے تو ابتدا سے انتہا تک پہنچنے میں نہ جانے کتنے فاصلوں کو طے کرتے ہوئے اختتام پر پہنچتے تھے۔وہ ایک ایک مصرعے کا سنگ تراش کی مانند مشاہدہ کرتے تھے۔تنویر احمد علوی اپنی تحقیق، تنقید، تاریخ و تصوف اور دوسرے علوم میں اپنی عبقریت کے لیے معروف ہیں لیکن بنیادی طور پر سب سے پہلے ایک شاعر ہیں۔اس بات کی تصدیق ان کی شعری تخلیق کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ان کی شعری تخلیقات یقیناً قابل تحسین ہیں مگر ان کی شاعرانہ عظمت ادب میں دب کر رہ گئی ہے۔

■

Dr. Imran Ahmad
Lecturer, District Institute of Education and Training (DIET)
Ikuna, Shrawasti District, Shrawasti-271845 (UP)
Mob: 9652559916

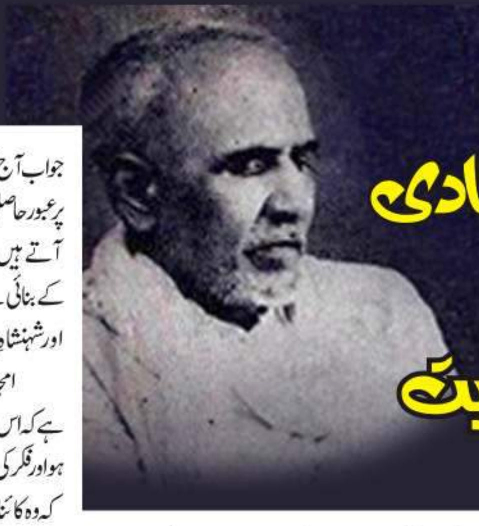

امجد حیدر آبادی کی شعری انفرادیت

حارث حمزہ لون

حیدرآباد دکن کی سرزمین نے اُردو زبان کے جو نامور شعرا پیدا کیے ان میں حکیم الشعرا حضرت امجد حیدر آبادی کو ملک گیر شہرت ملی۔ امجد اُردو زبان کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بقول پروفیسر سید مناظر احسن گیلانی ''حضرت امجد ہندوستان کے ان شعرا میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے۔'' اُردو شاعری کی تاریخ میں حضرت امجد کا وہی مقام ہے جو فارسی شاعری کی تاریخ میں ابوسعید ابوالخیر اور سرمد کا ہے۔

امجد حیدر آبادی کا اصل نام سید احمد حسین اور تخلّص امجد حیدر آبادی تھا۔ 1886 کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ جب چالیس دن کے تھے ان کے والد مولوی سید رحیم علی کا انتقال ہوگیا۔ والدہ محترمہ صوفیہ کے زیر سایہ زیور علم سے آراستہ ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مشہور درسگاہ دارالعلوم مدرسہ نظامیہ حیدر آباد میں ہوئی۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی، منشی عالم اور منشی فاضل میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ امجد کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ میراں صاحب کی دختر محبوب النساء سے انجام پائی جن کے بطن سے ایک بیٹی اعظم النساء پیدا ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی ایام میں بنگلور سٹی ہائی اسکول میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آخر دفتر صدر محاسبی (اے۔جی۔آفس) میں منظمی کی خدمت حاصل کی۔ 1908 کی آفات سماوی یعنی موسیٰ ندی میں آئی طغیانی نے امجد کو تنہا کر دیا۔ اس طغیانی کے قہر نے ان کو اپنے مکان اور اہل وعیال سے محروم کر دیا۔ یہ ان کی زندگی کا عظیم و دردناک سانحہ تھا جس نے حیدر آباد میں سخت ترین ظلم ڈھائے۔ کئی زندگیاں اور مال وزر بہاؤ کی نذر ہوگئے۔ اس طغیانی نے انسانوں کو ایسے درد وغم سے دوچار کیا کہ جب بھی اس کی یاد تازہ ہوتی تو آنکھوں سے اشک رواں ہوجاتے ہیں۔ اس المناک واقعے پر حضرت امجد نے تڑپتی ہوئی نظم 'قیامت صغریٰ' لکھی ہے جس کو پڑھ کر حضرت امجد پر گزرے آلام و مصائب کی تصویر نظروں میں آجاتی ہے۔ یہ غم کا طوفان جس میں انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایسا دردناک منظر بھی دیکھا جہاں ان کی ماں، بیوی، بیٹی اور سارا خاندان سیلاب میں بہہ گئے۔ انھیں ایک درخت نے سہارا دیا اور اس سے لپٹ کر اُن کی آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ اس طغیانی میں حضرت امجد کے گھر کا جو بھی اثاثہ تھا بہہ گیا، اس بندۂ خدا کی باقی تمام زندگی درد وغم اور محرومی میں گذرتی رہی مگر ہمیشہ توکل وصبر سے کام لیتے رہے۔ لب پر کبھی شکوۂ خداوندی نہیں تھا، البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنے آلام ومصائب کو بڑے دردمندانہ انداز میں اشعار میں پیش کیا۔ وہ ایک عظیم المرتبت شاعر تھے اور درد وغم جیسے ان کا مقدر بن چکا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں بڑی شائستگی ہے۔ انھیں ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر 'سرور ثانی' اور 'شہنشاہ رباعیات' کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ 1915 میں حضرت امجد کی دوسری شادی فلسفہ کے مشہور زمانہ استاد علامہ سیدنا درالدین کی صاحبزادی جمال سلمٰی سے ہوئی جس کی وجہ سے امجد کی کایا پلٹ گئی۔ لیکن بے رحم موت نے فرصت نہ دی اور انھوں نے 29 مارچ 1961 کو اس دنیا سے کوچ کیا اور اپنے سینے میں درد وغم کا ایک پہاڑ لیے چل بسے۔ امجد نے ساری زندگی صبر اور توکل کے ساتھ گذار کر یہ ثابت کر دیا کہ ایک بندۂ مومن کے لیے صبر وتوکل ہی سب کچھ ہے اور اس میں اللہ کی رضا وخوشنودی رسولؐ حاصل ہوتی ہے۔

تقدیر سے کیا گلہ خدا کی مرضی
جو کچھ بھی ہوا، ہوا خدا کی مرضی
امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

امجد حیدر آبادی نے پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی۔ خود اُن کا بیان ہے کہ شیخ ناسخ کے دیوان کے مطالعے سے انھیں اُردو شاعری کا شوق پیدا ہوا اور وہ شعر کہنے لگے۔ حضرت امجد نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن نظموں، غزلوں اور رباعیوں سے انھیں بے حد دلچسپی تھی خصوصاً صنف رباعی میں انھوں نے اپنی نازک خیالی، بلند پروازی اور فکر کی رسائی کے جو کمالات دکھائے ہیں اس کا جواب آج تک پیدا نہ ہوسکا۔ امجد کو اُردو، فارسی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا جس کے اثرات ان کی شاعری میں جابہ جا نظر آتے ہیں۔ امجد نے اپنی پہچان اُردو دنیا میں بحیثیت رباعی گو کے بنائی ہے۔ اپنے کلام کی انفرادیت کی بنا پر امجد کو سرمد ثانی اور شہنشاہِ رباعیات کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

امجد حیدر آبادی کے نزدیک شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں الفاظ کی پرکھ ہو۔ غور وفکر کی خوب خوب عادت ہو اور فکر کی پرواز بلند ہو۔ اور شاعر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کائنات کے ذرّے ذرّے سے واقفیت رکھے، آسمان کی بلندی اور اس کے بدلتے رنگ، زمین کی پستی اس میں موجود خزانے، سمندر کی گہرائی اور اس کی وسعت، پہاڑوں کی اونچائی اور اس کی استقامت وغیرہ وغیرہ سے اچھی واقفیت ہو۔ اس مفہوم کو امجد نے رباعی میں یوں کہا ہے کہ؎

ہم توڑ کے تارے آسمان سے لائے
مضمون بلند لا مکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبار فن خوب کہا
لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

امجد نیک سیرت انسان تھے۔ ان کی تربیت میں صوفیائے کرام کے اخلاق حسنہ کا بہت بڑا اثر رہا ہے۔ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے رہا جس میں اخلاقیات، تصوف، شریعت اور معرفت کے چراغ ابتدائی زمانے سے روشن رہے ہیں۔ انھوں نے ایک رباعی میں اپنا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا ہے؎

سید احمد حسین امجد ہوں میں
امجد ہوں میں جواب سرمد ہوں میں
گوندھی ہوئی ہے نور سے مٹی میری
خاکِ قدمِ پاکِ محمدؐ ہوں میں

امجد حیدر آبادی ایک فطری قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا کلام جہاں سوز وگداز، درد والم سے بھرا ہوا ہے وہیں اخلاق، فلسفہ، حکمت اور تصوف کے بیش بہا نگینوں سے جڑا ہوا ہے۔ وہ جس کسی چیز سے متاثر ہوتے فوراً ان کے خیالات 'رباعی' کی شکل میں ڈھل جاتے۔ امجد کے کلام کے مطالعے سے اسلامی فکر کو جلا ملتی ہے۔ قرآن مجید کا مطالعہ ان پر ایک کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ اس تاثر کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے رباعیوں میں ڈھال دیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی مشہور آیت ہے کہ لا تقنطو من رحمۃ اللہ 'اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو'۔ امجد نے اس آیت سے متاثر ہوکر لکھا کہ؎

بے کس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یارب! تیری رحمت کے بھروسے امجد
بند آنکھ کیے یوں ہی چلا آیا ہے

سورہ انفال کی آیت 'خدا ہی تو تمہارا حمایتی ہے' کو امجد نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ہر چیز مسببِ سبب سے مانگو
منت سے، خوشامد سے، ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

ایک اور آیت کا ترجمہ 'ہماری دی ہوئی پاک چیزیں کھاؤ' کو امجد نے اس طرح بیان کیا ہے۔

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثر دُعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز، دوا کھاتے ہیں

امجد حیدرآبادی کی شاعری خصوصاً رباعی میں ان کا سوز و گداز، خلوص، نیک نیتی اور قوم و انسانیت سے دردمندی کے احساسات کی بڑی اہمیت ہے۔ ممتاز دانشور فرمان فتحپوری کے بموجب امجد صوفی منش، قانع، متوکل اور خدا ترس آدمی ہیں۔ ان کی شاعری کے اکثر موضوعات میں توحید، ایمان، توکل، عشقِ حقیقی اور عرفان سرور شامل ہیں۔ ان مضامین میں ایسی رندانہ سرمستی اور عارفانہ سرخوشی رچی بسی ہوتی ہے کہ معمولی سی معمولی بات میں بھی غزل کا سا کیف نکھر آتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے ''زبان و بیان پر قدرت اور پاکیزگی خیال نے ان کی رباعیات میں کلاسیکی عظمت پیدا کی ہے''۔ حضرت امجد کی رباعیات زندگی کے اعلیٰ ترین رُخ کو پیش کرتی ہیں اور شعری آرٹ کا نہایت حسین نمونہ ہیں۔ انھوں نے عرفان نفس اور کائنات کے روحانی پہلوؤں کو جس خوبی کے ساتھ لباس شعر میں جلوہ گر کیا ہے اس کی دوسری مثال عصر حاضر میں نہیں ملتی۔ ایک رباعی میں انھوں نے عقل وفہم کی گُتھیاں سلجھائی ہیں۔

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لا حول ولا قوۃ الا باللہ
شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

حضرت امجد حیدرآبادی نے مناجات میں اللہ رب العزت کی صفات اور اس کی فیاضی کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے دیکھیں۔

او میرے مالک! او عرش والے
جلوے ہیں تیرے، سب سے نرالے
ہم غم زدوں کا، غموار ہے تو ستا رہے تو، غفار ہے تو
تعریف تیری میری زباں پر اللہ اکبر، اللہ اکبر

حضرت امجد کا ابتدائی کلام طغیانی رودِ موسیٰ کے دو سال پہلے 1906 میں شمسی پریس آگرہ سے شائع ہوا تھا اس میں سو رباعیات تھیں یہ مجموعہ طغیانی کی نذر ہوگیا۔ اس کے بعد کا اُردو کلام 'رباعیات امجد' کی تین جلدوں اور 'ریاض امجد' دو حصوں یعنی 'خرقہ امجد' اور 'نذر امجد' پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ایک مختصر رباعیات کا مجموعہ 'حسن بلال' کے عنوان سے شامل ہیں۔ 'رباعیات امجد' میں حقائق و معارف، عبادت الٰہی کی ترغیب، اخلاق و فلسفہ اور تصوف سب کچھ شامل ہے، ان ہی رباعیات کی بدولت امجد اقلیم رباعی کے بادشاہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ 'خرقہ امجد' حضرت امجد کا ایک اہم شعری کارنامہ ہے۔ 'نذر امجد' میں ہجرت نبویؐ کے حالات کا دلکش و روح پرور تذکرہ ہے۔

'ریاض امجد' کی نظموں میں ان کے اضطراب، سوز و گداز اور انسانی دردمندی کے جذبات و احساسات کا ایک وسیع کینوس دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان نظموں میں انھوں نے جہاں آپ بیتی بیان کی ہے وہیں جگ بیتی اور عوام کے آلام و مصائب کی عکاسی بھی کی ہے۔ 'ریاض امجد' حمد، نعت، مناجات، ہندی دوہوں کے علاوہ غزلوں اور بلند پایہ اخلاقی نظموں پر مشتمل ہے۔ اخلاقی نظم نگاری ان کا خاص موضوع تھا۔ انھیں واقعہ نگاری اور وصف نگاری میں کمال حاصل تھا۔ 'ریاض امجد' میں تضمینیں بھی بکثرت ہیں۔ انھوں نے عربی فارسی اور اُردو شعرا کے کلام پر مصرعے لگائے ہیں۔

امجد حیدرآبادی نے جہاں شاعری کے میدان میں کمال درجے کی مہارت کے ساتھ اپنا مقام بنایا ہے وہیں انھوں نے اچھی نثر لکھ کر بھی اُردو ادب کے سرمایے کو مالا مال کیا ہے۔ ان کے نثری سرمائے میں 'جمال امجد' کے نام سے خودنوشت سوانح عمری قابل توجہ ہے، جس کا مطالعہ دلوں کو مغموم بنا دیتا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے حالاتِ زندگی کا بڑے کرب سے اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں 'گلستان امجد'، 'حکایات امجد'، 'حج امجد' اور 'پیام امجد' شامل ہیں جن میں بہت اہم امور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

امجد صاحب کی شاعری کو بلندی اور ارتقا تک پہنچانے میں ان کے خالص روحانی جذبات، پر خلوص صداقت، باطنی اسرار و رموز اور انسانی دردمندی کا بڑا رول رہا۔ انھوں نے پند و نصائح کے وسیلے سے اسلامی فکر اور اسلامی تعلیمات کے اہم عناصر کو بھی اپنے اظہار میں سمویا۔ امجد کے کلام میں سارے عالم کا درد اور انسانی مصائب و آرام پر تشویش و اضطراب کے احساسات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

امجد نے رب کائنات سے اپنی محبتوں میں کمی نہ ہونے دی بلکہ ان کے یہاں بار بار باری تعالیٰ کے اوصاف اور ان کی رحمتوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ آدمی کو اپنی ہر طلب کے لیے اسی سے رجوع ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ خدا کو حاکم کُل، مالک و مختار قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

یہ خورشید و قمر کیا دیکھتے ہو
فضائے بحر و بر کیا دیکھتے ہو
کسی کے حکم سے بس ہو رہا ہے
اِدھر اُدھر کیا دیکھتے ہو

امجد حیدرآبادی کو حضورؐ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ سرکار دو عالمؐ کی مدح سرائی کو محیط ہے۔ 'نذر امجد' میں رسولؐ کی ولادت سے لے کر ہجرت کے حالات کو منظوم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

قیامت تک اب ایسی صورت نہ ہوگی
یہ صورت نہ ہوگی یہ سیرت نہ ہوگی
اب آگے نبوت میں شرکت نہ ہوگی
ہمیں اب کسی کی ضرورت نہ ہوگی

امجد حیدرآبادی نے اخلاقی تعلیمات، فلسفیانہ تصورات اور حکمت کے وسیلے سے عام آدمی کے ذہن کو صیقل کیا اور پند و نصائح سے علم و عمل اور بلند کردار کی تلقین کی۔ انھوں نے اپنے مخصوص و منفرد اسلوب و آہنگ میں عوام الناس کے دلوں میں اللہ کی عظمتوں، رفعتوں اور رحمتوں کے تصور اور برکتوں کو شعری پیکر بنایا اور رسول اکرمؐ کی عظیم ترین شخصیت کے علم و عمل پر چلنے کی تلقین کی۔

امجد حیدرآبادی کے کلام میں صوفیانہ انداز بھی ہے، حقیقت بیانی بھی ہے اور انسانیت کی فکر بھی نظر آتی ہے۔ امجد نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت کی اصلاح کا خوب کام انجام دیا ہے۔ وہ شاعری میں ایک ناصح کی حیثیت سے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ امجد کی شاعری مقصدیت پر مبنی شاعری ہے۔

الغرض امجد حیدرآبادی کی شاعری کے بالاستیعاب مطالعے سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کے حادثات، سانحات، واقعات، انقلابات زمانہ اور نشیب و فراز کا آئینہ خانہ ہے۔ انھوں نے بے پناہ آلام و مصائب کا سامنا کیا جس نے انھیں روحانیت اور تصوف کی راہ پر گامزن کیا۔ تصوف کے بنیادی وصف تزکیہ نفس کو اختیار کر کے انھوں نے اپنی شاعری سے اصلاحِ معاشرہ اور قوم و ملت کی بہبودی کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اور اس کے لیے رباعی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ امجد ایسے منفرد شاعر ہیں، جنھوں نے شہر حیدرآباد کی عزت و آبرو کو پوری اُردو دنیا میں وقار بخشا اور برصغیر میں دکن دیس کا نام روشن کیا۔

■

Haris Hamzah Lone
Kashmir R/O : Rehmatabad Rafiabad
Baramulla 193303
Post Office : watergam
Contact: 7889382310

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے۔جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

خلجی خاندان

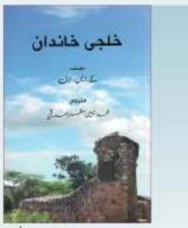

مصنف: کے ایس لال، مترجم: محمد یسین مظہر صدیقی

صفحات: 481، قیمت: 220، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: نایاب حسن، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

کے ایس لال (کشوری سرن لال، 2002-1920) ممتاز مؤرخ اور عہدِ وسطی کے ہندوستان کے نمایاں ترین محققین میں سے ایک ہیں۔انھیں انگریزی، ہندی و سنسکرت کے علاوہ اردو اور جدید وقدیم فارسی زبانوں میں بھی یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی تاریخ خصوصاً ہندوستان کے مسلم عہد پر ان کا تحقیقی و تصنیفی کام غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، ابتدائی مسلم آبادی، مغل حکومت اور اس کے متعلقات اور عہدِ سلطنت کے اطراف و جوانب پر ان کی تقریباً ایک درجن کتابیں ہیں، جن میں سے ایک اہم کتاب خلجی سلطنت کے قیام، اس کے پس منظر، اس کے کارناموں، اس کی خصوصیات، اس کے تہذیبی، ثقافتی، سماجی وسیاسی اثرات اور اس کے زوال کے محققانہ تجزیوں پر مبنی ہے، جو انگریزی میں History of the Khaljis کے نام سے پہلی بار 1950 میں شائع ہوئی تھی۔ یہ دراصل مصنف کا تحقیقی مقالہ تھا، جس پر انھیں 1945 میں الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی فل کی ڈگری ملی تھی، اسی کو انھوں نے مزید حذف و اضافہ اور ترمیم وتہذیب کے بعد کتابی شکل میں شائع کروایا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ممتاز عالم و محقق ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی نے 'خلجی خاندان' کے نام سے کیا ہے، جس کی پہلی اشاعت ترقی اردو بیورو کے زیر اہتمام 1980 میں ہوئی اور اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام اس کی تیسری طباعت منظر عام پر آئی ہے۔

خلجی خاندان دہلی کی مسلم سلطنت کا دوسرا حکمراں خاندان تھا۔ یہ خاندان سابقہ غلام خاندان کی طرح ترک نژاد تھا، حالانکہ خلجی قبیلہ طویل عرصے سے افغانستان میں آباد تھا، مگر اس کی اصل ترکی تھی۔ پہلا خلجی سلطان جلال الدین فیروز خلجی تھا، جسے ایک بااثر گروپ نے آخری کمزور غلام بادشاہ کیقباد کے خاتمے کے بعد کھڑا کیا تھا مگر جلال الدین فیروز خلجی کا چھ سالہ دورِ اقتدار نااہلی و بزدلی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ پھر قدرت کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جلال الدین جیسے پرامن شخص کو بھی اس کے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی نے 1296 میں قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا، یہاں سے اصل خلجی دور کا آغاز ہوا۔

علاء الدین نے گجرات کے خلاف مہم کے ساتھ اپنی فتوحات کا آغاز کیا۔ گجرات کے دہلی سے الحاق کے بعد اس نے اپنی عنانِ توجہ راجستھان کی طرف موڑ دی، رنتھمبور پہلا ہدف تھا، رنتھمبور کو راجستھان کا سب سے مضبوط قلعہ کہا جاتا تھا اور اس سے قبل اس نے جلال الدین خلجی کو پسپا کر دیا تھا۔ راجپوتوں کی طاقت اور حوصلے کو توڑنے کے لیے رنتھمبور پر قبضہ ضروری تھا۔ حملے کی فوری وجہ یہ تھی کہ رنتھمبور کے حکمران ہمیر دیو نے دو باغی منگول فوجیوں کو پناہ دی اور انھیں خلجی حکمران کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا؛ اس لیے رنتھمبور کے خلاف کارروائی شروع کی گئی۔ ابتدا میں خلجی افواج کو نقصان اٹھانا پڑا، یہاں تک کہ علاء الدین کو خود میدان جنگ میں آنا پڑا اور آخر کار 1301 میں قلعہ علاء الدین کے قبضے میں چلا گیا۔ 1303 میں علاء الدین نے راجپوتانہ کی ایک اور طاقتور ریاست چتوڑ کا محاصرہ کیا۔ کچھ مؤرخین کے مطابق علاء الدین نے چتوڑ پر اس لیے حملہ کیا کہ وہ راجہ رتن سنگھ کی خوبصورت ملکہ پدمنی پر فدا ہو گیا تھا۔ تاہم بہت سے مؤرخین اس افسانے سے متفق نہیں ہیں، کیونکہ اس کا ذکر ملک محمد جائسی نے اپنی پدماوت میں دو سو سال بعد کیا ہے۔ چند سالوں کے دوران ہی اس نے شمال کی اہم ریاستوں پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد جنوبی ہند کے تلنگانہ، تمل ناڈو اور کرناٹک کے علاقوں پر فوج کشی کی اور کامیاب ہو کر لوٹا۔

علاء الدین خلجی کے دور میں منگولوں کا حملہ قرون وسطی کے ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ منگولوں کے کئی حملے ہوئے لیکن سلطان ان سب کو دبانے میں کامیاب رہا۔ علاء الدین خلجی کے پورے دور حکومت میں منگول شمال مغرب کی طرف سے ہندوستان کی سلامتی کے لیے خطرہ بنے رہے۔ اپنے عظیم رہنما چنگیز خان کی موت کے بعد منگول منقسم ہو گئے اور اس طرح وہ کمزور پڑ گئے، مگر وہ اس وقت بھی ایشیا کی ایک بڑی طاقت تھے۔ 98-1297 سے لے کر 08-1307 کے عرصے میں منگولوں نے دہلی پر یکے بعد دیگرے سات آٹھ حملے کیے، مگر علاء الدین اپنی غیر معمولی بہادری، سپہ سالارانہ دانش مندی اور بے مثال فوجی قوت کی بہ دولت ان کے ہر حملے کو ناکام بنانے میں کامیاب رہا۔

اس کے دور میں زرعی واقتصادی اصلاحات پر خاص توجہ دی گئی۔ ٹیکس کے نظام کی تجدید کی گئی اور نئے نظام کو نافذ کرنے کے لیے ایک مضبوط اور مؤثر ریونیو ایڈمنسٹریشن سسٹم قائم کیا گیا۔ اکاؤنٹنٹ، کلکٹر اور ایجنٹوں کی ایک بڑی تعداد کو نظام چلانے کے لیے رکھا گیا۔ ان اہلکاروں کو اچھی تنخواہیں ملتی تھیں اور رشوت لیتے ہوئے پائے جانے پر انھیں سخت سزا دی جاتی تھی۔ بازار میں بکنے والی اشیا کی قیمتیں متعین کی گئیں، جن میں سامانِ خورد و نوش اور دیگر ضروریاتِ زندگی ترجیحی طور پر شامل تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان نے اس بات کا

خیال رکھا کہ بازار میں کبھی بھی اشیاے ضروریہ کی رسد میں کمی نہ ہو، قلت کے ادوار میں راشننگ کا نظام نافذ کیا گیا۔ ان وسائل کے ذریعے قحط کے حالات میں بھی قیمتیں مقررہ شرح پر برقرار رکھی گئیں۔ علاء الدین بعض چونکا دینے والی معاشی اصلاحات نافذ کرنے میں بھی کامیاب رہا، حالانکہ ان کے اثرات شاید دہلی اور اس کے ارد گرد 100 میل کے دائرے تک ہی محدود تھے۔ اس کے باوجود یہ واقعی قابل تحسین تھا کہ اس نے ان اصلاحات کے ذریعے وہ کچھ حاصل کیا، جو ہندوستان کی جدید حکومتوں نے بھی مکمل طور پر حاصل نہیں کیا۔

مگر ساتھ ہی علاء الدین نے اپنے دور حکومت میں کچھ خطرناک غلطیاں بھی کیں، جو خلجی خاندان کے زوال کا باعث بنیں۔ گو کہ وہ سلطنت چلانے میں کامیاب رہا، مگر یہ بنیادی طور پر اب بھی ایک فوجی بادشاہت تھی، اس کی بقا کا انحصار بادشاہ کی طاقت پر تھا، چنانچہ جوں ہی علاء الدین جسمانی طور پر کمزور ہوا اور اس کی پکڑ امورِ سلطنت پر ڈھیلی پڑنے لگی، تو سلطنت میں انتشار کی علامتیں بھی واضح ہونے لگیں، 1316 میں اس کے انتقال کے بعد یہ سلطنت کلیتاً بکھر گئی اور صرف چار سال کے عرصے میں خلجی خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور اقتدار تغلقوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

زیرِ نظر کتاب کل 19 ابواب، تین ضمیموں اور 481 صفحات پر مشتمل ہے، جن میں یہ تمام حالات بیان کیے گئے اور علاء الدین خلجی کے بیس سالہ دور حکومت کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ کتاب اہم تاریخی معلومات وحقائق سے پر ہے اور مصنف نے انھیں مستند حوالوں کی مدد سے پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کتاب دلچسپ ہے، پڑھتے ہوئے کہیں کسی قسم کی لسانی، اسلوبی یا اندازِ بیان کے الجھاؤ اور پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا۔ مترجم نے ترجمہ نگاری میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیا ہے اور مصنف کی مراد و مقصود کو بہت خوب صورتی سے اردو کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف علاء الدین خلجی کی حکومت کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل ہوتی ہیں؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے دوسرے سماجی، ثقافتی و سیاسی احوال سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ علاء الدین خلجی کی شخصیت اور اس کے اوصاف و کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے سنی سنائی باتوں پر انحصار کرنے کی بجائے مصنف نے نہایت مستند مصادر اور اس دور کی تاریخی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ تاریخِ ہند، خصوصاً عہدِ سلطنت اور علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے۔

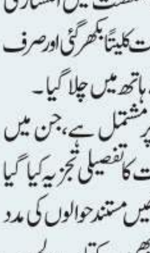

پھول بن

شاعر: ابن نشاطی

صفحات: 190، قیمت: 115، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: عبدالرشید، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

'پھول بن' ایسی تصنیف یا تخلیق ہے جو اپنے خالق سے زیادہ مشہور ومعروف ہے۔ زمانی اعتبار سے مثنوی 'پھول بن' وجہی، نصرتی اور غواصی کے بعد کی ہے۔ اس لیے مذکورہ شعرا کی تخلیقات کی بہ نسبت 'پھول بن' کی زبان زیادہ صاف وشستہ ہے۔ ابن نشاطی تک پہنچتے پہنچتے اردو زبان کافی ترقی کر چکی تھی۔ اس لیے مثنوی پھول بن کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ حالانکہ پھول بن دیگر مثنویوں کے مقابلے کم طویل ہے، تاہم قصوں میں صراحت ہے۔

مثنوی 'پھول بن' جو کتابی صورت میں قارئین کے سامنے ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین اور تحقیق میں کافی عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ مثنوی کے اصل متن کے ساتھ ساتھ ابتدا میں 67 صفحات پر مشتمل ابن نشاطی اور ان کے نام ومقام اور مرتبے کی وضاحت درج ہے۔ علمی حلقوں میں پھول بن کی شہرت کے آگے اس کے تخلیق کار کا نام دب سا گیا ہے۔ تحقیق کے بعد ابن نشاطی کا نام شیخ چاند صاحب کو ایک نسخے کی مدد سے دریافت ہوا جب کہ وہ نسخہ ناقص تھا، اس پر یہ عبارت درج تھی ''ایں قصہ پھول بن از گفتار شیخ المشائخ محمد مظہر ابن شیخ فخر الدین''

اس عبارت سے علم ہوتا ہے کہ مثنوی پھول بن کے خالق، ابن نشاطی کا مکمل نام محمد مظہر الدین ابن شیخ فخر الدین تھا جو شیخ مشائخ تھے۔ کتاب میں سید محمد اعظم کا پیش لفظ ہے جو کتاب کے طبع اول سے لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک دیباچہ 'دیباچہ طبع ثانی' کے نام سے آٹھ صفحات کا شامل کتاب ہے جسے محمد اکبر الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ بعد ازاں 'مقدمہ طبع ثانی' کے عنوان سے محض ایک صفحے کا صراحت نامہ درج ہے جسے خواجہ محمد احمد نے تحریر کیا ہے۔ بقول خواجہ محمد احمد ''ابن نشاطی کی پھول بن مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے 1939 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ 1955 میں بابائے اردو کی فرمائش پر شیخ چاند نے بھی اس کا ایک ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے گیارہ سال بعد دیوی سنگھ چوہان صاحب کا ہندی رسم الخط میں مرتب کیا ہوا نسخہ مہاراشٹر بھاشا سبھا کی جانب سے شائع کیا گیا۔ ان تینوں نسخوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔''

اس کتاب کے قارئین کے علم میں یہ بات آنی چاہیے کہ مذکورہ بالا تینوں نسخوں کو سامنے رکھ کر جامعہ عثمانیہ کے سابق پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی دکنی مخطوطات کے ماہر نے، ترتیب و تدوین کے کام کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچایا اور اس وقت کے ترقی اردو بورڈ کے حوالے بغرضِ اشاعت کیا۔

پروفیسر عبدالقادر سروری کا اس کتاب کی اشاعت میں کافی تعاون رہا ہے۔ 'دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا' عنوان سے قریباً آٹھ صفحات کا مضمون بھی شامل ہے جس میں انھوں نے بالاستیعاب دکن میں اردو مثنوی کے ارتقا پر گفتگو کی ہے نیز اردو مثنوی کے ارتقائی سفر کو چند ادوار میں تقسیم کیا ہے اور مثنویات کا شمار کیا ہے مثلاً خوب محمد چشتی کی مثنوی 'خوب ترنگ' ہے۔ سراج اورنگ آبادی کی مثنوی 'بوستانِ خیال'، حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی مثنویاں 'خوش نامہ' اور 'خوش نغز' کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں۔ میراں جی کے فرزند حضرت شاہ برہان جانم کی مثنوی رموز السالکین، نظم قربیہ، محبّ نامہ قابل ذکر ہیں۔ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' اور غواصی کی دو مثنویاں 'سیف الملوک' و 'بدیع الجمال' معروف ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر عبدالقادر سروری نے مثنویوں کا تعارف کرایا ہے جو اس وقت کی معروف مثنویوں میں شامل ہیں۔ مثلاً مقیمی کی مثنوی 'چندر بدن اور مہیار' جو 1048 ہجری سے قبل کی ہے۔ اس کے علاوہ بہرام و حسن بانو، لیلیٰ مجنوں، خاور نامہ، نیہ درپن، گلشن عشق، علی نامہ، بوستان خیال وغیرہ۔

مقدمہ کے بعد اکبر الدین صدیقی نے قریباً چالیس صفحات پر مشتمل 'کارنامہ' کے عنوان سے مقدمے کا تتمہ لکھا ہے۔ یہ طویل بحث مثنوی 'پھول بن' اور دیگر کے درمیان تجزیہ وموازنہ بھی ہے جو اس وقت کی شعری کائنات میں اس کے امتیاز کو ظاہر کرتی ہے۔ اس بحث میں اکبر الدین صدیقی کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی ذوق وشوق سے واقفیت ہوتی ہے۔ نیز مثنوی کے منتخب اشعار سے مثنوی نگار کی فنی خوبیوں سے آگہی ملتی ہے۔

صفحہ 68 سے مثنوی پھول بن کا متن درج ہے جو صفحہ 174 پر مکمل ہوا ہے۔ متن کے شروع سے آخر تک ہر صفحے پر صفحے کے نیچے حاشیہ درج کیا گیا ہے جس میں مثنوی کے ماخذ وغیرہ کی صراحت کی گئی ہے۔ اس طرح 16 صفحات پر مشتمل مثنوی کے تمہیدی موضوعات ہیں جیسے درحمد باری تعالیٰ، مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات، فی النعت سید المرسلین، منقبت حضرت علی، دربیان تصنیف، درصفت پادشاہ، مثنوی کا اصل قصہ صفحہ 83 سے شروع ہوا ہے جس کا عنوان داستان 'پھول بن' ہے۔ پھر قصہ در قصہ، مثنوی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ بعد ازاں 16 صفحات پر مشتمل فرہنگ ہے جس میں ابتدائی اردو کے غیر واضح الفاظ کے معانی بیان کیے گئے ہیں تاکہ تفہیم کلام میں آسانی ہو۔ کتاب کے متن میں املا اور جملہ کی غلطیاں بھی ہیں۔ کہیں کہیں جملے اصولِ قواعد کے برعکس برتے گئے ہیں جو مزاج پر گراں گزرتے ہیں۔ تاہم کتاب کی پانچویں اشاعت اس کی ضرورت واہمیت پر کی عکاسی کرتی ہے۔

نیاز فتح پوری کی تحریریں (ایک مختصر انتخاب)

مرتب: ف س اعجاز

صفحات: 166، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: محمد شاداب شمیم، D-35، ٹاپ فلور، شاہین باغ، اوکھلا، نئی دہلی

نیاز فتح پوری کی تحریریں (ایک مختصر انتخاب) ف س اعجاز کی مرتب کردہ کتاب ہے، اس کتاب میں انھوں نے نیاز فتح پوری کے مضامین، افسانے، مکتوبات اور ان کی شاعری کے انتخاب کو طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے استفادے کے لیے ترتیب دیا ہے، نیاز فتح پوری اردو زبان و ادب کا مشہور و معروف نام ہے، مقدمہ میں مرتب نے نیاز فتح پوری کی مختصر سوانح بیان کی ہے، ان کی پیدائش سے لے کر ان کی ادبی زندگی پر مختصر اور معلوماتی گفتگو کی گئی ہے۔ نیاز فتح پوری نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی اور تقریباً تمام اصناف کے ساتھ انصاف کیا ہے، وہ شاعر، افسانہ نگار، انشا پرداز، محقق، نقاد، مترجم اور صحافی تھے، ان کے افسانوں کے سات مجموعے ہیں، وہ ایک مشہور رسالہ 'نگار' نکالا کرتے تھے، نگار کے متعلق مرتب لکھتے ہیں "38 خاص نمبروں میں سے 11 نمبر خود نیاز صاحب کے لکھے ہوئے ہیں، نیاز اپنی تحریروں سے کامیاب اجتہادی ثابت ہوتے ہیں، ان کی روشن خیالی دوٹوک بولتی ہے، ان کی صحافت کہیں گونگی یا مفلوج نظر نہیں آئے گی، نگار کا ہر شمارہ اہمیت کا حامل ہوا کرتا تھا۔"

اس کتاب کو مصنف نے چار فصلوں میں تقسیم کیا ہے، فصل اول میں نیاز فتح پوری کے چھ مضامین کا انتخاب شامل کیا گیا ہے، پہلا مضمون 'برج بابل' کے عنوان سے ہے، یہ اصل میں ان کے طویل مضمون 'سامی مذاہب کی روایت (علمی و تاریخی نقطۂ نظر سے)' کا ایک ذیلی باب ہے، جس میں انھوں نے زبان کی ایجاد اور لسانی اختلاف پر مفصل گفتگو کی ہے، کوئی بھی زبان اچانک پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس قابل ہوتی ہے کہ اس میں مافی الضمیر کی ادائیگی کی جاسکے بلکہ اس کے لیے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے، برج بابل کو مرکز بنا کر انہوں نے زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما پر بحث کی ہے۔ نیاز فتح پوری نے اس مضمون میں کئی سوالات بھی اٹھائے ہیں، مثلاً یہ کہ آدم و حوا کی زبان کیا تھی؟ اور پھر یہ کہ سانپ ان کی زبان کیسے سمجھ لیتا تھا؟ اسی طرح انھوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ خدا کو برج بابل کی تعمیر پر کیا اعتراض تھا؟ وغیرہ۔ آخر میں انھوں نے مختلف روایات اور بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ برج بابل ایک رصدگاہ تھا، برج کو بنانے والوں نے خدا کی شان میں گستاخی کی تھی اس لیے خدا نے انہیں ہلاک کر دیا اور برج نامکمل رہ گیا۔

دوسرا مضمون فنون ادبیہ اور حقیقت نگاری ہے، یہ مضمون ان کی تنقیدی کتاب 'انتقادیات' سے ماخوذ ہے، اس میں انھوں نے فنون ادبیہ اور حقیقت نگاری پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ پہلے کی کہانیوں میں زیادہ تر مافوق الفطرت عناصر کو شامل کیا جاتا تھا اور ان کی شمولیت سے کہانی کو دلچسپ بنایا جاتا تھا، خدا، بادشاہ، دیوتا، بھوت، جن اور دیو وغیرہ مرکزی کردار ہوا کرتے تھے، لیکن آج کل اس قسم کی چیزوں کو قاری پسند نہیں کرتا، اب قاری پرانے قصوں، کہانیوں، جنگ و خوں کے دل دوز مناظر وغیرہ کو پڑھ کر لطف اندوز نہیں ہوتا بلکہ وہ تو اب ایسے افسانے کو پڑھنا پسند کرتا ہے جس کو وہ کسی حد تک صحیح تصور کر لے، اس لیے کہ اس کے کردار سے ایک طرح کی وابستگی ہو جاتی ہے اور اس کی کامیابی یا ناکامی کا اثر قاری کے دل و دماغ پر دیر تک رہتا ہے۔

اسی طرح دیگر مضامین 'غزنوی حکومت پر ایک تبصرہ اور اس کے اسباب و زوال' ماخوذ از 'محمد بن قاسم سے حملۂ بابر تک'، 'انسانی زندگی کا معیار اور ہمارے علمائے کرام'، 'سید سلیمان ندوی اور میں' ماخوذ از 'من ویزداں' اور 'اخلاق جنسی ماضی، حال، مستقبل' ماخوذ از 'ترغیبات جنسی یا شہوانیات' اہم مضامین ہیں اور اپنے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں، چونکہ یہ سارے مضامین مختصر ہیں اس لیے بآسانی ایک نشست میں پڑھے جاسکتے ہیں، ان تمام مضامین کا اسلوب عام فہم اور سادہ ہے، ہاں کہیں کہیں عربی و فارسی الفاظ کی کثرت کھٹکتی ہے۔ لیکن عمومی طور پر سارے مضامین پڑھنے لائق ہیں۔

فصل دوم افسانے پر مشتمل ہے، اس میں نیاز فتح پوری کے آٹھ مشہور افسانوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے، یہ اردو افسانے کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں، منشی پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ ان کے ہم عصر افسانہ نگار ہیں، ان کے ابتدائی افسانوں پر مغربی اثرات نمایاں ہیں، شہاب کی سرگزشت اور ایک شاعر کا انجام وغیرہ ان کے ابتدائی افسانے ہیں، یہ افسانے کافی مقبول ہوئے تھے، خاص طور پر شہاب کی سرگزشت کو قارئین نے بے حد پسند کیا تھا، نیاز فتح پوری کی مقبولیت میں اس افسانے کا اہم رول ہے، یہ ایک طویل افسانہ ہے بعض لوگوں نے اسے ناول اور ناولٹ بھی کہا ہے، مرتب نے نیاز کے اسلوب اور ان کے انداز بیان کو سمجھانے کے لیے چند ابتدائی اور چند آخری صفحات پیش کیے ہیں، اسی طرح دیگر افسانے مولانا وارث علی اور ان کی بیوی، حسن کی عیاریاں، عورت اور ایک مصور فرشتہ بھی ان کے اہم افسانے ہیں۔

فصل سوم میں نیاز فتح پوری کے مکتوبات کا انتخاب ہے، اس کے تحت 36 مکتوبات پیش کیے گئے ہیں جو انھوں نے مختلف اہل علم و دانش کو تحریر کیے تھے، ان کے خطوط میں طنز و ظرافت نمایاں ہے، یہ خطوط بے تکلف اور برجستہ تحریر کی عمدہ مثال ہیں، نیاز اشعار کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کرتے ہیں، جس سے تحریر کے حسن میں چار چاند لگ جاتا ہے، ان کے خطوط میں کہیں غالب تو کہیں مولانا آزاد کا عکس نظر آتا ہے، پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام ان کے چودہ خطوط کو مرتب نے شامل کتاب کیا ہے، یہ خطوط بے حد دلچسپ ہیں اور نیاز فتح پوری اور نارنگ کے درمیان جس طرح کے تعلقات تھے انھیں بھی سمجھنے میں معاون ہیں، ایک خط کا اقتباس "گرامی عزیز، مقالہ بروقت پہنچ گیا، شکریہ، اس میں شک نہیں کہ آپ نے اس موضوع پر بڑا فاضلانہ مقالہ لکھا ہے اور یہ نگار کی خوش بختی ہے کہ آپ نے یہ مقالہ اسے مرحمت فرمایا" بے تکلفانہ اور برجستہ انداز ان کے خطوط میں جا بجا نظر آتا ہے۔

مرتب نے غزلوں اور نظموں کا انتخاب فصل چہارم میں پیش کیا ہے، نیاز فتح پوری ایک رومانی شاعر تھے، اور اپنے وقت کے اہم شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، آج بھی ان کی شاعری کو بے حد پسند کیا جاتا ہے، ان کی مجموعی خدمات کے لیے 1962 میں حکومت ہند نے پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا اور جب وہ پاکستان منتقل ہو گئے تو وہاں کی حکومت نے انھیں نشان سپاس سے نوازا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا علمی و ادبی قد کس قدر بلند ہے اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی بلکہ ہر صنف کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے، نیاز فتح پوری کی تحریر اور ان کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت اہم ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

مظہر الزماں خاں کا تخلیقی جہان

ڈاکٹر مسرور حیدری

صفحات: 178، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ملنے کا پتہ: کلاسک آرٹ پریس، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی

مبصر: محمد سعید اختر

ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس

جناب مظہر الزماں خاں ایک اہم فکشن نگار ہیں۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف اصحاب قلم نے ان کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'مظہر الزماں خاں کا تخلیقی جہان' مظہر الزماں خاں کے فن اور شخصیت کی تفہیم سے متعلق 11 مضامین پر مشتمل ہے۔ حرف آغاز نوجوان اسکالر ڈاکٹر مسرور حیدری نے لکھا ہے جب کہ ڈاکٹر زاہد الحق صاحب نے اس کتاب پر تعارفی تبصرہ لکھا ہے۔ واضح رہے کہ زیر تبصرہ کتاب کے زیادہ تر مضامین مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ بعد میں انھیں یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون بعنوان 'مظہر الزماں خاں: ایک نظر میں' ہے۔ جو مظہر الزماں خاں صاحب کا سوانحی خاکہ ہے۔ اس میں خاں صاحب کی تصانیف، تنقیدی مضامین اور ان پر شائع ہونے والے گوشوں کے علاوہ انعامات و اعزازات سے متعلق معلومات دی گئی ہیں۔ دوسرے مضمون میں خاں صاحب کی پیدائش، خاندانی پس منظر اور حیات وشخصیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسرا مضمون بعنوان 'مظہر الزماں خاں سے ایک مکالمہ' ہے۔ اس کی حیثیت ادبی انٹرویو کی ہے جو مسرور حیدری نے 2012 میں مظہر الزماں خاں سے لیا تھا۔ یہ انٹرویو عالمی سہارا نئی دہلی میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ یہ انٹرویو اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے مظہر الزماں خاں کی افسانوی تکنیک اور ان کی علامتوں کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ چوتھا مضمون 'مظہر الزماں خاں کی افسانوی کائنات' ہے۔ اس مضمون کے بارے میں مسرور حیدری نے لکھا ہے کہ ''یہ مضمون پروفیسر شیو کے کمار کے قلم کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر کمار یونیورسٹی آف حیدرآباد میں شعبۂ انگریزی کے استاد تھے۔ موصوف انگریزی اور فارسی ادبیات پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کے کلاسیکی شاہکاروں کے شناور تھے۔

کتاب کا پانچواں مضمون 'مظہر الزماں خاں کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ' یہ کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے۔ مسرور حیدری نے ان کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مظہر الزماں کے یہاں پیچیدہ علامتیں اور بیان کی سچائیاں ہیں مگر ان کے موضوعات اطراف و اکناف کی دنیا سے لیے جاتے ہیں۔ وہ انسانی معاشرہ اور سماجی اخلاقیات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے مسرور حیدری کے بقول ''انسانوں کی اخلاقی پستی اور کمزوریوں کو مظہر الزماں خاں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔'' چھٹا مضمون 'خود کے غبار میں: ایک مطالعہ' ہے۔ یہ مضمون بھی مظہر الزماں خاں کے افسانوں سے متعلق ہے۔ اس مطالعہ میں دور حاضر کا انسان کس طرح سے خود کے اندر لپٹا ہوا ہے اور وہ اس غبار سے نکلنا نہیں چاہتا، یہی پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا ساتواں مضمون 'ایک شہر جو کبھی آباد تھا: ایک مطالعہ' ہے۔ اس مضمون میں بھی جواں سال اسکالر نے مظہر الزماں خاں کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ایک شہر جو کبھی آباد تھا' مظہر الزماں کے اسلوب کا ایک منفرد اور شاہکار نمونہ ہے۔

آٹھویں مضمون 'افسانہ 'سوانح حیات' کی تعبیر و تفہیم' میں ڈاکٹر مسرور حیدری نے آثار و علائم کی روشنی میں ان کی اس کہانی کی تعبیر و تفہیم کی کوشش کی ہے۔ نویں مضمون 'افسانہ 'آخری پوسٹ مین' تحلیل و تجزیہ' میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ کہانی مظہر الزماں خاں کی دوسری کہانیوں سے بالکل منفرد اور ابہام اور پیچیدگی سے دور ہے اور قارئین کے ذہن میں باقی رہنے والی ہے۔ دسویں مضمون 'آخری داستان گو' اردو فکشن کی کامیاب تمثیل' میں مظہر الزماں خاں کے ناول پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس ناول میں مختلف کہانیوں کو اس طرح جوڑ دیا ہے کہ وہ ایک زنجیر کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ افسانوں کی طرح اس ناول میں بھی علامتی و استعاراتی اسلوب کو برتا گیا ہے۔ مظہر الزماں خاں نے اس ناول کا دوسرا نام (نئی الف لیلیٰ) بھی رکھا ہے۔ مضمون کے آخر میں مسرور حیدری نے لکھا ہے کہ ''ناول کے مطالعے سے کہیں بھی مظہر الزماں خاں کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن انھوں نے ناول شروع ہونے سے قبل ہی سرنامے پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''ہابیل بھی مظہر الزماں خاں اور قابیل بھی مظہر الزماں خاں ہی ہیں۔ گویا مظہر الزماں خاں آدمی کا استعارہ ہیں۔ جو الگ الگ شکلوں میں ظہور ہو کر مختلف کہانیوں کے کردار بن رہے ہیں۔ گیارہواں مضمون 'مظہر الزماں خاں کے افسانے ذہنی یکسوئی کے متقاضی'' ہے۔ یہ مضمون دراصل پروفیسر شیو کے کمار کے انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ مسرور حیدری نے 2014 میں کیا اور ماہنامہ قومی زبان، حیدرآباد سے شائع کروایا تھا۔ کتاب کے آخر میں مظہر الزماں خاں کے منتخب افسانے شامل ہیں جن میں ''گلدار، پرندوں کے ساتھ ایک دن، ڈارک روم، آخری مقدمہ، سوانح حیات اور آخری پوسٹ'' ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ قارئین تجزیے کے ساتھ ساتھ متن کو بھی سامنے رکھ سکیں۔

امید ہے کہ ڈاکٹر مسرور حیدری کی یہ کتاب مظہر الزماں خاں کی افسانوی کائنات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی اور اس کتاب کو ادبی دنیا میں پذیرائی حاصل ہوگی۔ سرورق دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب کی طباعت بہت عمدہ ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

تنقیدی معروضات

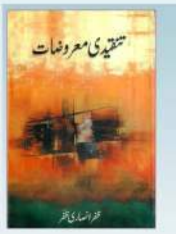

مصنف: ظفر انصاری ظفر

صفحات: 360، قیمت: 350

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: غلام نبی کمار، چرار شریف، بڈگام (جموں و کشمیر)

ظفر انصاری ظفر بنیادی طور پر شاعر ہیں جس کا اندازہ ان کے منظر عام پر آئے ہوئے دس شعری مجموعوں کی تعداد سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ فاضل مصنف تدریسی پیشہ سے منسلک ہیں اس لیے تنقیدی نگاہ بھی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی دو کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ حالانکہ زیر نظر کتاب کے حرفِ آغاز میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''میں نے یہ مضامین کسی منصوبے کے تحت نہیں لکھے، بلکہ دوران مطالعہ کسی متن یا موضوع کے تعلق سے جو نکات ذہن میں آئے، ان ہی کو تحریری رنگ دے دیا، اس لیے ان مضامین میں خیالات و افکار کی بوقلمونی کا پایا جانا ایک فطری بات ہے۔'' چونکہ ظفر انصاری شاعر بھی ہیں اس لیے شعر گوئی کی اچھی پرکھ کے ساتھ ساتھ اس کی تفہیم و تعبیر سے بھی خاصی آگہی رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے محقق اور نقاد ہونے کا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہیں کیا ہے۔

'تنقیدی معروضات' پینتیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں تیس مضامین شاعری کے حوالے سے شامل کیے گئے ہیں۔ اٹھارہ مضامین میں غزل گو شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے

جب کہ ایک اردو نظم، ایک مثنوی، ایک یک موضوعی اور دو میں متصوفانہ شاعری کا ذکر ہوا ہے۔ دیگر مضامین افسانہ نگاری، ناول، تنقید، صحافت اور سوانح وغیرہ سے متعلق ہیں۔ کچھ مضامین طویل ہیں اور بعض مختصر۔ غزل کے تعلق سے قلم بند کیے گئے مضامین میں کلاسیکی شعرا میر تقی میر، مومن خان مومن، حالی، اکبر، عطا کاکوروی وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جب کہ جدید شعرا میں خمار بارہ بنکوی، قیصر صدیقی، صبا نقوی، فضا ابن فیضی، ناز قادری، منظر اعجاز، سردار شفیق اور بدر محمدی کی غزل گوئی کا جائزہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ آسی غازی پوری اور حضرت عزیز صفی پوری پر لکھے گئے مضامین میں تصوف سے متعلق اشعار کا تجزیہ اور کچھ معروضات پیش کیے گئے ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید نے زیر تبصرہ کتاب میں شامل مضامین کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ظفر انصاری ظفر اردو ادب کو اس کے کُل (Totality) میں پرکھنے کے عادی ہیں۔ تنقیدی معروضات میں جو مضامین شامل ہیں وہ سبھی نمائندہ شعری ونثری اصناف کا احاطہ کرتے ہیں۔''

اس کتاب میں میر اور ان کی شاعری کے تعلق سے تین مضامین شامل ہیں۔ میر پر خواجہ احمد فاروقی اور نثار احمد فاروقی نے معیاری تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ اگر چہ یہ مضامین بھی منفرد پہلو اور موضوع کو مد نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں تاہم ان میں فاضل مصنف نے موضوع کو جلدی سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ 'پیروی میر اور نئی غزل' مزید گفتگو چاہتا ہے۔ 'نغمات الاسرار فی مقامات الابرار: ایک مطالعہ' تبصرے کی غرض سے تحریر کیا گیا ایک عمدہ تجزیاتی مضمون ہے جس میں مذکورہ کتاب کے تمام محاسن کا فنی وفکری اور موضوعی طور پر احاطہ ہوا ہے۔ ظفر انصاری ظفر نے حرفِ آغاز ہی میں واضح کر دیا ہے کہ انھوں نے یہ مضامین ادبی نشستوں اور سمیناروں میں پڑھنے کی غرض سے لکھے ہیں۔ راقم کو بھی محسوس ہوا کہ اس میں بعض مضامین تبصرے اور بعض سمیناروں میں پیش کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے سمیناروں میں مقالہ پڑھنے کے لیے عموماً دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں دیا جاتا، اس وجہ سے یہ مضامین بھی مزید طلب وجستجو سے یکسر خالی رہے۔ اس کے باوجود اس کتاب میں قارئین کے لیے دلچسپی کے محرکات موجود ہیں۔

تاریخ

گم نام مجاهد آزادی شیر علی خان آفریدی

مصنف: ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ)

صفحات: 128، قیمت: 150 ، سنہ اشاعت: 2021

مطبع: کہکشاں گرافکس، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر خالد ظہیر

1172، وارڈ نمبر 4، شیام پور روڈ کٹھور، میرٹھ۔ 250104 (یوپی)

ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی منجھے ہوئے تاریخ داں ہیں۔ تاریخ ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اب تک ان کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں جنگ آزادی کے سرخیل، غداروں کی کارستانیاں (1757 تا 1857 کے تناظر میں) وغیرہ جو عوام وخواص میں سند قبولیت پا چکی ہیں۔ جہد وجستجو، واقعات کی تہہ تک پہنچنا، مدلل شواہد، تحقیق کی چھان پھٹک اور ترتیب وار واقعات کو پیش کرنے میں شاہد صدیقی مہارت رکھتے ہیں۔ تاریخ جیسے خشک موضوع کو بھی خوشنما پیرائے میں لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور شاہد صدیقی کی یہ اہم خوبی ہے۔ ایسے گم نام مجاہدین وطن اور سرفروشان ملک جن کو بھلا دیا گیا ہے۔ شاہد صدیقی تلاش بسیار، تحقیق وجستجو کے ساتھ بڑی ایمانداری، محنت وجاں فشانی سے ان مجاہدین اور شہیدان وطن کی قربانیوں کو اجاگر کر کے قلم بند کر رہے ہیں۔ ان کی تازہ ترین پیش کش 'گم نام مجاہد آزادی شیر علی خاں آفریدی' ہے۔ جس میں انھوں نے ایک ایسے مجاہد آزادی وطن کو روشناس کرانے کی مساعی جمیلہ کی ہے کہ جس کو نہ صرف انگریز تاریخ دانوں نے اپنی ناموس اور حکومت پر بدنما داغ لگنے کے ڈر سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے انھوں نے شیر علی خاں آفریدی کا کہیں ذکر تک کرنا گوارہ نہ کیا بلکہ ہندوستانی تاریخ دانوں نے بھی انھیں اکثر فراموش کیا ہے۔

اس کتاب میں نو عناوین ہیں جس میں پہلے نمبر پر انڈمان ونکوبار کا جغرافیہ اور دوسرے نمبر پر انڈمان ونکوبار کی مختصر تاریخ ہے۔ فاضل مصنف نے انڈمان ونکوبار کا جغرافیہ میں تحریر کیا ہے کہ انڈمان ونکوبار 572 جزیروں پر مشتمل ہے جس کا صدر مقام 'پورٹ بلیر' ہے جو ایک سیاحتی مقام بھی ہے۔ انڈمان ونکوبار کا رقبہ، آبادی، وہاں کے جغرافیائی حالات، سیاسی حالات، آب وہوا، اس کی تاریخی، سیاسی، سیاحتی اور سماجی صورت حال کو پیش کیا ہے۔

نو آبادیاتی بستی یا اوپن جیل کے قیام اور وہاں کے حالات کو بیان کرتے ہوئے شاہد صدیقی رقم طراز ہیں کہ:

''انڈمان جزائر فطری طور پر ایسے قدرتی قید خانے تھے جو تاحدِ نظر پانی سے گھرے اور ہندوستان سے بہت دور واقع تھے، جس کی تمام راہیں مسدود اور حدود اربعہ سمندر کی وسعتیں یعنی یہاں سے بھاگنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ مرطوب رُت، گھنے جنگلات، زہریلے کیڑے مکوڑے، خون پر پلنے والے جونک و پسو، مچھر اور وحشی درندے قبائلیوں سے پُر جسے کبھی زمینی جہنم یا وادی ظلمات کے ناموں سے بھی پکارا گیا ہے۔'' (ص 20)

شیر علی خاں آفریدی: ایک تعارف میں شیر علی خاں آفریدی کا خاندانی پس منظر، ان کے خیالات، شخصیت، وضع وقطع، بہادری، شجاعت اور کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔

جزائر کے شب وروز تین مقید مجاہدین کی نظر میں، رئیس الاحرار مولانا فضل حق خیر آبادی، مولوی محمد جعفر تھانیسری اور میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی، یہ تینوں بزرگ جزائر میں قید رہے ہیں۔ انھوں نے وہاں جو محسوس کیا، دیکھا، مشاہدہ کیا، صعوبتیں برداشت کیں اور وہاں کے شب وروز کس طرح گزرتے ہیں ان کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔

انگریز گورنر جنرل لارڈ میوٗ کی شخصیت پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک کنزرویٹو سیاستداں اور خاندانی نواب تھے جن کو لارڈ ناس کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، وہ پانچویں ارل کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ ہندوستان کی پہلی مردم شماری انھوں نے ہی کرائی تھی۔ لارڈ میوٗ نے عوامی کاموں، تجارت، ریلوے، جنگلات زراعت، آبپاشی اور جہاز رانی وغیرہ کو فروغ دیا۔

شیر علی خاں آفریدی ایک سابق برطانوی ملازم تھا وہ انگریزوں کے گھوڑ سوار دستے میں شامل تھا۔ شیر علی نے اپنے ایک دشمن حیدر علی کا قتل کر دیا تھا جس کی پاداش میں 2 اپریل 1867 کو عدالت نے پھانسی کا حکم سنایا تھا لیکن شیر علی کی کمپنی بابت مخلصانہ خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے سزائے موت کو کالے پانی میں بدل دیا گیا۔

شیر علی خاں نے اپنی حکمت عملی سے کام لیا اور وہ ایک نہایت معصوم شریف، حسن اخلاق کا پیکر بن گیا، دوسروں کی مدد کرنا، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا تقسیم کرنا اس کا شعار ٹھہرا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قیدیوں اور کمپنی حکام کی نظر میں ایک بھلا، نیک اور ہر دل عزیز انسان بن گیا۔ اس کو کمپنی نے بہت سی مراعات دے دیں، لیکن وطن واپس جانے پر بدستور پابندی رہی اور اس کو بارک میں مشقتی قیدیوں کی حجامت کا کام کرنے کی اجازت دے دی۔ جس سے شیر علی خاں کو بنا روک ٹوک جزیروں میں آمد ورفت کی سہولت حاصل ہوگئی اور اس کی سرگرمیوں پر نگرانی چھوڑ دی گئی۔ انگریزوں کے ظلم وستم اور

ناانصافیوں سے شیر علی بہت خائف تھااس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔اس نے کسی یورپی اعلیٰ عہدے دار کوقتل کرنا اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ چوتھے وائسرائے لارڈ میوٗ 24 جنوری 1872 کوکلکتہ سے برما ہوتے ہوئے 8 رفروری صبح 8 ر بجے مع اپنے لاؤ لشکر کے پورٹ بلیرٗ پہنچے۔ بہت سخت حفاظتی اقدامات کیے گئے تھے۔وائسرائے کا 21 رتوپوں کی سلامی سے والہانہ استقبال کیا گیا تھا۔شیر علی خاں کی رگوں میں آزادی کا طوفان برپا تھا، وہ تو اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔اس نے بڑی گہرائی وگیرائی سے حالات کا جائزہ لیااور وائسرائے کے قتل کا پختہ عزم کرلیا۔ اس نے سبزی کاٹنے والی چھری کو پتھر پر خوب چانڈ کرتیز دھار دار بنایا۔سر پہ کفن باندھ کر بھوکے شیر کی طرح اپنے شکار کا انتظار کرنے لگا۔سورج غروب ہو چکا تھا۔وائسرائے کے بیڑے میں شامل گلاسگو، ڈھاکا،نیمیس اور اسکاٹیا جہازوں کی چمکتی روشنی سے سمندر کا نظارہ بڑا پرکشش لگ رہا تھا۔شام کے سات بج چکے تھے۔لارڈ میوٗ کے دائیں جانب ان کے پرائیوٹ سکریٹری میجر او۔ٹی۔ برن تھے اور بائیں جانب انڈمان کے چیف کمشنر ڈونلڈ اسٹوارٹ تھے۔ پتھروں اور جھاڑیوں میں چھپ کر شیر علی خاں بھی اپنے شکار کی ہر سرگرمی پہ نظر رکھے ہوئے تھا۔بڑی بے صبری سے موقع کی تلاش میں تھا۔شیر علی کو جیسے ہی موقع ملا،اس نے لارڈ میوٗ کے چاق وچوبند محافظوں کی ذراسی چوک کا فائدہ اٹھالیا اور پلک جھپکتے ہی آن واحد میں لارڈ میوٗ کو دبوچ کر بڑی برق رفتاری سے سبزی کاٹنے والی چھری سے پے درپے وار کرکے قتل کردیا اور اپنی قسم اور ہدف کو پورا کیا۔انگریزی حکومت جس کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا، ہندوستان کی تاریخ میں کسی وائسرائے کا عہدے پر رہتے ہوئے یہ پہلا قتل تھا۔شیر علی خاں آفریدی نے وطن عزیز کے لیے یہ ایک بڑا کارنامہ انجام دیا تھا جس کے جرم میں اسے سزائے موت دی گئی تھی۔

غرض کہ یہ کتاب جہاں انڈمان ونکوبار کے بارے میں بڑی دلچسپ، حیرت انگیز اور روح افزا معلومات فراہم کرتی ہے وہیں گم نام مجاہد آزادیٔ وطن،شہیدان وطن،اوپن جیل، وہاں کی آب وہوا اور دیگر معلومات سے بھی آگاہی بخشتی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

کتاب مجلد،تصاویر سے مزین،سفید دبیز کاغذ اور مناسب قیمت پر دستیاب ہے۔توقع کرتا ہوں کہ یہ کتاب تاریخی،علمی اور ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کرے گی اور تشنگان علم کو سیراب کرے گی۔

ترتیب

زبیر رضوی: شخصیت اور خدمات

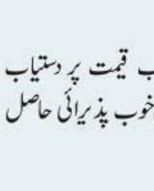

مرتب: عبدالحی

صفحات: 480، قیمت: 282 روپے،سنہ اشاعت: 2021

ناشر: کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد شاہنواز عالم

شعبۂ اردو،ملت کالج دربھنگہ، پوسٹ دربھنگہ۔ 846004 (بہار)

عہد حاضر میں زبان وادب کی تفہیم وتعبیر کے تعلق سے جن نوجوان قلمکاروں نے اپنی شناخت بنائی ہے ان میں ڈاکٹر عبدالحی ایک مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کی چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

پیش نظر کتاب 'زبیر رضوی: شخصیت اور خدمات' ان کی مرتبہ کتاب ہے،جس کے متعلق مشہور ومعروف ناقد حقانی القاسمی نے اپنے تاثرات میں لکھا ہے کہ ''عبدالحی نے پوری اردو برادری کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے'' اور اس کا جواز انھوں نے یہ پیش کیا ہے کہ ''یہ بہت المیاتی صورت حال ہے کہ عباقرہ اور نابغہ شخصیتیں ہمارے انفرادی اور اجتماعی حافظہ سے محو ہوتی جارہی ہیں۔'' حقانی القاسمی کے مندرجہ بالا جملے سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ واقعی عبدالحی نے اس کتاب کو مرتب کرکے اردو شعروادب کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے اور زبیر رضوی جیسی نابغہ شخصیت کو انفرادی اور اجتماعی حافظہ سے محو ہونے سے بچالیا ہے۔ یقیناً اس کار خیر کے لیے ڈاکٹر عبدالحی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحی نے اس کتاب کو مرتب کرنے میں اس امر کا خیال رکھا ہے کہ زبیر رضوی کی شخصیت اور ان کی خدمات کے تعلق سے کوئی گوشہ چھوٹ نہ جائے۔مثلاً کوائف کے تحت عبدالحی، مصباح احمد صدیقی اور مہتاب امروہوی نے تحقیقی بصیرت کی حامل اور مدلل تحریریں لکھی ہیں جن سے زبیر رضوی کی پیدائش سے موت تک کے تمام تر گوشے اجاگر ہوجاتے ہیں۔ وہیں شخصیت کے موضوع پر کل نو مضامین شامل ہیں جو ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں اور ان کے ادبی رجحانات ومیلانات کا احاطہ کرتے ہیں، چونکہ زبیر رضوی کو بطور شاعر کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔لہٰذا ان کی شاعری پر مشاہیر ادب کے کل اٹھارہ مضامین شامل ہیں جن میں ان کی شاعری کے مختلف ادوار، فکری اساس اور فنی شعور کو مختلف زاویۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔مثلاً ایک زمانے میں علی بن متقی ایک پراسرار کردار ان کی شاعری میں چھایا رہا اور لوگ اس کا سراغ لگاتے رہے۔اس تعلق سے پروفیسر شمیم حنفی نے تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ زبیر رضوی کی شاعری میں علی بن متقی زبیر کی اپنی ذات کا پرتو ہے،لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ زبیر کی فنی حکمت عملی شخصی واردات کو بھی ایک غیر شخصی واردات کا آہنگ عطا کرتی ہے۔

ان کی خودنوشت 'گردش پا' کو بھی کافی شہرت ملی۔اسلم پرویز، محمد نوشاد اور تالیف حیدر نے گردش پا پر اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔'گردش پا' کی خصوصیت یہ ہے کہ زبیر رضوی کے حالات وکوائف کے ساتھ ساتھ ان کے عہد اور ان کے گرد وپیش کی حقیقتیں مترشح ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ان کی ادارت میں شائع ہونے والا 'ذہن جدید' محتاج تعارف نہیں ہے۔خود مرتب نے ادبی صحافت پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور معلومات کو یکجا کرکے زبیر رضوی کے صحافتی مزاج کا بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ خراج عقیدت کے تحت مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کے جو تاثرات پیش کیے ہیں وہ بھی زبیر شناسی کے لیے دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے انٹرویو اور مضامین نے بھی کسی نہ کسی صورت زبیر رضوی کی فکری اساس کی مختلف جہتوں کو پیش کرتے بھی ہیں۔

کتاب کو مرتب کرنے میں ڈاکٹر عبدالحی نے کافی محنت اور مشقت سے کام لیتے ہوئے زبیر شناسی کا پورا حق ادا کیا ہے۔ کتاب میں مختلف مواقع پر لی گئی تصویریں بھی ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔

امید قوی ہے کہ یہ کتاب لوگوں کو پسند آئے گی۔

بہار میں بچوں کا ادب: کل اور آج

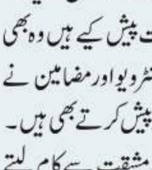

مرتب: ڈاکٹر منصور خوشتر

صفحات: 216، قیمت: 300 روپے،سنہ اشاعت: 2021

زیر اہتمام: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ

مبصر: ڈاکٹر عبدالرافع، صدر شعبۂ اردو، ملت کالج، دربھنگہ

زیر تبصرہ کتاب میں پروفیسر عبدالمنان طرزی کے دو منظوم تاثرات کے علاوہ

19 مضامین ومقالات شامل ہیں۔'اپنی بات' کے عنوان سے ڈاکٹر منصور خوشتر نے ایک عالمانہ مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ کتاب میں شامل پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، سید احمد قادری، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر عطا عابدی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر قیام نیر، رفیع حیدر انجم، پروفیسر ایم۔ جے وارثی اور ابرار احمد اجراوی کے مقالات و مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں جو ادب اطفال کے حوالے سے تحقیقی وتنقیدی، مبسوط اور معلومات افزا ہیں۔ ان مقالات ومضامین سے بہار میں ادب اطفال کے ابتدائی نقوش، آغاز وارتقا، خد و خال، صورت حال، مواد کی فراہمی اور متعلقہ موضوع کی اجمالی تفصیل سے آگہی ہوتی ہے۔ پروفیسر طرزی کے منظوم تاثرات جہاں منصور خوشتر کی شخصیت کے اہم گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں وہیں ان کی تصنیف وتالیف، تحقیق وتنقید اور تخلیق سے بھی آگاہ کراتے ہیں۔ دوسرا منظوم تاثر 'منظوم خطبۂ صدارت: سیمینار بعنوان 'بہار میں بچوں کا ادب' کے نام سے ہے۔ جس میں اکابرین، ادبا، شعرا اور کتاب میں شامل مقالات اور مقالہ نگاروں کو بھی شعری پیرہن عطا کیا گیا ہے۔

منصور خوشتر نے 'اپنی بات' کے تحت بہار میں ادبِ اطفال کی صورت حال اور کتاب میں شامل مقالات ومضامین کے حوالے سے عمدہ گفتگو کی ہے۔ اس سے جہاں مقالات ومضامین کی اہمیت وافادیت پر روشنی پڑتی ہے وہیں صاحب کتاب کی علمی لیاقت اور بصارت وبصیرت کا بھی پتا چلتا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مقالہ اردو ادب کا ایک معتبر حوالہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا بہ عنوان 'بہار میں ادب اطفال کا آئینہ' ہے۔ انھوں نے بہار میں ادب اطفال کے حوالے سے ابتدائی نقوش کی تلاش وتحقیق سے لے کر حالیہ قلم کاروں کا مختصراً جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ارتقائی صورت حال کی اجمالی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا دوسرا مضمون پروفیسر موصوف کا ہی ہے۔ جس میں پروفیسر طرزی کی نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نظموں کے انفراد واختصاص اور اسلوب کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

شاہد جمیل نے 'بچوں کے لیے ثوبان فاروقی کی جاسوسی کہانیاں' کے عنوان سے مضمون قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے فاروقی کی معروف کتاب 'رحمان کے کارنامے' میں شامل نو مضامین پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ ''یہ کہانیاں امریکی ادب اطفال کے مشہور ومقبول ادیب ڈونالڈ جے سوبول، کی کتاب انسائکلو پیڈیا یا براؤن سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہیں۔''

کتاب میں شامل ایک اہم مقالہ حقانی القاسمی کا ہے۔ ان کا مبسوط اور جامع مقالہ 'بچوں کے ظفر کمالی' کے عنوان سے ہے۔ موصوف نے ظفر کمالی کی نظموں کو ایک منفرد زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ بہ ظاہر یہ مضمون ظفر کمالی کی بچوں پر لکھی گئی نظموں کا تجزیہ ہے لیکن انہوں نے واضح اور دوٹوک انداز میں بچوں کے حوالے سے لکھی گئیں تخلیقات کی تفہیم وتنقید، تحسین وتعین قدر کے طریق کار سے بحث کی ہے۔ انہوں نے ادب اطفال تنقید کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ ظفر کمالی کی نظموں کے حوالے سے کئی اہم سوالات قائم کیے گئے ہیں جن کا اطلاق وانطباق ادب اطفال پر بھی ہوتا ہے۔

اس کتاب کا پانچواں مضمون سید احمد قادری کا 'بہار میں بچوں کا اردو ادب: ایک مختصر جائزہ' ہے۔ موصوف کا مضمون مختصر مگر جامع ہے۔ انھوں نے ماقبل و مابعد آزادی ہند بہار میں ادب اطفال کے حوالے سے ادبا وشعرا کی فہرست سازی کی ہے۔ بہار سے نکلنے والے مختلف رسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔

پروفیسر ایم جے وارثی نے رسالہ 'مسرت' کے حوالے سے ادب اطفال کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد رسالے کی اجمالی تفصیل پیش کی ہے اور ماہنامہ مسرت میں لکھنے والے ادیب وشاعر اور اس کے مشمولات پر بھی مختصراً گفتگو کی ہے۔ 'بچوں کا ادب' کیوں، کیسے اور کس لیے'' ڈاکٹر جمال اویسی کا مختصر مگر جامع مضمون ہے۔ انھوں نے ادب اطفال کے سلسلے میں چند اہم اور پر مغز سوالات کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب اطفال نام کی کوئی صنف ہمارے معاشرے میں زندہ ہے بھی کہ نہیں اور کیا ادب اطفال کے حوالے سے نکلنے والے رسالوں کی رسائی مسلم گھرانوں کے افراد اور ان کے بچوں تک ہو پاتی ہے یا نہیں؟

ڈاکٹر عطا عابدی کا منفرد اور جامع مقالہ 'بچوں کی کتابیں: تعارف وتذکرہ' 30 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالہ ادب اطفال کے سلسلے میں محققین وناقدین کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کا مضمون 'مناظر عاشق ہرگانوی اور بچوں کے لیے سبق آموز کہانیاں' ہے۔ موصوف نے ادب اطفال کے لیے اشاعتی اداروں اور ان سے شائع شدہ اہم مضامین وتخلیقات اور چند رسائل کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ہرگانوی کی کہانیوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔

رفیع حیدر انجم کا مضمون 'ادب اطفال میں شاہد جمیل کا مقام' کے عنوان سے ہے۔ انہوں نے شاہد جمیل کی بچوں کے حوالے سے لکھی گئی کہانیوں اور نظموں کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر کا مختصر مضمون 'بچوں کے ادب میں کہانیاں: بہار کے تناظر میں' کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔

ڈاکٹر احسان عالم کا مضمون 'بچوں کے شاعر: ذکی احمد چندن پٹوی' ہے جس میں انہوں نے ذکی احمد کی پیدائش، تعلیم وتربیت اور ان سے موصوف کے رشتے کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں کا اختصار کے ساتھ تجزیہ پیش کیا ہے۔

ایک مضمون 'بہار میں بچوں کا ادب' کے عنوان سے شامل ہے جو ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کے رشحات قلم کا مظہر ہے۔ یہ مضمون ثوبان فاروقی، ذکی احمد، عبدالمنان طرزی، مناظر عاشق ہرگانوی، عطا عابدی، احسان عالم، جمیل اختر شفیق اور انظار احمد صادق کے خصوصی حوالے سے لکھا گیا ہے۔

'اکیسویں صدی میں بچوں کا ادب: سمت ورفتار ریاست بہار کے حوالے سے' ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کا ایک مفصل، وقیع اور عالمانہ مضمون ہے۔ فاضل مضمون نگار نے متعلقہ موضوع کے حوالے سے چند ایسے اہم نام اور ان کے کام کے متعلق گفتگو کی ہے جن کا ذکر کسی مقالہ نگار یا مضمون نگار نے نہیں کیا ہے۔

فرزانہ فرحت لندن نے 'نسل نو کا معمار امان ذخیروی' کے عنوان تحت ان کی نظموں کا بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر مستفیض احد عارفی نے حال ہی میں شائع شدہ ڈاکٹر احسان عالم کی نئی کتاب 'بچوں کے سنگ' کے حوالے سے اختصار وجامعیت کے ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے اپنے مضمون 'منصور خوشتر کا ادب اطفال: تفہیم اور فکر وفن کے آئینے میں' میں ادب اطفال کا عمومی جائزہ پیش کرنے کے بعد اس حوالے سے منصور خوشتر کی لکھی گئی نظموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ غلام نبی کمار نے 'بہار میں ادب اطفال کے نمائندہ قلم کار' کے تحت مناظر عاشق ہرگانوی، عطا عابدی، احسان عالم اور منصور خوشتر کے مضامین، کہانیاں اور نظموں کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا آخری مضمون بہ عنوان 'پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی: بچوں کے ادیب' ڈاکٹر محمد پرویز کا ہے۔ انھوں نے پروفیسر موصوف کی منتخب کہانیوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ منصور خوشتر کی تازہ ترین کتاب 'بہار میں بچوں کا ادب: کل اور آج' میں شامل تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی مقالات ومضامین تاریخی و دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔

شاعری

سرہانے میر کے

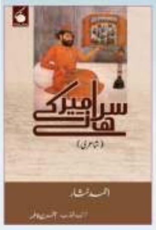

شاعر:احمد نثار

صفحات: 160، قیمت: 107 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: انور بھدرکی، نزد پربھو، لے آؤٹ، 312، نسر گار یسیڈنسی ولیج، کماسندرا، پوسٹ الیکٹرانک سٹی، بنگلورو 560100 (کرناٹک)

’سرہانے میر کے‘، احمد نثار کی غزلوں کا چوتھا مجموعہ ہے جو 2021 میں منظرِ عام پر آیا ہے۔اس مجموعہ میں جناب ڈاکٹر رؤف خیر کا مضمون ’آہستہ بولو‘ شامل ہے۔کتاب کے فلیپ پر جناب اسلم انصاری اور جناب غلام نبی کمار کے مضمون بھی ہیں۔کتاب کے بیک پیج پر جناب معراج احمد معراج کا مضمون ہے۔’اپنی بات‘ میں احمد نثار نے کھل کر تو نہیں مگر کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔سلیم انصاری فرماتے ہیں:

’’احمد نثار کی شاعری کے باطن میں حیرتوں اور تجسس کی ایک دنیا آباد ہے جو قاری کو بھی اپنے تجربات میں شریک کر کے اس پر معانی و مفاہیم کے نئے اور انوکھے در وا کرتی ہے اور شاید ان کی شاعری کی یہی خصوصیت ان کی تخلیقی شناخت کا معتبر حوالہ ہے اور یہی شناخت انہیں فکر و احساس کی ان دیکھی دنیاؤں کے سفر پر آمادہ کرتی ہے۔‘‘

احمد نثار کے شعروں میں ایک ایسی فضا اور ماحول ابھرتا ہے جس سے گزرتے ہوئے ایک عجیب کسک اور درد کا احساس ہوتا ہے۔موصوف کی غزلیں ترچھی لکیروں سے لے کر شعور فن کے مرحلے تک ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کی ترجمان ہیں انھوں نے اپنے گردو پیش جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے شعری زبان دی ہے۔موصوف نے فکری سطح پر زندگی کا مشاہدہ بہت نزدیک سے کیا ہے۔انھوں نے نہ صرف اپنے اردگرد کے ماحول سے استفادہ کیا ہے بلکہ خود کا بھوگا ہوا سچ اور زندگی کے محرکات سے حاصل شدہ مشاہدہ سے شاعری کا خمیر تیار ہے۔

احمد نثار نے اپنی غزلیات میں اپنے احساسات، کرب اور فکر کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنے تجربات اور اپنے کرب کو اپنے غزلیہ کلام میں سمونے کی عمدہ کوشش کی ہے۔احمد نثار کے اشعار میں سلاست، روانی، شیفتگی اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔اردو اصناف شاعری کی محبوب صنف، جس کی کشش نے غالبًا تمام کو اپنے دامن میں پناہ ہی نہیں دی بلکہ دامن گیر ہونے کو بھی مجبور کیا ہے۔

احمد نثار کے یہاں جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے کئی وسائل موجود ہیں۔موصوف نے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر اتار کر اور انہیں شعری پیکروں میں ڈھال کر اپنے قارئین کے لیے ذہنی حظ کا مواد فراہم کر دیا ہے۔جو قابلِ ستائش ہے۔شاعری کے ذریعے اپنے عہد کی تمام معقولیت اور نا معقولیت کو انھوں نے زبان و بیان کی سادگی او بھولپن کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو آفاقیت بخشنے کے لیے اسلوب اپنایا ہے۔

احمد نثار کے اشعار کی زبان نہایت سلیس، صاف اور غیر مبہم تو ہے ہی، انھیں لفظوں کو برتنے میں بھی کمال حاصل ہے۔انھوں نے شاعری میں پیچیدہ بیانی سے انحراف کرتے ہوئے شستہ اور برجستہ کلام کو ترجیح دی ہے۔ان کی غزلوں کا اسلوب نہایت گٹھا ہوا ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ان کی شاعری خالص مکالماتی انداز کی ہے۔ان کی شاعری کہیں بھی تشبیہات و استعارات کے طومار سے بوجھل نہیں ہے۔انھوں نے جدید رجحانات اور عصری میلانات کو اپنی غزلوں میں برتنے کی فنکارانہ سعی کی ہے۔فنی، فکری اور شعوری سطح پر بھی ان کی غزلوں میں کئی موضوعات نمایاں ہیں۔ان کی غزلیات ’تشنگی‘ کی ترجمانی کس کس طرح کرتی ہیں اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

یہ تشنگی تو مرے ظرف کو نگلنے لگی — کبھی لبوں سے لگایا نہیں گلابوں کو
بجھ گئی تشنگی کناروں سے — دید بھر زعم میں سمندر تھا
تشنگی ہے بندہ پرور دور تک — کچھ ہمارا شہر بھی سیراب ہو
کہرے کی سرد رات میں جلنے لگی ہوا — اک تشنگی کا لمس جو ٹکرا گیا تو پھر
ٹھوکر سے میری راہ میں چشمہ نکل گیا — قد تشنگی کا حد سے زیادہ نکل گیا
تشنگی مجھ میں اس قدر کب تھی — پاؤں تک آگئی ندی اے نثار
ریت ہے اپنی تشنگی کے لیے — دھوپ کا، سر پہ شامیا نہ ہے

’تشنگی‘ سے متعلق مذکورہ بالا اشعار گواہی دے رہے ہیں کہ احمد نثار نے غمِ یاراں اور غمِ جاناں سے الگ ہٹ کر نہ صرف غمِ دوراں کی بات کی ہے بلکہ انھوں نے شعری جہتوں اور سخن فہمی کے ساتھ زندگی کے تمام نشیب و فراز اور شکست و ریخت کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

احمد نثار کی غزلوں میں خواہشیں، آرزوئیں اور تمنائیں بھی ہیں، ان میں حوصلہ ہے اور محکم ارادے بھی، ان میں افسوس ہے اور مایوسی ہے، ان میں بیزاری ہے اور ناراضگی بھی، ان میں اعتماد ہے تو اعتبار بھی۔موصوف کی شعری انفرادیت موجودہ منظر نامے کی دین ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے کلام کا ان کے معاشرے سے تطابق دیتے ہوئے توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

زمیں کا بوجھ اترتا نہیں ہے شانوں سے — میں ایک جست میں کرلوں فلک کو مٹھی میں
وہ جانتے ہیں وقت بڑا نا سپاس ہے — اس شہر میں مقیم خداؤں سے پوچھیے

مذکورہ بالا اشعار میں انھوں نے انسانی جذبات کو جس طرح سمیٹا ہے وہ بے مثال اور قابلِ تحسین ہے۔احمد نثار کی غزلوں میں خاص کر ایسے اشعار کی بھر مار ہے جن میں اکثر و بیشتر قاری کو اپنی زندگی کی دھندلی سی تصویر ابھرتی ہوئی محسوس ہو ہی جاتی ہے۔انھوں نے روایتی اور پرانی باتوں کو نئے ڈھنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے نیز نیا پہلو، نیا نکتہ جوڑ کر شعری معنویت میں اضافہ کیا ہے جو ان کی قابلیت کی دلیل ہے، ساتھ میں زمین سے جڑی ہوئی شاعری کا مظہر بھی۔

ہائے مری خموشی کہ سُر دے تال دے — کیسی اداسیوں کا سفر ہے پتہ نہیں
ہم جان نثاروں کی تو ہر بات جدا ہے — سینے میں مرے گوشہ نشیں بھی نہیں ٹھہرے
مر کے جائیں گے کہاں ہم تو یہیں کے رہیں گے — ہم اگر آئے سر دار تو سُن لے یہ وطن

ذاتی جذبات و کیفیات کو اجتماعیت کی شکل دینا احمد نثار کا اپنا طریقہ ہے۔انھوں نے ایسی لفظیات اور لہجے کا استعمال کیا ہے جس سے نئے پن کا احساس ابھرتا ہے۔انھوں نے اپنے دور کے سلگتے ہوئے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ان کے اشعار میں شوخی بھی ہے، کربناکیاں بھی، سلگتی دھوپ کی تپش بھی ہے اور لہلہاتے سبزہ زار کی ٹھنڈک بھی، غرض کہ زندگی اور کائنات کا ہر رنگ میں ان کے اشعار میں ہویدا ہے۔انھوں نے زندگی کو جس انداز میں جیا اس کی عکاسی کسی نہ کسی شکل میں ان کے اشعار میں موجود ہے اور یہی ان کی شاعری کی خوبی بھی ہے۔

انس کے دوہے

مصنف: انس خان

صفحات: 128، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عفیف سراج

M-114، ابوالفضل انکلیو، ٹھوکر نمبر 5، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

امیر خسرو کی جائے ولادت پٹیالی سے تھوڑے ہی فاصلے پر مادر وطن کی آغوش کو عظیم بیٹے دینے والی زمین قائم گنج نے دور حاضر کو ایک نابغہ پھر عطا کیا ہے۔ جن حضرات نے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ پڑھی ہوگی انھیں قائم گنج کے پٹھانوں کی خوب خبر ہوگی۔ قائم گنج نے ہندوستان کو ڈاکٹر ذاکر حسین جیسا سیاسی لیڈر، رشید الدین خاں جیسا عالم، بشیر الدین خاں جیسا مدرس، پدم شری غلام ربانی تاباں جیسا گوہر نایاب، مسعود حسین خاں جیسا محقق، خورشید عالم خاں جیسا سماجی کارکن عطا کیا ہے۔ مختصر یہ کہ قائم گنج کی زمین اس قدر زرخیز ہے کہ اس میں ہر رنگ کے پھول اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ کھلتے رہے ہیں۔

ایک مدت سے جہانِ شعر و سخن اس زمین کی جانب پرامید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جہاں کی فضاؤں میں خسرو نے سانسیں لی تھیں، اس مٹی کی قوت تخلیق نے پھر ایک انگڑائی لی اور خسرو کے تقریباً آٹھ سو برس بعد پھر ایک آفتاب افق سخن کو بخشا۔ انس نے ہم سے اکثر دوران گفتگو یہ بات کہی کہ انھیں قطعی طور پر یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے سخن کے لیے دوہوں کی صنف کا ہی انتخاب کیوں کیا مگر جب انھوں نے یہ بتایا کہ خسرو کی جائے ولادت ان کی ہی آبائی سرزمین کا ایک خطہ ہے تو یہ گتھی اپنے آپ سلجھ گئی۔ یعنی یہ کہ انس نے دوہوں کا انتخاب نہیں کیا بلکہ دوہوں نے انھیں منتخب کیا۔

اردو شاعری کی تاریخ میں دوہوں کا ایک منفرد مقام ہے۔ اگرچہ ہندی زبان کے ادبا کا یہ دعویٰ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے ہندوستان میں دوہے کہے جا رہے ہیں مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ بارہویں صدی میں دوہے اپنے مکمل اوزان اور آہنگ کے ساتھ بابا فرید گنج شکر کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دوہے جیسی سلیس، بلیغ، پراثر اور لچکدار صنف کو اہل اردو نے فراموش کر دیا جب کہ یہ انہی کا ورثہ تھی۔ اگرچہ چند غزل گو شعرا نے اس میدان میں ہاتھ آزمایا لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے، یا یوں کہا جائے کہ اکثر 'سرسی چھند' اور 'دوہے' کے بیچ فرق نہ کر سکے۔ ہندی زبان میں بھی دوہے کہنے کی بہت کوشش کی گئی اور یہ کوشش ہنوز جاری ہے لیکن ان دوہوں میں نہ تو جاذبیت ہے، نہ آہنگ اور معنوی تہہ داری۔

دوہوں کا حسن اس کا استعاراتی نظام اور اس کی لچک یا آہنگ ہے۔ کبیر، رحیم اور دیگر اساتذہ کے دوہوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوہا چار جملوں کا مجموعہ ہے جس میں ہر جملہ اپنے آپ میں مکمل بھی ہوتا ہے اور اگر دو جملوں کو ملا کر پڑھا جائے تو ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط بھی۔ یعنی دوہے کے ہر مصرعے میں دو دو جملے ہوتے ہیں۔ چار جملوں کا یہ مجموعہ اس طرح تحریر کیا جاتا ہے کہ پہلے تین جملے یعنی ڈیڑھ دوہا ایک مسلسل فکر منظر، فلسفہ یا کلیہ پیش کرتا ہے اور چوتھا یعنی آخری حصہ دلیل فراہم کرتے ہوئے دوہے کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی کیفیت رباعی سے بہت مشابہ ہے جہاں واقعہ دو مصرعوں میں منظر کشی کے مراحل طے کرتا ہے تیسرے مصرعے میں اپنے عروج پر پہنچتا ہے اور چوتھا مصرعہ اس کا نتیجہ یا تتمہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ کہ ہر جملے کے اختتام اور دوسرے جملے کی ابتدا کے درمیان لچک اور اچھال کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ اسی لچک یا اچھال کو دوہے کا خاص آہنگ کہتے ہیں، راقم الحروف کی نگاہ میں دیگر اصنافِ سخن میں یہ کیفیت کہیں نہیں پائی جاتی ہے۔ انس خاں ایسے انحطاط کے ماحول میں ایک ایسا نام افقِ ادب پر نظر آتا ہے جو دوہوں کے تمام تر لوازمات، کیف و آہنگ کے ساتھ دوہے کہہ رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موصوف نے گزشتہ اٹھارہ برس صرف اور صرف دوہا نگاری کی ریاضت میں صرف کیے ہیں جس کے نتیجے میں 'انس کے دوہے' نام سے ایک مجموعہ کلام اک زمانے بعد دنیائے اردو کو دستیاب ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں چودہ ابواب ہیں۔ ان ابواب میں سائنسی، تصوف، شرنگار، تلمیحاتی، مانوتا وادی، طنزیہ، ماحولیاتی، پیامی جیسے دوہے درج کیے گئے ہیں۔ آیئے اب انس کے چند دوہوں کی جانب رخ کرتے ہیں۔

انس خاں کی تعلیم و تربیت چونکہ سائنس کی ہے وہ پیشے سے ایک انجینئر ہیں اور انھوں نے کبھی باقاعدہ ادب نہیں پڑھا، اس لیے ان کا لہجہ، طرز سخن اور فکر، دیگر ادبا اور شعرا کے طرز نگارش سے بے حد مختلف ہے۔ یہی فرق انس کے دوہوں کو انفرادیت اور تازگی عطا کرتا ہے۔ کائنات میں ہونے والی واردات انس کی 'چیتنا' کو خواب سے بیدار کرتی ہے اور یہ بیدار چیتنا موصوف کے اندر کے دوہا نگار کو اس قدر بے چین کر دیتی ہے کہ اس کا اظہار ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ تڑپ اور بے ساختگی انس کے تقریباً ہر دوہے میں نظر آتی ہے۔ انس کہتے ہیں۔

آنکھیں موندیں دن ہوا جو کھولیں سو رین
انتس سے دکھنے لگا ویرتھ ہوئے یہ نین

مندرجہ بالا دوہے میں دوہہ دار تجلیِ دروں کی جانب اپنے قاری کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہے۔ وہ ظاہری تجلی کو تاریکی اور باطن میں موجود تاریکی کو نور سے تشبیہ دے رہا ہے۔ اس کے مطابق دراصل تمام خارجی موجودات داخلی تجلی کا عکس ہیں۔ اس داخلی تجلی کو کبھی وہ چیتنا کہتا ہے تو کبھی روح سے تشبیہ دیتا ہے۔

دیکھی جب من کی دشا چیتن ہوا سترک
شاید یہ سنسار ہو کسی گرہ کا نرک

انس کے دوہوں میں داخلیت کا عنصر بے انتہا پایا جاتا ہے۔ سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے دوہادار وجود انسانی کی ممکنہ صلاحیتوں کا متلاشی نظر آتا ہے۔

اپنے اندر میں گیا اک دن کرنے سیر
اتنا آگے بڑھ گیا پیچھے چھوٹے پیر

حقیقت یہ ہے کہ انس کے دوہے تشریح کے لیے ایک مکمل کتاب کے متقاضی ہیں۔ اس کی وجہ ان دوہوں کا استعاراتی نظام ہے جسے کئی پہلو سے جانچا پرکھا جانا ضروری ہے۔ ان کے تقریباً ہر دوہے میں کم از کم دو پہلو، طبعیاتی اور مابعدالطبعیاتی تو موجود ہیں ہی اس کے علاوہ روحانی، سماجی، اخلاقی جیسے ہزاروں پہلو بے حد حسین استعاروں کی کہکشاں میں جلوہ نما ہیں۔ انس کے فکری میلان کا غماز ایک دوہا قارئین کی نذر کرنے کا جی چاہ رہا ہے۔ مندرجہ ذیل دوہا انس کی اس فکر کا غماز ہے جو چیتنا یا روح کی بالادستی کا اعلان کرتا ہے۔

انتر من کی روشنی اجیارے کا سروت
انکھین کی بجھ جائے پر رہے گیان کی جیوت

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوہوں کا مجموعہ 'انس کے دوہے' اردو ادب کی تاریخ میں فن دوہا گوئی کی تجدید کے حوالے سے ایک سنگ میل کی حیثیت کا حامل ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اردو ادب میں خدمت کر رہے دیگر اہل فن کو اپنی جانب متوجہ کر سکے گی اور ایک بار پھر سے مفقود ہوتی ہوئی اس صنف سخن پر بہار آئے گی۔

فکشن

ڈھولی دگڑو ڈوم

مصنف: غیاث الرحمٰن
صفحات: 128، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ایس ایم حسینی، 04/ندوہ کیمپس، ڈالی گنج، لکھنؤ

ہندوستان کی عام سماجی زندگی کی بے راہ روی اور ذات پات کا نظام دراصل طبقاتی تقسیم کی قدیم ترین مثال ہے۔

زیر نظر ناول ڈھولی دگڑو ڈوم طبقاتی کشمکش اور گذشتہ دنوں وبا کے دوران ہونے والی تباہی کی داستان ہے، کہانی چھوا چھوت کے ہندوستان میں جنم لیتی ہے اور کورونا کے ڈھائی سالہ وسیع کینوس پر دلت، اچھوت، شودر، کلیان اور نروان جیسے حوالوں اور لفظوں کے گرد گھومتی ہوئی ذاتی تعصّبات کی بنیاد پر وجود میں آنے والے مسائل کو پیش کرتی ہے، مصنف نے ڈوم ذات سے تعلق رکھنے والے مرکزی کردار دگڑو کو ناول کا عنوان بنایا ہے جس کا کام ڈھول بجانا، مردار جانوروں کی کھال اتارنا اور مہاماری کے دنوں میں چتائیں جلانا ہے، دوسری جانب سرلا کا کردار بھی قاری کو اپنی جانب بآسانی متوجہ کر لیتا ہے، جو طبقاتی تفریق کے خلاف مزاحمت کا شعلہ ہے اور ایک بامن ہوتے ہوئے دگڑو کی محبت میں گرفتار ہے جس میں کہیں ہمدردی کا جذبہ بھی پوشیدہ ہے کیوں کہ اس نے بچپن سے دگڑو کی طرف صرف نفرت بھری نگاہیں اٹھتی دیکھی ہیں، کہانی میں اور بھی دیگر کردار جیسے رنجنا، برجو، سیٹھ گوپال راؤ، سمپت دادا اور اندو رنگ بھرتے نظر آتے ہیں، کہانی فلیش بیک کی تکنیک سے شروع ہوتی ہے اور اتنی آہستہ روی سے آگے بڑھتی ہے کہ بعض اوقات جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے لیکن منظر کشی میں جزئیات نگاری اور کردار کی بنت میں ایسی تخلیقیت ہے کہ ذہن پر ان کے نقوش تادیر باقی رہتے ہیں۔

پہلی نظر میں ناول دو ایسے انسانوں کی خاموش محبت کی کہانی ہے جو فی زمانہ روایتی محبت سے مختلف اور اپنے اندر میٹھا احساس لیے ہوئے ہیں جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ کہانی اس وقت نیا موڑ اختیار کرتی ہے جب پجاری پر سرلا اور دگڑو کے رشتہ سے متعلق انکشاف ہوتا ہے اور داروغہ کی سانٹھ گانٹھ سے دگڑو کو چوری کے الزام میں پھنسانے کی کوشش میں ناکامی کے بعد ایک روز پجاری اپنی ہی بیٹی کا گلا تکیہ سے گھونٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کورونا کی فضا میں لکھا گیا یہ ناول ہندوستان کے حاشیائی افراد کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔

ناول میں کردار نگاری و منظر کشی اپنے عروج پر نظر آتی ہے لیکن جزئیات نگاری، ہندی الفاظ کی کثرت اور متن میں موجود املا کی فحش غلطیاں کہانی اور قاری کے رشتے کو مجروح بھی کرتی ہیں، البتہ ہندی الفاظ کا استعمال کئی مقامات پر موضوع کا مطالبہ معلوم ہوتا ہے لیکن متعدد ایسی جگہیں ہیں جہاں متبادل اردو لفظوں سے بھی کام لیا جا سکتا تھا، ناول کی قرأت کے دوران کئی چیزیں کھٹکتی ہیں مثلاً ناول کا ٹائم پیریڈ کورونا ہے لیکن پورے قصہ میں کہیں بھی فون کا ذکر نہیں ہے الا ماشاء اللہ، دگڑو کا بغیر فون اور کسی پیغامبر کے ندی کے مقام پر سرلا سے بار بار کی ملاقات، کئی روز کے بعد اچانک سرلا کا دگڑو سے ندی پر ملنا اور جھٹ ٹی شرٹ نکال کر دینا، علاوہ ازیں ندی پر عورتوں کا کپڑے دھونے آنا وغیرہ، آج کے دور میں یہ سب ناممکن سا لگتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ناول کا ماحول، فضا اور زمانہ کئی دہائی قبل کا معلوم ہوتا ہے، مصنف کا اسلوب نہایت شائستہ اور لفظوں کا انتخاب عبارت میں شگفتگی کا باعث ہے، اگلا قصہ پچھلے واقعہ سے مربوط ہوتا ہے، وہ پہلے کہانی کو قاری سے جوڑنے کی مکمل کوشش کرتے ہیں، پھر کہانی دھیرے دھیرے اپنے پیک پوائنٹ پر پہنچتی ہے اور اختتام اتنی خاموشی سے ہوتا ہے کہ اگلے ہی لمحہ قاری کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جاتی ہیں، یہیں پر بس نہیں بلکہ ناول کا خاتمہ جس منظر کے ساتھ ہوتا ہے وہ قاری کے ذہن پر ایک آخری ضرب لگاتا ہے، جو انسانی روح کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے، بھیکو ڈوم اور ان تین اگھوری سادھوؤں کے سامنے کنواری بامن کا مِرت شریر چتا پر رکھا ہوا ہوتا ہے، لیکن دگڑو کے موقع پر پہنچنے سے وہ 'نیچ ذات' سے مُکت ہونے اور موکش حاصل کرنے کا آخری موقع گنوا بیٹھتے ہیں، ہلکی سی مزاحمت کے بعد دگڑو سرلا کی لاش لاد کر پورنا ندی کے ٹھاٹیں مارتے ہوئے سیلاب میں چھلانگ لگاتا ہے تو قاری کا ذہن الجھن اور کئی ملے جلے جذبات کا مرقع بن جاتا ہے۔

اس ناول میں جا بجا مہاراشٹری زبان اور لب ولہجہ سے بھی سابقہ پڑتا ہے، کتاب کے سرورق پر مضمون اور عنوان کی مناسبت سے ڈھول پیٹتے ہوئے ایک شخص کی تصویر کشی کی گئی ہے اور اس میں لہراتا ہوا ماسک کورونا کا استعارہ ہے، جو نہایت دیدہ زیب ہے اور طباعت صاف ستھری ہے، ناول کا عنوان ہی قاری کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے، امید ہے اردو فکشن کے قارئین اس ناول کی طرف ضرور متوجہ ہوں گے۔

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

عالمی اردو نامہ

اردو زبان کی صورتحال

استنبول: استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور شرقیات ریسرچ سینٹر کے اشتراک سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر صابر گودڑ نے کہا کہ ماریشس میں ابتدائی اسکولوں سے یونیورسٹی سطح تک اردو کی تدریس ہوتی ہے اور اب طلبہ پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھنے لگے ہیں۔ اردو زبان کی صورت حال ماریشس میں کافی بہتر ہے، یہاں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر باقاعدہ اردو کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ وزارت فنون و ثقافت کی جانب سے ہر سال نیشن اردو ڈرامہ فیسٹیول منعقد ہوتا ہے۔ ماریشس میں اردو کے فروغ میں اردو اسپیکنگ یونین اور نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ جیسے فعال ادارے کام کررہے ہیں۔ ہمارے ملک میں مادری زبان نہ ہونے کے باوجود قلمکار مسلسل اردو میں ناول، افسانے اور ڈرامے لکھے رہے ہیں۔ یہاں عالمی مشاعرے بھی ہوتے ہیں اور لوگ اردو میں شاعری بھی کرتے ہیں۔
اس موقعے پر محترمہ مریم گودڑ نے کہا کہ ماریشس کی آزادی میں یہاں کے مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر خلیل طوقار نے ترکی اور ماریشس کے قدیم روابط کا ذکر کرتے ہوئے مختلف ممالک میں اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ پروگرام میں پروفیسر جلال صویدار، ڈاکٹر آرزو سودزین اور ڈاکٹر راشد حق کے علاوہ متعدد اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 جون 2022

حسرت جہاں

چھپرہ: تیزی سے ابھرتی ہوئی انڈیا کی کیلی گرافر اور آرٹسٹ محترمہ حسرت جہاں صاحبہ نے انٹرنیشنل عربی خطاطی کی نمائش میں ممتاز مقام حاصل کرکے بہار اور ہندوستان کا نام روشن کیا۔ مراکش میں قائم کردہ کردستان کیلی گرافرز فاؤنڈیشن، انڈین کلچرل سینٹر، مصری جمعہ گیلری فاؤنڈیشن اور یونیسکو اٹلس کلب کی جانب سے اس نمائش کا انعقاد کیا گیا تھا اور اس میں سیکڑوں خطاطوں نے اپنا آرٹ پیش کیا تھا۔ حسرت جہاں صاحبہ کو ان کے آرٹ اور عربی خطاطی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے سند تفویض کی گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی عالمی نمائش میں حسرت جہاں صاحبہ اپنا آرٹ پیش کرکے سند قبولیت حاصل کرچکی ہیں۔
آرٹسٹ حسرت جہاں نے نہ صرف کیلی گرافی بلکہ آرٹ ورک سے بھی کام لیا ہے اور کیلی گرافی کے ساتھ ساتھ پینٹنگ کا بھی جلوہ برقرار رکھا ہے۔ پینٹنگ کے استعمال سے خطاطی کے حسن میں چار چاند لگادیتی ہیں۔
حسرت جہاں بتاتی ہیں کہ یہ کمپٹیشن میرے لیے بہت چیلنجنگ تھا، اس میں میرا مقابلہ ایک المغرب سے تھا جن کا نام رشید الشیطی ہے۔ انڈیا میں عربی کیلی گرافی کرنے والے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں اور حسرت جہاں ان میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس کام کو فروغ دینے کی کوشش بھی کررہی ہیں۔
اس سے پہلے منی کرنیکا آرٹ گیلری کی جانب سے منعقد کیے گئے آرٹ نمائش میں بھی انھوں نے اپنا فن پیش کیا اور وہاں سے ایوارڈ حاصل کیا۔ پھر ایکم کلا سنگھ پنجاب کے آرٹ نمائش میں اپنی تخلیق پیش کی اور وہاں بھی ایوارڈ سے انھیں نوازا گیا۔ انٹرنیشل اسلامک آرٹ ورچول ایگزیبیشن انڈونیشیا میں شرکت کی اور یہاں سے بھی سٹیفکیٹ آف آنر سے نوازا گیا۔ حال ہی میں چار ممالک کی مشترکہ آرٹ ورک کیلی گرافی میں شرکت کے لیے 'کلچرل ٹو انڈیا' کی جانب سے حسرت جہاں کو اس نمائش میں اپنا فن پیش کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ عراق، ہندوستان، مصر اور مغرب کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اسمائے حسنیٰ کی کتابت وخطاطی کے مقابلے میں انھیں زریں ستارے کے اعزاز وسند سے نوازا گیا۔

مختلف اخبارات سے، 22 مئی 2022

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

یوگا ہماری ذہنی وجسمانی صحت کا ضامن ہے: پروفیسر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل کے زیراہتمام عالمی یوگا ڈے منایا گیا

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیراہتمام آج عالمی یوگا ڈے منایا گیا۔ اس موقعے پر ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یوگا ہماری ہزاروں سالہ ثقافت کا حصہ ہے، جس نے دنیا بھر کو صحت مند

سرگرمیوں کا آرٹ سکھایا اور آج بھی عالمی سطح پر اس کی اہمیت وافادیت تسلیم کی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوگا ایک ایسی نعمت ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو انسان صحت مند ہونے کے ساتھ ساتھ مثبت توانائی سے بھی لبریز ہوجاتا ہے۔ یوگا ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو ذہنی، جسمانی اور جذباتی طور پر مضبوط بناتا ہے۔ یوگا جدید دور میں تناؤ اور اضطراب کو کم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ یوگا جسم کو چست درست رکھنے اور بہتر صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ ہمارے سیلز کو زندہ رکھتا ہے، چہرے کی رونق اور خون کی گردش کو بھی بہتر بناتا ہے۔ پروفیسر عقیل نے کہا کہ یوگا کا اہتمام کرنے والے کا چہرہ ہمیشہ تروتازہ اور شاداب رہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوگا ہر عمر کے لوگوں کے لیے مفید ہے اور اسے اپنا کر ہم اپنی زندگی کو ذہنی وجسمانی ہر اعتبار سے پرسکون بنا سکتے ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 جون 2022

ایس ٹی رضا کی کتاب 'تفہیمات' کا اجرا

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کے ہاتھوں روزنامہ دور جدید کے مدیر ایس ٹی رضا کے تنقیدی مضامین اور تبصروں کے مجموعے 'تفہیمات' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر شیخ عقیل نے مصنف کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اس کتاب کے مشمولات قابلِ مطالعہ ہیں اور اپنے موضوعات کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایس ٹی رضا نے جن فن کاروں اور تخلیق کاروں کو موضوعِ تحریر بنایا ہے وہ اپنے تخلیقی وفنی میدانوں میں غیر معمولی اہمیت وشہرت بھی رکھتے ہیں، مگر ابھی ان میں سے بیشتر کے بارے میں زیادہ نہیں لکھا گیا ہے، ایس ٹی رضا نے ان کے فکر وفن کا جائزہ لے کر ان کی خدمات کے اعتراف کا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ شیخ عقیل نے مصنف کی تنقیدی بصیرت، تجزیاتی لیاقت اور فن کو پرکھنے کی غیر معمولی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ان مضامین کو پڑھ کر متعلقہ فن کاروں کے حوالے سے کئی نئے زاویہ ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہماری معلومات وبصیرت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اس کتاب میں جن تخلیق کاروں پر مضامین شامل ہیں ان میں سلام مچھلی شہری، زبیر الحسن غافل، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، مشرف عالم ذوقی، تبسم فاطمہ، ڈاکٹر سید احمد قادری، اسلم جمشید پوری، شکور انور، ابرار احمد شبیری کامل، حبیب سیفی اور امیر نہٹوری شامل ہیں۔ ان کے علاوہ چھ کتابوں پر مصنف کے تبصرے بھی

اس کتاب کا حصہ ہیں۔ کتاب کے مصنف ایس ٹی رضا نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ کتاب دراصل وقتاً فوقتاً لکھے گئے میرے مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ہے جنھیں افادۂ عام کے لیے کتابی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر معروف شاعر طالب رامپوری، سندھی اخبار سمواد کے چیف ایڈیٹر شری کانت بھاٹیا، صدائے انصاری کے انصاری اطہر حسین اور مبشر عالم وغیرہ موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 جون 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دهلی

ادب کی تفہیم کے زاویے: نظریہ، نقاد اور قاری

نئی دهلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی کے زیر اہتمام دو اور تین جولائی کو دو روزہ آن لائن سمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ملک اور بیرون ملک سے متعدد مقالہ نگاروں نے شرکت کی۔ اس سمینار کے لیے 'ادب کی تفہیم کے زاویے: نظریہ، نقاد اور قاری' بطور موضوع منتخب کیا گیا۔ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے چیئرمین پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے استقبالیہ کلمات میں اس موضوع کی اہمیت و معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے موضوعات پر تسلسل کے ساتھ مباحث ہمارے یہاں موجود ہیں، لیکن اکیسویں صدی کے اس عہد میں جہاں سائنس اور ٹکنالوجی کا بول بالا ہے، جہاں انٹرنیٹ کی دنیا میں معلومات کا انبار ہے اور مجموعی طور پر اس عہد نے انسان کو مادیت کے حصار میں اس طرح گرفتار کر رکھا ہے کہ ہر چیز میں سود و زیاں کا پیمانہ ہی ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ ایسے میں یہ سوال بھی اہم ہو جاتا ہے کہ اس اکیسویں صدی میں کیا ادب کی کوئی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ لیکن اس سوال سے پہلے یہ بھی غور کرنا ہے کہ اس عہد میں ادب کی تفہیم کی کیا کیا صورتیں ہیں کیونکہ آج دنیا کو سمجھنے، سمجھانے کا نظریہ بدل گیا ہے، زندگی کو دیکھنے کے زاویے تبدیل ہو چکے ہیں تو لامحالہ ادب کی تفہیم کے زاویے اور نظریات میں بھی تبدیلیاں آئی ہوں گی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کلیدی خطبہ دیا۔ انھوں نے تفہیم ادب کے مختلف زاویوں پر گفتگو کی اور اپنا گراں قدر خطبہ پیش کیا اور اس موضوع کے ضمن میں شعر و ادب کے مختلف حوالوں پر روشنی ڈالی اور گلوبل ادب کی وسعت اور تفہیم کے حوالے سے کئی نکات پیش کیے۔ افتتاحی تقریب میں ڈاکٹر محمد افضال بٹ، ڈاکٹر صدف نقوی اور ڈاکٹر شگفتہ فردوس نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فیجی جزیرہ سے شہزاد علی سیکریٹری انجمن اساتذۂ اردو فیجی، فوزمین ایجوکیشن آفیسر منسٹری آف ایجوکیشن فیجی، حیا سمیل کے علاوہ فیجی کے اردو اساتذہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

اس سمینار میں کل چار سیشن کے تحت ہند و پاک کی مختلف یونیورسٹیوں سے تقریباً چالیس مقالے پیش کیے گئے اور اصناف ادب کے متعدد پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا۔ پہلے سیشن میں پروفیسر شہاب عنایت ملک جموں اور نصر ملک ڈنمارک، دوسرے میں ڈاکٹر امتیاز وحید کلکتہ اور ڈاکٹر مشتاق حیدر کشمیر، تیسرے میں ڈاکٹر شہناز قادری جموں اور ڈاکٹر احمد کفیل گیا بہار اور چوتھے سیشن میں ڈاکٹر سلیم محی الدین اورنگ آباد، ڈاکٹر عبدالحی، سی ایم کالج دربھنگہ اور ڈاکٹر شیو پرکاش جے این یو نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ جب کہ ڈاکٹر محمد رکن الدین، ڈاکٹر محمد جلیل اقبال خاکی، ڈاکٹر امتیاز رومی اور ڈاکٹر محمد شہباز رضا نے نظامت کی۔ واضح رہے کہ حاضرین کو بھی اپنے تاثرات اور خیالات کے اظہار کا موقع دیا گیا اور اسے سوشل میڈیا پر براہ راست نشر کیا گیا۔

روز نامہ 'میرا وطن' 4 جولائی 2022

ملاقات ایک فنکار سے

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پروگرام 'ملاقات ایک فنکار سے' میں معروف اداکارہ اور پروگرام ڈائرکٹر صبا زیدی عابدی نے ڈراما اور اسٹیج سے متعلق فنی مسائل اور تجربات پر نہایت پرمغز گفتگو کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے صبا زیدی عابدی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور نیشنل اسکول آف ڈرامہ سے گریجویشن کے بعد نیشنل براڈ کاسٹ دور درشن میں بطور ڈراما ڈائرکٹر اور پروڈیوسر اپنے کریئر کا آغاز کیا۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے سبب آپ نے بہت جلدی اپنی شناخت قائم کر لی۔ بہت سارے نیشنل اور انٹرنیشنل انعامات آپ کو عمدہ کارکردگی کے اعتراف میں اب تک پیش کیے جا چکے ہیں۔ ڈراما اور فلم کی دنیا میں آپ نے ایک منفرد شناخت قائم کی ہے۔ مہمان مقرر صبا زیدی عابدی نے کہا کہ مرے کیریئر کا آغاز ایسے وقت میں ہوا جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ساتھ اسٹیج پر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے استاد نے مجھ سے کہا تھا کہ اسٹیج تو دل بہلانے کے لیے کیا جاتا ہے اس کو کیریئر بنانا مناسب نہیں ہے تم کو تعلیم پر دھیان دینا چاہیے، لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے اسی سمت میں کام کرنا ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ جب میں نے نیشنل اسکول آف ڈراما میں داخلہ لیا تو ابراہیم القاضی ڈائرکٹر تھے وہ بہت فعال شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ہماری بنیادی تربیت اتنی اچھی کی کہ وہ ہمیشہ میرے کام آئی۔ اس پروگرام کی نظامت دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر محمد کاظم نے کی انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی ثقافتی شاخ 'ہم سب ڈراما گروپ' ایک فعال ادارہ ہے۔ اس شاخ کے زیر انتظام بہت سارے ڈرامے اسٹیج کیے جا چکے ہیں، لیکن یہ پروگرام 'ملاقات ایک فنکار سے' اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کے ذریعے ہم ایسی شخصیات سے ہم کلام ہوتے ہیں جن کو دیکھنا ہی خود میں ایک خوشگوار احساس پیدا کرتا ہے۔ صبا زیدی عابدی صاحبہ نے ہندی سنیما کے بہت ممتاز ڈائرکٹرس اور ایکٹرس کے ساتھ کام کیا ہے۔ پوری دنیا میں ان کے کام اور ان کی شخصیت کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 18 جون 2022

اتر پردیش

عہد حاضر میں اردو ناول: تفہیم و تعبیر اور اردو ناول کی قرأت

علی گڑھ: البرکات اکیڈمی، علی گڑھ میں دو روزہ کل ہند سمینار کا انعقاد 'عہد حاضر میں اردو ناول میں تفہیم و تعبیر اور اردو ناول کی قرأت' پر اتر پردیش اردو اکادمی اور اسلوب آرگنائزیشن کے زیر اہتمام کیا گیا۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت مشہور ناقد شافع قدوائی نے کی اور بطور مہمان خصوصی افسانہ نگار سید محمد اشرف نے شرکت کی۔ پروفیسر شافع قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو ناول کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ عہد کے تمام اہم ناولوں کا معروضی جائزہ پیش کیا اور گزشتہ چار یا پانچ دہائیوں میں لکھے جانے والے ناولوں کے موضوعات میں تازگی و تنوع پر گفتگو کرتے ہوئے ناول

'عہد حاضر میں اردو ناول: تفہیم و تعبیر اور اردو ناول کی قرأت' کے موضوع پر منعقدہ سمینار میں کتاب کے اجرا کا منظر

کے روشن اور تابناک مستقبل کی طرف بھی معنی خیز اشارے کیے۔ مہمان خصوصی سید محمد اشرف نے اپنی تقریر میں کہا کہ زبان کے ذریعے ناول نگار ایک ایسی نئی حقیقت پیش کرتا ہے جو سچ اور جھوٹ سے ماورا ہوتے ہوئے بھی قاری کے ذہن پر نہ صرف اثر کرتی ہے بلکہ اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے، اور کبھی کبھی صرف ایک کیفیت باقی رہ جاتی ہے جو اس ناول کے حوالے سے زندگی بھر ہمارے حافظے کا حصہ بنی رہتی ہے۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں اسلوب کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شعیب نظام نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ تجزیے کے لیے اسلوب آرگنائزیشن نے ہندوستان بھر سے نوجوان نسل کے ابھرتے ہوئے قلمکاروں کو بہت سوچ سمجھ کر مدعو کیا ہے تاکہ وہ ہمارے عہد کے بڑے فکشن نگاروں سے مل کر ان سے ان کے فن پر سوالات کرسکیں اور ہمارے فکشن نگار بھی یہ اندازہ لگا سکیں کہ نئی نسل کے لکھنے والے فن کو کس زاویے سے دیکھتے ہیں اور اپنی تحریروں میں کس طرح پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسمی انداز سے گریز کرتے ہوئے کلیدی خطبہ کے لیے تفسیر حسین کو مدعو کیا گیا تھا۔ دوسرے اجلاس میں صدارتی خطبہ مشہور افسانہ نگار پروفیسر طارق چھتاری نے پیش کیا۔ ناول کی قرأت پروفیسر ثروت خان، صادقہ نواب سحر، شاہد اختر اور غضنفر نے بہت خوبصورت انداز میں کی۔ ان ناولوں کے تجزیے ڈاکٹر محمد اختر، آفتاب احمد نجمی، ڈاکٹر مہ جبیں خان اور ترنم جبیں نے پیش کیے۔ نظامت سفینہ بیگم نے کی۔ سمینار کا پہلا دن نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ سمینار کے دوسرے دن محسن خاں، رحمان عباس، شبیر احمد، یعقوب یاور، سید محمد اشرف، رینو بہل اور رضوان الحق نے مختلف اجلاس میں اپنے ناولوں کی قرأت ایسے دلنشیں انداز میں کی کہ سمینار ہال میں موجود تمام سامعین کے چہروں پر لطف و انبساط کی کیفیت واضح طور پر محسوس کی گئی۔ ان ناولوں پر کامیاب تجزیے ڈاکٹر محمد اختر، ڈاکٹر نور فاطمہ، ڈاکٹر شیبا حیدر، ڈاکٹر شہناز یوسف، ڈاکٹر شہناز رحمان، ڈاکٹر دائم انصاری، محمد حنیف خان، خوشتر زریں ملک، گلشن عزیز، حمیرا عالیہ، سفینہ بیگم، مقصود دانش، وسیم احمد فدا، استوتی اگروال، حامد رضا، احسن ایوبی وغیرہ نے پیش کیے۔ آخری اجلاس میں معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے اپنے ناول 'آخری سواریاں' کے ایک دیہاتی زبان پر مشتمل حصہ پر قرأت کی۔ سمینار میں ثروت خان، شاداب الفت، حمیرا عالیہ، انتخاب حمید، رضوان الحق، شاہد اختر، رینو بہل، غضنفر کی کتابوں اور رسالہ انتساب کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ جلسے کے اختتام پر سمینار کے منتظم ڈاکٹر شعیب نظام اور محسن خاں نے تمام مہمانوں اور بالخصوص نوجوان نسل کا شکریہ ادا کیا اور تحفہ کے طور پر معدوم ہوتی ہوئی فنکاری کیلی گرافی کے بے حد عمدہ نمونے جو بچوں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیے تھے نذر کیے گئے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 جون 2022

اردو زبان وادب میں لکھنوی تہذیب کی عکاسی

میرٹھ: عصر حاضر میں بہت سے حضرات ایسے ہیں جو غیر مسلم ہیں اور ان میں سکھ اور عیسائی حضرات بھی شامل ہیں۔ لکھنوی تہذیب کی عکاسی ان کے کلام کے عمدہ نمونے ہیں۔ لکھنؤ میں ملنے اور ملنے کے بعد بچھڑنے کی جو

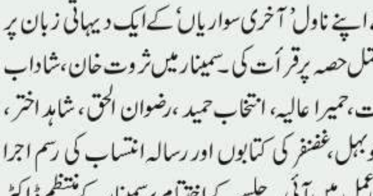

روایت ہے وہ بڑی ہی دلچسپ ہے اور دل پر اثر کرتی ہے۔ یہ الفاظ تھے پروفیسر عباس رضا نیر کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے مشترکہ اہتمام میں منعقد آن لائن ہفتہ واری ادب نما کا پروگرام 'اردو زبان و ادب میں لکھنوی تہذیب کی عکاسی' موضوع پر خصوصی مقرر کی حیثیت سے ادا کر رہے تھے۔ صدارت کے فرائض معروف ادیب و سفر نامہ نگار عارف نقوی (جرمنی) نے ادا کیے۔ مقررین کے بطور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اور 'آگ' کے مدیر ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی شریک ہوئے۔ تعارفی کلمات صدر شعبۂ اردو، پروفیسر اسلم جمشید پوری، استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی، نظامت آیوسا کی صدر اور کھن کھن جی پی جی کالج کی صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر ریشما پروین اور شکریے کی رسم ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دی۔

اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے کہا کہ رتن ناتھ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھنوی تہذیب و معاشرے کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ لکھنوی لڑکے، لڑکیوں اور ان کی شادیوں کی رسومات کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی سوسائٹی کو جس طرح پیش کیا ہے وہ لکھنوی تہذیب کا ثبوت ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے کئی ناولوں میں لکھنوی تہذیب کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ انیس اشفاق کے دو ناول 'دکھیارے' اور 'خواب سرا' میں لکھنوی تہذیب کو سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی نے کہا کہ 'فسانۂ آزاد' میں لکھنوی تہذیب کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ لکھنؤ کا تمام عکس آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ اودھ پنچ ہو، اردو اخبار ہو، آگ ہو، انقلاب ہو یا دیگر اخبارات ہوں تمام کے تمام لکھنوی تہذیب کو پیش کر رہے ہیں۔ ہم ایسی خبر کو ہلکے اشارے سے پیش کرتے ہیں جو سماج میں برائی کو پیدا کرے۔

اپنی صدارتی تقریر میں عارف نقوی نے کہا کہ ہم جب کبھی ایسے تانگے والے سے بھی بات کرتے ہیں تو وہ ہمیں شاعری میں جواب دیتا ہے۔ اس لیے ہمیں عام لوگوں کے خیالات و جذبات کو بھی ذہن میں رکھ کر لکھنوی تہذیب کو تلاش کرنا چاہیے۔

پروگرام میں ڈاکٹر ولا جمال العسیلی، مصر، ڈاکٹر ریاض توحیدی، کشمیر، مہہ جبیں آصف، اسلام آباد، ڈاکٹر ہما مسعود، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شبستاں پروین، مقصود جالب، حنا آفرین، پاکستان، زرینہ بیگم، شبانہ نسرین، دہلی، ڈاکٹر نگار عظیم، دہلی، سید احمد قادری، ناہید خاتون، نیاز جیراج پوری، ظہیر انور، سیدہ مریم الہی، فرح ناز، صدیقی، محمد شمشاد، فیضان، ظفر، وغیرہ آن لائن جڑے رہے۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 23 جون 2022

فراق گورکھپوری: فن اور شخصیت

بھرائچ: فراق گورکھپوری اپنے ہمعصر شاعروں میں سب سے قد آور شاعر تھے۔ فراق کی شاعری میں ہندوستان کی عظیم تہذیبی روح جلوہ گر تھی، ان کی شاعری میں وہ تمدن تھا جو سب کو اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اسی لیے انھیں عظیم دانشور کے طور پر دیکھا، سمجھا اور پڑھا گیا۔

انھوں نے ہمیشہ اردو زبان کے لیے بہت کچھ کہا، لکھا پڑھا، مگر یہ بھی سچائی ہے کہ ان کے اشعار ہر ایک کے دل میں بڑی خوبصورت بزم خیال سجاتے ہیں جہاں صرف پیار اور محبت کے چراغ جلتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مہمان خصوصی دانش آزاد انصاری (وزیر اقلیتی امور وقف اور حج اتر پردیش) نے مسعودیہ غریب نواز سوسائٹی کے زیر اہتمام اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش کے مالی اشتراک سے کسان پی جی کالج بہرائچ میں منعقد سمینار 'فراق گورکھپوری: فن اور شخصیت' میں کیا۔ یک روزہ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے نور باسط علی (ریاستی صدر بھارتیہ جنتا پارٹی اقلیتی مورچہ اتر پردیش) نے کہا کہ فراق صدی کی آواز تھے۔ ایک ایسی آواز جس میں اس صدی کی تاریخ کا درد و کرب، ابتہاج و مسرت، لاابالی پن و وارفتگی، جدوجہد و کشمکش، تمنا و تڑپ، عیش و نشاط، محرومی اور گھٹن، روایت و تجربہ سب شامل تھے۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کی، پروگرام کے کنوینر اسرار احمد نے افتتاحی کلمات ادا کرنے کے بعد مہمانوں کا استقبال کیا اور اپنی سوسائٹی کے اغراض و مقاصد سے مہمانوں کو متعارف کرایا۔ پروگرام کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر محمد عثمان نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا اور مہمان کا استقبال گلدستہ پیش کر کے کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمانان کے بدست ڈاکٹر عبدالقدوس (ایسوسی ایٹ پروفیسر وانچارج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس) ڈاکٹر عمار نگرامی، اور ڈاکٹر نسیم احمد کو اعزاز و ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان اعزازی اطہر صغیر تورج زیدی (چیئر مین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی) نے کہا کہ فراق جینئس انسان تھے، وہ جمالیات کی زبردست حس رکھتے تھے۔ انھوں نے ملک کی مٹی سے اٹھنے والی تہذیبی خوشبو کو اپنی شاعری میں سمولیا تھا اور اسی لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بھلے ہی ان کے نام کے آگے گورکھپوری لگا ہو اور ان کی شاعری اردو زبان کے ذریعے ہوتی رہی ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ بڑا شاعر رنگ، نسل، زبان، قوم اور جغرافیائی دیواروں کے حصار میں محصور نہیں کیا جاسکتا، وہ انسانی عظمت کا گیت گاتا ہے اور اس لیے وہ ساری انسانیت کا اثاثہ ہوتا ہے، فراق کی شاعری فکر و فن اور موضوع و اسلوب کے اعتبار سے ایک نئے اور منفرد آہنگ کی حامل ہے۔ سمینار کی صدارت کرتے ہوئے میجر ڈاکٹر شیو پرتاپ سنگھ (منیجر کسان پی جی کالج، بہرائچ) نے کہا کہ فراق نے انگریزی ادب کے باصلاحیت استاد ہونے کے باوجود اردو ادب میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ ان کو اردو زبان سے بے حد پیار تھا انھوں نے اردو زبان کو نہ صرف اپنایا بلکہ والہانہ عقیدت کا ثبوت دیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 جون 2022

اکبرالہ آبادی پر سمپوزیم

الہ آباد: ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کی جانب سے اکبرالہ آبادی کی 175 ویں یوم پیدائش کے موقع پر الہ آباد میوزیم ہال میں سمینار، مشاعرہ اور رسم اجرا کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ پروگرام تین حصوں پر مشتمل تھا۔ سب سے پہلے ممتاز نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسر عطیہ نشاط کی وفات پر 2 منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ افتتاحی اجلاس میں خیر مقدمی کلمات انوپم تیواری (ایڈیٹر: ہندی ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی) نے پیش کیے، انھوں نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی ہمیشہ بزرگ شاعروں اور ادیبوں کو نئی نسل سے روبرو کرانے اور یاد کرنے کا کام کرتی رہی ہے، ہمارے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ اکبرالہ آبادی کو انھیں کے شہر میں یاد کرنے کے لیے ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر شبنم حمید (صدر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی) نے کرتے ہوئے کہا کہ ''اکبرالہ آبادی کی شاعری زمانی، مکانی اور معنوی تہہ داری تینوں ہی اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اکبرالہ آبادی پر اس طرح کا پروگرام ہونا واقعی قابل مبارکباد اور تاریخی ہے۔'' اس اجلاس میں مہمان خصوصی پروفیسر ہریمب چترویدی (سابق صدر شعبہ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی) رہے۔ انھوں نے اکبر الہ آبادی کی تاریخی اور عصری معنویت پر روشنی ڈالی، جب کہ کلیدی خطبہ پروفیسر سید شاہ حسین احمد (پٹنہ) نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکبرالہ آبادی کو روحانی قدریں عزیز تھیں اور مشرقیت کو مرعوبیت اور مغلوبیت سے بچانے کے لیے انھوں نے مغربی تہذیب و تعلیم کی مخالفت کی۔'' اس اجلاس میں ڈاکٹر اجے مالوی (رکن جنرل کونسل، ساہتیہ اکادمی) کی کتاب 'غبار فکر' کا اجرا عمل میں آیا، جس کا تعارف ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے پیش کرتے ہوئے کہا ''اجے مالوی شہرت یافتہ شاعر، ادیب، محقق، نقاد اور دیگر تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور قارئین سے داد وتحسین وصول کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔'' اجرا کے بعد پہلا تکنیکی اجلاس ہوا جس کی صدارت پروفیسر نسیم احمد (سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی) نے کی، اس اجلاس میں کل چھ مقالے پڑھے گئے جن میں حقانی القاسمی، روی نندن سنگھ، جگدمبا دوبے، منصور عالم، اسرار گاندھی اور ڈاکٹر صالحہ صدیقی کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر حقانی القاسمی نے 'اکبرالہ آبادی کے فکری و ذہنی تضادات اور لسانی اجتہادات' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف، اکبر کے احتجاجی بیانیے کو صحیح سیاق وسباق میں سمجھنے اور کلام اکبر کی تفہیم نو پر زور دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اکبر اپنی لفظیات اور لسانی تشکیلات میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ ہمارے اجتماعی حافظے میں محفوظ ہیں اور ان کے بہت سے اشعار آج بھی ذہنوں میں زندہ ہیں۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر نسیم احمد نے اس پروگرام کو تاریخی بتایا اور اکبرالہ آبادی کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالی۔ ظہرانے کے بعد آخری اجلاس شعری نشست کا آغاز کیا گیا جس کی صدارت ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ادیب وشاعر چندر بھان خیال نے کی۔ اس شعری نشست میں شری رام مشرا طلب جونپوری، دانش الہ آبادی، مخدوم پھول پوری، سشانت چٹوپادھیائے، اجے مالوی نے اپنے کلام پیش کیے۔ چندر بھان خیال

صاحب نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی کی شخصیت اورفن پر روشنی ڈالی اور اپنے کلام سے محظوظ کیا۔اسی کے ساتھ یہ پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا،شکریہ کی رسم اس پروگرام کے روح رواں اور کنوینر اجے مالوی نے ادا کی اور پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔سمپوزیم میں مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی شہر کی معزز اور مقتدر شخصیات نے شرکت کی۔پروگرام بہت کامیاب رہا۔

روزنامہ'اودھ نامہ' لکھنؤ، 2 جولائی 2022

بہار

حسن نعیم اورنئی غزل

دربھنگہ: حسن نعیم نئی غزل میں ایک توانا لب و لہجے کے شاعر تھے۔زندگی اور اس کے مصائب و آلام سے نبردآزمائی کی طاقت حسن نعیم کی غزلوں کا طرہ امتیاز

ہے۔یہ باتیں سنٹرل یونیورسٹی آف ساؤتھ بہار،گیا کے مرکز برائے ہندوستانی زبان میں اردو کے استاد اور معروف ناقد اور شاعر ڈاکٹر کفیل احمد نسیم نے سی ایم کالج دربھنگہ کے شعبہ اردو کی جانب سے منعقدہ ایک آن لائن لکچر میں کہیں۔انھوں نے حسن نعیم کے مختصر حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری اورغزلوں کی انفرادیت پر پرمغز گفتگو کی اور کہا کہ 1950 سے 1960 کے درمیان نئی غزل کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔خلیل الرحمان اعظمی اور ناصر کاظمی جیسی شہرت حسن نعیم کے حصے میں نہیں آئی لیکن حسن نعیم کی غزلوں کا تیوران شعرا کے مقابلے زیادہ توانا اور دیرپا ہے۔کسی شاعر کی مقبولیت میں بہت سارے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن کی تفصیل بہت طویل ہے لیکن مختصراً یہاں یہ عرض کردوں کہ آج کی تیز رفتار زندگی میں حسن نعیم کی غزلیں دور تک ہمارا ساتھ دیتی ہیں۔فکر کی سبک خرامی،روایات کا پاس و لحاظ،سادگی،تہہ داری، بامعنی بنیاد کے ساتھ ان کی غزلوں میں جوتوانا کردار ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ صحرا میں بھی پھول کھلانے اور اسے سرسبز وشاداب بنانے کی سکت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری شکست سے دوچار نہیں ہونے دیتی اور ہمیں نیا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

اس خصوصی لکچر کے آغاز میں سی ایم کالج کے شعبہ اردو میں استاد عبدالحی نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ حسن نعیم دبستان عظیم آباد کے جدید شاعروں میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری زندگی کے تئیں مثبت پیغام دیتی ہے اور ان کی غزلیں بہار کی مختلف یونیورسٹیوں میں نصاب کا حصہ ہیں اس لیے آج کا یہ لکچر خاص طور سے طلبا کے لیے منعقد کیا گیا ہے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکیں۔اس خصوصی لکچر میں سی ایم کالج کے ایم اے وبی اے(اردو) کے طلبا وطالبات کے ساتھ ساتھ شعبے سے وابستہ ڈاکٹر نفاست کمالی،ملت کالج کے اساتذہ ڈاکٹر عبدالرافع اور ڈاکٹر شاہنواز عالم،شعبہ اردو للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر مطیع الرحمٰن و ڈاکٹر وصی احمد شمشاد،سی ایم بی کالج گھوگھرڈیہا کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عبدالودود قاسمی،ڈاکٹر منصور خوشتر، شعبہ اردو،نتیشور کالج مظفر پور کے استاد ڈاکٹر کامران غنی صبا، معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر ریحان احمد قادری،بھیونڈی مہاراشٹر سے تشریف لائے معروف محقق، ناقد اور شاعر جناب خلیق الزماں نصرت و دیگر ادب نواز شائقین بھی اس آن لائن لکچر سے آخر تک جڑے رہے۔لکچر کے بعد طلبا و دیگر سامعین نے سوالات بھی کیے جس کے ڈاکٹر کفیل احمد نسیم نے تشفی بخش جوابات دیے۔عبدالحی کے اظہار تشکر پر یہ لکچر اختتام کو پہنچا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر عبدالحی،شعبۂ اردو،سی ایم کالج،دربھنگہ، 7 جون 2022

رمزعظیم آبادی ووہاب اشرفی یادگاری تقریبات

پٹنہ: پروفیسر وہاب اشرفی کا شمار اردو کے مقتدر وممتاز اصحاب قلم میں ہوتا ہے۔انھوں نے ایک منفرد ادیب، نقاد،محقق،مورخ،افسانہ نگار کی حیثیت سے عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی ہے۔وہیں رمزعظیم آبادی نے اپنی عسرت اور غربت بھری زندگی میں اپنی خداداد اور وہبی صلاحیتوں کے سبب شاعری کی دنیا میں قومی سطح پر اپنی پہچان بنائی اور ریاست بہار کا نام بلند کیا۔رمزنہ پروفیسر تھے اور نہ ہی کہیں سے پی ایچ ڈی کی تھی بلکہ معمولی گھریلو تعلیم کے باوجود وہ اپنی کاوش کے سبب شہرت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا تھا۔زبان و بیان پر اتنی مہارت اور قدرت تھی کہ ان کی شاعری دانشورانہ فکر وفن کا امتزاج بن گئی۔مذکورہ باتوں کا اظہار اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیراہتمام بہار اسٹیٹ آرکائیو ڈائرکٹوریٹ،بیلی روڈ،پٹنہ کے کانفرنس ہال میں منعقد رمزعظیم آبادی اور وہاب اشرفی یادگاری تقریبات میں دانشوران نے کہیں۔پروفیسر آفاقی نے کہا کہ وہاب اشرفی اوررمزعظیم آبادی جیسی شخصیت سے ہی دبستان عظیم آباد کی شناخت قائم ہے۔تقریب کا آغاز شمع روشن کرکے ہوا۔پہلے سیشن میں رمزعظیم آبادی یادگاری تقریب منعقد ہوئی۔استقبالیہ وتعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے کہا کہ اس طرح کی تقاریب میں جہاں اپنے اسلاف کوخراج عقیدت پیش کرتے ہیں وہیں ہم لوگ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی خدمات اور کارنامے لائق صدستائش ہیں۔اردو زبان و ادب کے فروغ کے تئیں ان لوگوں کی جانفشانیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔انھیں تقاریب کی بدولت نئی نسل اسلاف کے کارناموں سے بہرہ ور اور روشناس ہوتی ہے۔دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر عبدالصمد نے کہا کہ وہاب اشرفی کی شخصیت نابغہ روزگار تھی۔وہ اردو زبان وادب کے لیے پیدا ہوئے اوراسی زبان کی خدمت کرتے ہوئے رخصت ہوگئے۔انھوں نے فروغ اردو کے تئیں اردو ڈائرکٹوریٹ اورڈائرکٹر کی سرگرمیوں اورکاوشوں کی بھرپور ستائش کی۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 29 جون 2022

پنجاب

ترجمہ کی اہمیت ومعنویت

پانی پت/ چنڈی گڑھ: پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیراہتمام 'ترجمہ کی اہمیت ومعنویت' کے موضوع پر منعقد تقریب کوخطاب کرتے ہوئے کشمیر سے آئے پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کہ ترجمہ مختلف علوم و فنون اور تہذیبوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے، جس کے ذریعے قاری ایک نئی دنیا سے روشناس ہوتا ہے۔روسی زبان کے شعبہ کے پروفیسر پنکج مالویہ نے کہا کہ ترجمہ کرنے والے کو متعلقہ موضوع پر بھی کامل دست گاہ ہونی چاہیے تاکہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ کسی درجہ میں مفہوم کی بھی سلیس زبان میں ترجمانی ہوجائے۔اس بات کا بخوبی علم ہونا چاہیے کہ کب اور کہاں کس لفظ کا استعمال کرنا ہے۔ڈاکٹر عباس نے کہا کہ ایک اچھا ترجمہ علاقائی ادب کو عالمی منظرنامہ پر لاسکتا ہے،جس کی حالیہ مثال ہندی کا ناول'ریت سمادھی' ہے،جس کے انگریزی ترجمہ کو بکر پرائز سے نوازا گیا ہے۔آخر میں ڈاکٹر ذوالفقار علی

نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ خصوصی شرکا میں پروفیسر ریحانہ پروین، شمس تبریز، ڈاکٹر زریں فاطمہ، ڈاکٹر للّی سورن، پروفیسر کملیش موہن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جون 2022

تلنگانہ

اردو یونیورسٹی میں تحقیقی طریقۂ کار پر ورکشاپ

حیدرآباد: ریسرچ اسکالرس کو اپنی تحقیق پر مکمل توجہ دینی چاہیے۔ آپ کو یہ سیکھنا ہے کہ تحقیق کیسے کی جائے، دلیل پیش کرنے اور دلیل پر قائل کرنے کا کیا طریقہ ہے، آپ کو طریقۂ کار پر خصوصی توجہ دینی پڑتی ہے۔ آپ کا محض ایک صفحہ بھی انعام کا حقدار ہوگا اگر اسے محنت، جستجو اور ماہرانہ انداز میں لکھیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے آج شعبۂ سماجیات کے ایک ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں کیا۔ ورکشاپ کا 13 جولائی کو آغاز ہوا تھا۔ پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ تحقیقی طریقۂ کار کو انڈر گریجویشن کی سطح پر پڑھایا جانا چاہیے۔ یہ قومی تعلیمی پالیسی کے تحت ایک قدم ہوگا۔ بہت جلد ہم 4 سالہ انڈر گریجویٹ پروگرام متعارف کروا رہے ہیں جہاں چوتھے سال میں تحقیقی طریقۂ کار نصاب کا ایک حصہ ہوگا۔ طلبہ اور ریسرچ اسکالرز جو بھی تحقیقی کام کر رہے ہیں اس کی نشر و اشاعت پر توجہ دیں اسے جمع کرانے سے پہلے شائع کریں۔ پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ تحقیقی طریقۂ کار ایک بہت وسیع موضوع لیکن تحقیق کا صرف ایک پہلو ہے۔ ابتدا میں پروفیسر پی ایچ محمد، صدر شعبۂ سماجیات، مانو نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ورکشاپ کا مقصد انسانی تغیرات کا حل تلاش کرنا ہے۔ ڈاکٹر کے ایمن ضیاء الدین، کوآرڈینیٹر ورکشاپ نے تحقیقی طریقۂ کار کی تفصیلات فراہم کیں۔ انھوں نے اس کے فوائد کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اقلیتوں اور اخراج شدہ برادریوں پر تحقیقی کام کرنا تمام طلبہ اور محققین کے لیے ہمیشہ سے ایک چیلنج رہا ہے۔ ڈاکٹر سعید میو، اسسٹنٹ پروفیسر نے شکریہ ادا کیا۔ اسامہ اکرم، ایم اے سوشیالوجی نے پروگرام کی کارروائی چلائی۔ شرکا نے ورکشاپ کے متعلق اپنے خیالات، تجربات اور کچھ تجاویز پیش کیں۔ اختتامی سیشن کے مقرر پروفیسر ناگاراجو گنڈیمیڈا، شعبہ سوشیالوجی، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے 'نمونے کی تفہیم' کے موضوع پر آن لائن گفتگو کی۔ 5 روزہ ورکشاپ میں پروفیسر شرمسٹھا بھٹاچارجی، راجیو گاندھی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یوتھ ڈیولپمنٹ، حکومت ہند، پروفیسر محمد شاہد رضا، صدر شعبۂ سوشل ورک، مانو، پروفیسر سنگھمترا ایس آچاریہ، جے این یو، پروفیسر زکریا صدیقی، گلاٹی انسٹی ٹیوٹ آف فائنانس اینڈ ٹیکزیشن، ترواننت پورم، ڈاکٹر سروجکمار ڈھیل، لکھنؤ یونیورسٹی نے مختلف سیشنس سے آن لائن/آفلائن خطاب کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 جون 2022

اردو صحافیوں کے لیے ورکشاپ

حیدرآباد: اردو صحافت کے دوسو سال کی تکمیل کی خوشی میں تشکیل تلنگانہ کے بعد پہلی مرتبہ تلنگانہ میڈیا اکادمی کی جانب سے اردو صحافیوں کے لیے دو روزہ تربیتی ورکشاپ کا اردو مسکن ہال، حیدرآباد میں شاندار آغاز ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت میڈیا اکادمی کے چیئرمین الم نارائن نے کی جب کہ مہمانان اعزازی کے طور پر رکن قانون ساز کونسل سید امین الحسن جعفری، رکن اسمبلی ممتاز احمد خاں، کارپوریٹرز مصطفیٰ علی مظفر، محمد غوث، تلنگانہ اردو ورکنگ جرنلسٹس کے صدر ماروتی ساغر، تلنگانہ اردو ورکنگ جرنلسٹس فیڈریشن کے صدر ایم اے ماجد، الیکٹرانک میڈیا ایسوسی ایشن کے صدر محمد اسمٰعیل، میڈیا اکادمی سکریٹری وینکٹیشور راؤ، اور دیگر شریک تھے۔ ان کے علاوہ ٹی یو ڈبلیو جے ایف کے جنرل سکریٹری سید غوث محی الدین جوائنٹ سکریٹری حبیب علی الجیلانی، آرگنائزنگ سکریٹری محمد امجد علی، ٹی یو ڈبلیو جے ایف حیدرآباد، ڈسٹرکٹ کنویز اور بی بی این چینل کے نیوز ایڈیٹر و اینکر ایم اے محسن بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ اس ورکشاپ میں میڈیا اکادمی کے چیئرمین الم نارائن نے اردو زبان کی اہمیت و افادیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ یہ ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ دکنی اردو حیدرآباد کا فخر ہے۔ تلنگانہ کے وزیر داخلہ محمد محمود علی نے اردو زبان کے تحفظ و بقا میں اردو صحافیوں کے رول کو غیر معمولی قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافیوں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ محمود علی نے میڈیا اکادمی آف تلنگانہ نے سی این آئی سنٹرل نیوز آف انڈیا کے صحافی محمد قیصر کی گزشتہ دنوں ہوئی موت پر انھیں تعزیت پیش کی اور مرحوم محمد قیصر کی اہلیہ کو اکادمی اور تلنگانہ اردو ورکنگ جرنلسٹ فیڈریشن کی کامیاب نمائندگی پر ایک لاکھ روپے کا چیک، ماہانہ تین ہزار روپے الاؤنس اور ان کے بچوں کو دسویں جماعت پاس ہونے تک ماہانہ ایک ہزار روپے دینے کا اعلان کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 جون 2022

اردو یونیورسٹی میں 'جشن بہاراں'

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سالانہ ثقافتی، ادبی اور کھیل کود کے پروگرام 'جشن بہاراں 2022' کا شاندار پیمانے پر انعقاد عمل میں آیا۔ اوپن ایئر آڈیٹوریم میں منعقد ہونے والا ثقافتی پروگرام 'کلچرل نائٹ' پرجوش تقاریب کے کامیاب اختتام کا واضح ثبوت تھا۔ طلبہ نے اپنے ساتھیوں کے فن کے مظاہرے سے محظوظ ہوتے ہوئے ان کی ستائش کی۔ فنکاروں نے بھی انھیں مایوس نہیں کیا۔ اوپن ایئر تھیٹر میں موسیقی، گلوکاری، رقص، مزاحیہ خاکوں، قوالی، لوک گیت، لوک رقص اور مونو ایکٹ کی یادگار محفل سجائی گئی۔ مانو میں تین سال کے وقفے کے بعد جشن بہاراں کا انعقاد کیا گیا اور طلبہ نے اس میں جوش و خروش سے شرکت کی۔ پروفیسر سید عین الحسن وائس چانسلر نے نہ صرف ساری تقاریب کی سرپرستی کی بلکہ طلبا کی حوصلہ افزائی کے لیے مختلف پروگراموں میں شرکت بھی کی۔ وائس چانسلر نے 'فوڈ فیسٹ' کا بھی معائنہ کیا اور طلبہ کے پکوان کی مہارت اور ذائقے کی ستائش کی۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، پرووائس چانسلر، پروفیسر اشتیاق احمد، رجسٹرار اور پروفیسر علیم اشرف جائسی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی، صدرنشین، ایم ایس یو مشاورتی کمیٹی اور ڈاکٹر محمد یوسف خان، کنوینر کمیٹی نے تقاریب کے کامیاب انعقاد کو یقینی بنانے کے لیے مختلف کوآرڈینیٹر کے ساتھ انتھک محنت کی۔ طلبہ یونین کے محمد مرسلین، صدر محمد ابوحمزہ، نائب صدر، محمد حارث، سکریٹری اور یونین کے دیگر عہدیداران نے بھی انتظامی کمیٹی کے ساتھ تعاون کیا۔ کلچرل نائٹ میں طلبہ نے نغمے رقص، اداکاری، لوک گیت، لوک رقص، قوالی وغیرہ پیش کرتے ہوئے سماں باندھ دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 جون 2-022

اکیسویں صدی کی مہارتیں

حیدرآباد: مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعۂ تعلیم (سی پی ڈی یو ایم ٹی)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام اساتذہ کے لیے 'اکیسویں صدی کی مہارتیں' کے موضوع پر مبنی ایک روزہ تربیتی پروگرام کا کل مانو سی ٹی ای، اورنگ آباد میں انعقاد عمل میں لایا گیا۔ اس پروگرام کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر شیخ کلیم الدین، ڈائرکٹر ریجنل اکیڈمک اتھاریٹی، اورنگ آباد نے کہا کہ اردو ذریعہ تعلیم کے اداروں میں

مختلف نوعیت کے مسائل کا سامنا ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اشتراک سے تحقیقی کام ہونا چاہیے تاکہ حکومت کو ایک مستحکم پالیسی پیش کی جاسکے۔ اس اجلاس میں مہمان اعزازی کے طور پر جناب صوفی لئیق احمد، ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر، اورنگ آباد ضلع پریشد نے شرکت کی۔ اجلاس کی صدارت انچارج پرنسپل، مانو سی ٹی ای اورنگ آباد، سیدہ ہاجرہ نوشین نے کی۔ پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی، ڈائرکٹر نے پروگرام کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ ڈاکٹر محمد اکبر، اسسٹنٹ پروفیسر، مرکز نے کارروائی چلائی۔ پروگرام میں اورنگ آباد اور مراٹھواڑہ کے مختلف اردو میڈیم مدارس سے 30 سے زائد اساتذہ نے شرکت کی۔ پہلے تکنیکی اجلاس میں سیدہ ہاجرہ نوشین، نے 'لائف اسکلس' کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ دوسرے تکنیکی اجلاس میں پروفیسر نوید السحر ، پرنسپل، مراٹھواڑہ کالج آف ایجوکیشن، اورنگ آباد نے 'اکتسابی مہارتوں' اور تیسرے تکنیکی اجلاس میں خواجہ معین الدین نے 'ڈیجیٹل خواندگی' کے حوالے سے گفتگو کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 جون 2022

جموں و کشمیر

لداخ یونیورسٹی میں پروفیسر ابن کنول کا توسیعی خطبہ

کرگل: لداخ یونیورسٹی کے کرگل کیمپس کے شعبۂ اردو میں توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کے سینئر استاد پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ کرگل کی سرزمین اردو زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کرے گی۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یہاں ہر جگہ اردو کے بورڈ اور اردو بولنے والے موجود ہیں۔ کرگل کیمپس کی ڈائرکٹر ڈاکٹر کنیزہ فاطمہ نے پروفیسر ابن کنول کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ابن کنول اردو کے پہلے پروفیسر ہیں جو یہاں تشریف لائے ہیں۔ شعبۂ اردو کا قیام گزشتہ سال ہی عمل میں آیا۔ لیکن خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ بہت زیادہ تعداد میں یہاں طلبہ داخلہ لے رہے ہیں۔ ان شاءاللہ جلد یہ شعبہ ترقی کرے گا اور یہاں کے طلبہ کو باہر نہیں جانا پڑے گا۔ پروفیسر ابن کنول نے اس موقعے پر غیرافسانوی نثر کی اہمیت پر توسیعی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب میں ہر صنف اہمیت رکھتی ہے۔ ادیب اپنے احساسات اور جذبات کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ غیرافسانوی نثر کی تمام اصناف میں حقیقت کا بیان مختلف ہیئتوں میں کیا جاتا ہے۔ ہر صنف کی شناخت اس کے اسلوب اور موضوع سے ہوتی ہے۔ اس موقعے پر مختلف شعبوں کے اساتذہ موجود تھے۔ شعبۂ جغرافیہ کے ڈاکٹر محمد تقی نے کرگل میں اردو زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور پروفیسر ابن کنول کو یونیورسٹی کی جانب سے تحفہ پیش کیا۔ شعبۂ ماحولیات کے ڈاکٹر محمد سلیم اور شعبۂ عربی کے ڈاکٹر محمد فاروق نے پروفیسر ابن کنول کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد رفیع نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے شعبہ کی تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ولایت اللہ نے شکریہ کی رسم ادا کی۔ ڈاکٹر محمد عیسیٰ نے شعبۂ اردو کے نصاب پر گفتگو کی۔ پروگرام میں کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 جون 2022

مدھیہ پردیش

تلاش جوہر: خطاب اور ورکشاپ

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، محکمہ ثقافت کے زیراہتمام 'آزادی کا امرت مہوتسو' کے تحت تلاش جوہر: خطاب اور ورکشاپ کا انعقاد 14 جون 2022 کی صبح 11 بجے سے سوراج بھون، پولیٹکنک چوراہا بھوپال میں کیا گیا۔ ورکشاپ میں خصوصی مقررین فاروق انجم اور نفیسہ سلطانہ انا کے ذریعے تخلیق کاروں کی رہنمائی کی گئی۔ پروگرام کی شروعات میں مقامی ضلع کوآرڈینیٹر سید عابد حسین نے تمام مہمانان اور تخلیق کاروں کا استقبال کیا۔ استقبال کے بعد فی البدیہہ مقابلہ کے حکم صاحبان فاروق انجم اور نفیسہ سلطانہ انا کے ذریعے دو طرحی مصرعے دیے گئے جو درج ذیل تھے: دردمنت کش دوا نہ ہوا اور اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے۔ مندرجہ بالا مصرعوں پر نئے تخلیق کاروں کے ذریعے کہی گئی غزلوں اور پھر ان کی پیش کش کی بنیاد پر حکم صاحبان کے متفقہ فیصلے سے بھوپال کی اپرنا پاتریکر اور ودیشہ کے محمد انصاف کو اول، چندیری کے مشغول مہربانی اور راج گڑھ کے راہل شرما کو دوم اور بھوپال کے مصطفیٰ سیفی کو سوم اعزازات سے نوازا گیا۔ مقررین کے خطاب سے قبل اردو اکادمی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی نے ان کا استقبال کیا اور پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی کے ذریعے ایک بار پھر صوبے کے نئے تخلیق کاروں کو اسٹیج فراہم کرنے کے لیے 'تلاش جوہر' پروگرام کی شروعات کی گئی ہے۔ اس دفعہ اردو اکادمی نے کوشش کی ہے کہ صوبے کے سبھی شہروں، قصبوں اور گاؤں سے تخلیق کاروں کی تلاش کی جائے۔ اس طریق کار کے ذریعے پہلے مرحلے میں ضلع کوآرڈینیٹرس کے ذریعے تقریباً 300 شعری تخلیقات موصول ہوئی تھیں۔ موصول شدہ تخلیقات کے ذریعے تخلیق کاروں کے انتخاب کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کے ذریعے تقریباً 220 نئے تخلیق کاروں کو اگلے مرحلے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اسی سلسلے کے تحت آج بھوپال اور نرمداپورم ڈویژن کے سبھی اضلاع سے منتخب تخلیق کاروں کے ذریعے فی البدیہہ مقابلہ ہورہا ہے۔ اس موقعے پر دیگر ضلع کوآرڈینیٹرس بھی موجود رہے جن میں سنتوش شرما ساگر ودیشہ، صبیحہ صدف راسین اور راہول کمھکار، راج گڑھ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ پرگرام کے آخر میں اکادمی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض رضوان الدین فاروقی نے بحسن وخوبی ادا کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جون 2022

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، محکمہ ثقافت کے زیراہتمام سلسلہ کے تحت 'ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا' موضوع پر خطاب اور شعری نشست کا انعقاد سوراج، بھون، پولیٹیکنک چوراہا بھوپال میں کیا گیا۔ اردو اکادمی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی پروگرام کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی نے اس سلسلے کے تحت ریاست کے سبھی اضلاع میں شعری وادبی نشستیں منعقد کرنے کا خاکہ تیار کیا ہے۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر یعقوب یاور نے اپنے خطاب میں نوجوان شعرا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ادب ایک ایسا دروازہ ہے جس میں سیندھ لگا کر داخل نہیں ہوا جاسکتا بلکہ اس کے لیے کڑی محنت وریاضت درکار ہوتی ہے۔ انھوں نے شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ فن شاعری تمام فنون لطیفہ میں سب سے مقبول ترین فن ہے اس کی یہ خصوصیت ہے کہ لوگ اس کی جانب فوراً متوجہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے شعر کے حوالے سے کہا کہ شعر مادہ ہے شعور کا جو اپنے آپ میں یہ کہہ رہا ہے کہ شعر ایک شعوری کوشش کا نام ہے۔ انھوں نے آگے کہا کہ میری رائے میں تخلیق کار کا ذہنی معیار ناقد کے ذہنی معیار سے ہمیشہ بلند ہوتا ہے اس لیے تخلیق کار کو ناقد کے سامنے جھکنا نہیں چاہیے۔ ڈاکٹر یعقوب یاور کے خطاب کے بعد شعری نشست کا انعقاد ہوا جس کی صدارت بھی انھوں نے ہی فرمائی۔ ڈاکٹر یعقوب یاور، تاج الدین تاج، پروین صبا، اشفاق ندیم، سلطانہ حجاب، سلیم تنہا، اورینا ادا، ساجد انصاری، شعیب علی خان، مبارک شاہین، نسیم

بھوپالی، اندر سنگھ ٹھاکر، ابھیشیک ورما، چترانش کھرے، سوریہ پرکاش اشٹھانا، سنتوش کھروڑکر، موتی ساگر موکھرے، نمرتا شریواستو، اشفاق انصر، سدھیر شرما، شیوم دویدی جیسے شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ شعری نشست کی نظامت کے فرائض شعیب علی خان انجام دیے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر نصرت مہدی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جون 2022

اعزاز و اکرام

ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ برائے ترجمہ

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ

ہوئی جس میں 22 ہندوستانی زبانوں کے ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2021 کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں ترجمہ کے لیے ارجمند آرا کو ان کے بہترین ترجمہ 'بے پناہ شادمانی کی مملکت' کے لیے منتخب کیا گیا جو اروندھتی رائے کی انگریزی ناول 'دی منسٹری آف اٹ موسٹ ہیپینس' کا انگریزی سے اردو ترجمہ ہے۔ ارجمند آرا دہلی یونیورسٹی میں اردو ادب پڑھاتی ہیں جو ترجمہ اور تنقید کے میدان میں بھی کام کرتی ہیں۔ ہندوستان میں اروندھتی رائے، دھرم ویر بھارتی، وبھوتی نارائن رائے، مشیر الحسن، گارگی چکرورتی، ودیا ماتھر کی تخلیقات اور عالمی ادب میں عتیق رحیمی (افغانستان)، حسن بلاسم (عراق)، طیب صالح (سوڈان)، طہر بن جلون (مراکش)، میرال طحاوی (مصر) اور رالف رسل (برطانیہ) کی تخلیقات اردو میں ترجمہ کرچکی ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ رابندرا بھون نئی دہلی میں ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں ایگزیکٹیو بورڈ نے 22 ہندوستانی زبانوں کے لیے ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2021 کو منظوری دی ہے جب کہ میتھلی اور راجستھانی زبانوں کے ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ ساہتیہ اکادمی ہر سال 24 زبانوں کے مترجمین کو ایوارڈ کے لیے منتخب کرتی ہے۔ یہ ایوارڈ پچاس ہزار روپے نقد اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔ اس سال کے ایوارڈ کے لیے یکم جنوری 2015 سے 31 دسمبر 2019 کے دوران شائع تراجم زیرغور آئے۔ یہ انعامات سال رواں کے دوران ساہتیہ اکادمی کی ایک پروقار تقریب میں تقسیم کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جون 2022

عالمی یوم اردو ایوارڈ

نئی دھلی: ممتاز صحافی محفوظ الرحمٰن کی سرپرستی میں 24 سال قبل علامہ محمد اقبال کے یوم پیدائش پر 'عالمی یوم اردو' منائے جانے کا باضابطہ آغاز کیا گیا تھا۔ وہ سلسلہ دراز ہوتے ہوئے مزید موثر ہوتا گیا اور آج سارے عالم میں عام ہوگیا ہے۔ اس موقعے پر مختلف نوعیت کی تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ خاص طور سے یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی جانب سے دہلی میں ایک پروقار تقریب منعقد ہوتی ہے، جس میں نیشنل سمینار و سمپوزیم کے علاوہ چند اہم شخصیات کو اردو ادب، صحافت اور سائنسی ادب کے لیے گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ایوارڈز سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ سال رواں 2022 میں 9 نومبر کو عالمی یوم اردو کے لیے ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق کی صدارت میں ایک اہم میٹنگ دریا گنج میں منعقد ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے عظیم مفکر و شاعر علامہ اقبال کے پیغام کی نشر و اشاعت نہایت گرم جوشی کے ساتھ گزشتہ 24 سال سے بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں اور اب ہم 25 ویں سال یعنی سلور جبلی سال کے طور پر اس سال عالمی یوم اردو منائیں گے۔ انھوں نے تحریک کے اہم معاون معروف صحافی سہیل انجم اور جاوید اختر کا شکریہ ادا کیا اور سلور جبلی سال میں عالمی یوم اردو ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد دی۔ اس موقعے پر عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ ہندوستان میں اردو ہماری شناخت ہے اور ہندوستان کا قومی سرمایہ بھی، اس لیے ہم سب کو اردو کی ترویج وترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ میٹنگ میں ایوارڈ یافتگان کے ناموں کا اعلان اور یادگار مجلّہ 'مولانا عبدالحمید رحمانی: حیات و خدمات' پر فیصلہ ہوا۔ مجلس ادارت میں ڈاکٹر سید احمد خاں، سہیل انجم، جاوید اختر، محمد عارف اقبال اور مولانا محمد رحمانی شامل ہیں۔ ایوارڈ یافتگان میں حکیم فخر عالم (علی گڑھ) کو محمد شفیع علیگ ایورڈ برائے اردو سائنسی ادب، محمد محمود خان (ایڈیٹر 'ہماری طاقت' جے پور) کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، پروفیسر حبیب الرحمٰن نیازی (جے پور) کو علامہ اقبال عالمی یوم اردو ایوارڈ ادب، ڈاکٹر عمیر منظر (لکھنؤ) کو نصیرالدین ہاشمی ایوارڈ برائے اردو تحقیق، مہتاب عالم (دہلی) کو محفوظ الرحمٰن ایوارڈ برائے صحافت، ابھے کمار مشرا (دہلی) کو امداد صابری ایوارڈ برائے صحافت، انتظار نعیم (دہلی) کو حفیظ میرٹھی ایوارڈ برائے شاعری، ڈاکٹر عبیداللہ چودھری (گورکھپوری) کو قاضی محمد عدیل عباسی ایوارڈ برائے ترویج زبان اردو، ڈاکٹر رئیس صدیقی (دہلی) کو مولوی اسمٰعیل میرٹھی ایوارڈ برائے بچوں کا ادب، محترمہ کرشنا شرما دامنی (فرید آباد) کو نور جہاں ثروت ایوارڈ برائے شاعری، اشرف میواتی (نوح) کو مولوی عبدالحق ایوارڈ برائے فروغ اردو، عبدالرشید اعظمی (دہلی) کو مولانا عبدالماجد دریابادی ایوارڈ برائے زبان و ادب اور سید ساجد علی ٹونکی (ٹونک) کو ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی ایوارڈ برائے فروغ اردو ادب شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 جون 2022

شان اودھ اعزاز

لکھنؤ: اردو ہندی اخبار صفت اودھ گروپ لکھنؤ کے زیر اہتمام حضرت گنج واقع پریس کلب میں شہر کے مختلف شعبوں میں سرگرم شخصیات کو شان اودھ اعزاز سے نوازا گیا۔ پروگرام سینئر فوٹو جرنلسٹ عزیز صدیقی کی سرپرستی میں منعقد ہوا جس کی صدارت سینئر صحافی کے وکرم راؤ اور مہمان خصوصی کے طور پر پدم شری ڈاکٹر ودیا بندو موجود تھیں۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کے وکرم راؤ نے صفت اودھ گروپ کے ایڈیٹر کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ صحافت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں پریوارواد نہیں ہے، صحافی دوسروں کے لیے اپنا قلم اٹھاتا ہے اپنے یا اپنوں کے لیے نہیں، انھوں نے کہا کہ ہمیں صحافت کے وقار کو بنائے رکھنا چاہیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر پدم شری ڈاکٹر ودیا بندو نے اپنے خطاب میں کہا کہ صحافت ایک بہت مضبوط ستون ہے اس وقت پورے ملک میں ہم آزادی کا امرت مہوتسو منا رہے ہیں جس میں صحافیوں کا اتنا بڑا رول ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 29 جون 2022

ضیائے حق فاؤنڈیشن کی طرف سے ادبی شخصیات کی پذیرائی

پریاگ راج: الٰہ آباد میوزیم ہال میں ضیائے حق فاؤنڈیشن

کی طرف سے اردو ہندی شعر و ادب کی چار ممتاز شخصیات اردو کے معروف شاعر و ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ چندر بھان خیال، اردو کے ادیب و صحافی حقانی القاسمی، صدر شعبۂ اردو ویرکنور یونیورسٹی آرہ پروفیسر سید شاہ حسین احمد، ممتاز ہندی شاعر ایڈیٹر ہندی ساہتیہ اکادمی نئی دہلی یوا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ محترم انوپم تیواری کی پذیرائی کی گئی۔

اس موقعے پر چندر بھان خیال نے ضیائے حق فاؤنڈیشن کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ ملک بھر کے ایسے شعرا و ادبا کو تلاش کرتی ہے جنھیں دنیائے ادب فراموش کر چکی ہے۔ یہ فاؤنڈیشن ان قلمکاروں کا تعارف کرا کر ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس فاؤنڈیشن کی جانب سے دیے گئے اس اعزاز پر میں ڈاکٹر صالحہ صدیقی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ کارواں یوں ہی رواں دواں رہے۔ حقانی القاسمی صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ضیائے حق فاؤنڈیشن نے ملک کے مختلف علاقوں میں اپنی ادبی و ثقافتی تقریبات اور سرگرمیوں کی وجہ سے بہت جلد اپنی شناخت بنا لی ہے۔ انھوں نے ضیائے حق فاؤنڈیشن کی طرف سے ملنے والے اعزاز پر ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ خلوص و محبت پر مبنی ایوارڈ ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ یہ تنظیم ان تخلیق کاروں کو ایوارڈ سے نوازے گی جنھیں علاقائی، ریاستی یا قومی سطح پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے کہا کہ ضیائے حق فاؤنڈیشن اردو زبان و ادب کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں کارہائے نمایاں انجام دے رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں بھی اس فاؤنڈیشن کا حصہ بن سکا، میں اس اعزاز کے لیے فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہندی کے ممتاز شاعر انوپم تیواری نے کہا کہ میرا تعلق ہندی زبان و ادب سے ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج اکبر الٰہ آبادی کے اس سمپوزیم کے موقع پر میرے بزرگ اور اردو کی اہم شخصیات کے ساتھ مجھے بھی اعزاز دیا گیا۔

اس پروگرام میں مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی معزز شخصیات نے شرکت کی اور اعزاز پانے والی شخصیات کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 5 جولائی 2022

ایک شام شکیل اعجاز کے نام

اکولہ: 22 جون 2022 کو کل ہند بزم ادب و ثقافت اکولہ کے زیر اہتمام عزیز فارم ہاؤس میں ایک شام معروف ظرافت نگار

شکیل اعجاز صاحب کے نام منعقد کیا گیا جس کی صدارت فصیح اللہ نقیب نے کی۔ اس میں معروف انشائیہ و طنز و مزاح نگار شکیل اعجاز اور معروف شاعر نعیم فرحت کو اعزاز عطا کیا گیا۔ اس بزم کے روح رواں رفیق شاد ندوی نے شکیل اعجاز صاحب کو سپاس نامہ پاش کیا جس میں انھیں ظرافت نگار برار کا خطاب دیا گیا۔ جلسے کا دوسرا پہلو یہ رہا کہ شکیل اعجاز نے اپنے چار مضامین جن میں تین خاکے اور ایک رپورتاژ سنائے۔ اس موقعے پر نعیم فراز اور نبیل اشہر نے حمد اور سلام پیش کیا۔ اظہار راشد، اسماعیل عطا، شہزاد انور، طارق فیض، ارشاد حیدر، سید اسد تابش، رفیق شاد ندوی، ضمیر احمد ضمیر، التمش شمس اور فصیح اللہ نقیب نے اپنا کلام پیش کیا۔ جلسے کی نظامت ضمیر احمد ضمیر نے کی اور اظہار تشکر رفیق شاد ندوی نے پیش کیا۔

بحوالہ: ماہنامہ شگوفہ جون 2022

رسم اجرا

مڈل کلاس

بتیا: مقامی سجاد پبلک اردو لائبریری میں قدیم ادبی تنظیم ادبی سنگم کے زیر اہتمام محمد ذاکر کے ناول مڈل کلاس کا اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم سکریٹری ادبی سنگم نے نظامت کرتے ہوئے اپنی تمہیدی تقریر میں کہا کہ محمد ذاکر کا ناول معاصر ناول نگاری کے باب میں ایک اضافہ ہے کیونکہ ناول نگار نے عام روش سے ہٹ کر سماجی اور سیاسی سطح پر قارئین کو

جدوجہد اور احتجاج کا پیغام دیا ہے۔ اس ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے معروف شاعر ڈاکٹر ظفر امام نے کہا کہ محمد ذاکر کا یہ ناول دراصل سماج میں مڈل کلاس کے دگرگوں حالات کا ایک شفاف آئینہ ہے۔ اس موقعے پر ادبی سنگم کے سرپرست اور معروف آرتھوپیڈک سرجن ڈاکٹر جاوید قمر نے کہا کہ اس ناول میں خالص دیسی اور فطری زبان کا استعمال ہوا ہے۔ التقوی ایجوکیشنل گروپ کے چیرمین اور ماہنامہ رہنما کے ایڈیٹر رضوان ریاضی نے ناول نگار سے اپنے پرانے اور گہرے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کا یہ ناول معاشرے کو ایک ایسی سمت میں لے جانے کی ترغیب ہے جہاں سماج کے ہر طبقے کے ساتھ انصاف ہو۔

پریس ریلیز: محمد صمد، بتیا، 10 جون 2022

حیات اطہر بہ زبان اطہر

لکھنؤ: مولانا مرزا محمد اطہر کی خودنوشت سوانح حیات اطہر بہ زبان اطہر کا اجرا دریائے نیکر کے کنارے مقام اقبال ہائیڈ برگ پر ہوا۔ رسم اجرا کناڈا سے آئے ڈاکٹر تقی عابدی اور عالمی شہرت یافتہ شاعر سید اقبال حیدر کے ہاتھوں انجام پائی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اینڈ ریا ایڈل، انچارج کلچرل ڈپارٹمنٹ جرمنی اور مہمان اعزازی کے طور پر وسیم بٹ ممبر سٹی پارلیمنٹ، جرمنی اور پروفیسر اسلم سید ہیولٹ یونیورسٹی جرمنی نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ پروفیسر شاہد عالم، باقر زیدی، طاہرہ رباب، عدنان محسن کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے صدارتی تقریر میں خطیب اکبر مولانا مرزا محمد اطہر کے تعلق سے فرمایا کہ وہ ایک عالمی خطیب ہونے کے ساتھ بہت بڑے عالم اور فارسی داں بھی تھے۔ جب وہ کناڈا آتے تھے تو پوری پوری رات ان سے گفتگو رہتی تھی۔ سید اقبال حیدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ خطیب اکبر سے میرا بہت پرانا اور گہرا رشتہ ہے وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تقریب ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقد ہوئی جس کی صدارت سید اقبال حیدر نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 جون 2022

سہ ماہی 'انتساب عالمی'

سرونج: انتساب پبلی کیشنز اور سد بھاؤنا منچ کی جانب سے معروف شاعر، ادیب و ناقد شعیب نظام کی ادبی خدمات کے اعتراف میں سہ ماہی 'انتساب عالمی' کے خصوصی نمبر کا اجرا اور مشاعرہ سیفی لائبریری میں منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی شروعات میں 'انتساب' کے مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی نے کہا کہ میں نے کبھی 'انتساب' کا کوئی بھی نمبر یا گوشہ شائع کرنے کے لیے سودے بازی نہیں کی۔ میں ان شاعروں، ادیبوں پر زیادہ خصوصی شمارے نکالتا ہوں جو میری پسند کے ہوتے ہیں۔ اقبال مسعود نے کہا کہ سیفی سرونجی نے جو کچھ کارنامے کیے ہیں اور جس طرح سے کم وسائل کے باوجود 'انتساب' کے شمارے شائع کیے وہ واقعی قابل تحسین ہیں۔ مہمان خصوصی شعیب نظام نے کہا کہ میں سیفی سرونجی اور استوتی اگروال کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ انھوں نے یہ خوبصورت اور معیاری شمارہ شائع کر کے مجھے بھی 'انتساب' کی محفل میں شامل کرلیا۔ ڈاکٹر مہتاب عالم نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے شہسواروں کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں 'انتساب' نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ضیا فاروقی نے کہا کہ 'انتساب' نے کئی مشہور شخصیات پر نمبر نکالے ہیں۔ اس کے بعد سیفی سرونجی کی 78 ویں کتاب 'بیرونی ممالک میں اردو نظم' اور سہ ماہی انتساب کے گوشۂ شعیب نظام کا اجرا عمل میں آیا۔ مشاعرے کا آغاز سینئر شاعر ظفر صہبائی کی صدارت میں ہوا۔ مشاعرے میں لکھنؤ، بھوپال، کوروائی ورسرونج کے شاعروں میں ڈاکٹر اعظم، مجاز کوروائی، عارف علی، سراج احمد، عظیم اثر، اقبال منظر، شعیب علی، شعیب فاروق، سلیمان آزر، عظمت دانش، فرحان منظر، آصف سرونجی، اسعد ہاشمی، علیم مضطر، الیاس رضا اور عظیم سرونجی نے شرکت کی۔ نظامت ڈاکٹر ظفر سرونجی نے کی۔ آخر میں سد بھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال نے تمام حاضرین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 جون 2022

وائس چانسلر کے ہاتھوں کتابوں اور رسائل کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے

بانی سرسید احمد خاں کی کتاب 'اسباب بغاوت ہند' 1857 کی بغاوت، جنگ آزادی کی وجوہات کو جس طریقے سے راست انداز میں بیان کرتی ہے شاید ہی کوئی دیگر کتاب کرتی ہو۔ اے ایم یو کے ماڈرن انڈین لینگویجز شعبہ کے ریسرچ اسکالر دیا سنگھ پنجابی نے اس کتاب کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا ہے، جس کا اجرا اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے آج ایک خصوصی تقریب میں کیا۔ وائس چانسلر نے اس موقعے پر پروفیسر عبیداللہ فہد کی انگریزی کتاب 'قرآنک نیریٹیو آف ملٹی کلچرلزم' پروفیسر محمد یلیین مظہر صدیقی کی حیات و خدمات پر مبنی مجلّہ علوم اسلامیہ کے خصوصی شمارہ، ڈاکٹر عرفان علی کی مرتب کردہ کتاب 'کمپیوٹیشنل ماڈلنگ ان انڈسٹری 4.0۔ اے سسٹینیبل ریسورس مینجمنٹ پرسپیکٹیو'، پروفیسر محمد اشرف، ڈاکٹر محمد اسلم ایس اور دیگر کی تصنیف 'ایڈوانسڈ لینیئر الجبرا وتھ ایپلکیشنز'، پروفیسر سیما صغیر کی حیات و خدمات پر مبنی جریدے 'سیما' اور ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی کی تصنیف 'علی گڑھ اینڈ پروپیگیشن آف سائنس: فرام سرسید ٹو دَ پریزینٹ ڈے' کا بھی اجرا کیا۔

اسباب بغاوت ہند کے سلسلے میں کتاب کے مترجم مسٹر دیا سنگھ پنجابی نے کہا ''میں نے اس کتاب کا ترجمہ پنجابی قارئین کو برطانوی پالیسیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے کیا ہے جن کی وجہ سے بغاوت ہوئی تھی۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی وجوہات کو سرسید نے واضح انداز میں قلمبند کیا تھا۔'' اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا ''امید ہے کہ اسباب بغاوت ہند کا ترجمہ پنجابی قارئین کے لیے نہ صرف بغاوت کے پس پردہ ثقافتی اور سماجی و اقتصادی پہلوؤں کو سمجھنے میں مددگار ہوگا بلکہ سرسید کے وژن اور عقلیت پسند فکر کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی جنھوں نے ہندوستان میں تعلیم کو ایک نئی سمت دی۔''

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 جون 2022

میرے احباب و بزرگ

امروهه: اردو کا فروغ کسی ایک فرد یا قوم کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ سبھی حامیان اردو کو اس کے فروغ و ترویج میں مساوی عملی کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے ان خیالات کا اظہار گزشتہ شام محلّہ بساؤن گنج میں ایم الیاس امروہوی کی کتاب میرے احباب و بزرگ کے اجرا کے موقعے پر بولتے ہوئے مشہور مصنف ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں الیاس امروہوی جیسے لوگوں کی ہر طرح مدد کرنی چاہیے کیونکہ اردو کی ترویج واشاعت تب ہی ممکن ہے جب سبھی مشترکہ طور پر کوشش کریں۔ اس پروگرام میں بولتے ہوئے سید تنویر حسن نقوی

نے کہا کہ الیاس امروہوی نے امروہہ کی ادبی و ثقافتی روایت کے مطابق اپنے بزرگوں کو یاد رکھا جو آنے والی نسلوں کے لیے ایک بیش قیمتی نذرانہ ہے۔ صحافی ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے الیاس امروہوی کی اردو کی خدمات کے بارے میں بتایا کہ انھیں تنقید سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تنقید ان کی ہی ہوتی ہے جو کچھ کرتے ہیں، آج تنقید کے لیے سب کے پاس وقت ہے لیکن تعریف و توصیف کی فرصت کسی کو نہیں ہے، اس لیے وہ اردو کی بےلوث خدمت میں لگے رہیں اس کے دور رس نتائج سے اردو ادب میں اجالا ہوگا۔ انھوں نے کتاب کے اجرا پر نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر شاعر شیبان قادری نے کہا کہ سوشل میڈیا کے اس دور میں کتابوں کی اپنی اہمیت ہے۔ اس موقعے پر ماسٹر محمد عارفین نے الیاس امروہوی کی کتاب پر ایک جامع مقالہ پیش کیا جس میں اس کتاب میں شامل بزرگوں سے متعلق اہم معلومات پیش کی گئی تھی جبکہ مشہور افسانہ نگار محمد رضا نے اس موقعے پر اردو والوں کو مزید متحرک ہوکر خلوص دل سے اس زبان کی خدمت کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اردو کسی بھی مذہب ذات برادری حلقے کی زبان نہیں ہے۔ آخر میں کونسلر نور فیضی نے کتاب کے اجرا پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 جون 2022

خطاطی کی مختصر تاریخ

نئی دهلی: ذکیرالدین ذکی کی تصنیف 'خطاطی کی مختصر تاریخ' کی تقریب اجرا غالب اکادمی نظام الدین میں عمل میں آئی جس کی صدارت سابق سفیر حکومت ہند م افضل نے کی۔ نظامت کے فرائض معروف صحافی سہیل انجم نے انجام دیے۔ کتاب کے بارے میں بتاتے ہوئے ذکیرالدین نے کہا کہ اس کو لکھتے وقت زبان و بیان کا خاص خیال رکھا گیا ہے، تاکہ قارئین آسانی سے سمجھ سکیں، اس کی ترتیب بالکل نئی ہے، اس کتاب کو دیباچہ کے علاوہ 13 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ،جس کا پہلا باب قبل اسلام کے منظرنامے پر مبنی ہے اور آخری باب میں برصغیر ہند و پاک میں خطاطی اور خطاطوں کا ذکر ہے۔ پدم شری پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ اردو، عربی اور فارسی زبانوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے خط کو فنون لطیفہ میں شامل کیا، خطاطی فن لطیف ہے اور کسی دوسری زبان کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہے، مجھے خوشی ہے کہ ذکیرالدین نے ایک ایسے وقت میں یہ کتاب لکھی ہے جب اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے ،میں ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ ذکیرالدین نے ایک ایسے وقت میں فن خطاطی پر کتاب تصنیف کی ہے جب لوگ اس فن کو بھولتے چلے جارہے ہیں۔ یہ ایسا کارنامہ ہے، ،جس کے لیے انھیں بجا طور پر داد دی جانی چاہیے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے م افضل نے کہا کہ میں پچھلے دنوں ایران کے سفر پر گیا تھا، میں نے دیکھا وہاں کے مقامی لوگوں نے فن خطاطی کو زندہ رکھا ہوا ہے اور بہت شوق کے ساتھ وہ لوگ بازاروں میں آویزاں بینر کاتب حضرات سے لکھوانے کا کام کرتے ہیں۔ صحافی سہیل انجم نے ذکیرالدین کی شخصیت اور فن پر خاکہ پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر عقیل احمد اور افضل منگلوری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جون 2022

جذبات وفا

گورکھپور: صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ اور ماہر تعلیم ٹی این شریواستو عرف وفا گورکھپوری کے 22ویں شعری مجموعہ 'جذبات وفا' کا رسم اجرا ہوٹل پرگتی ان وجے چوک میں

عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ جواہرلعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کو 'سپہ سالار اردو ایوارڈ' اترپردیش اردو اکادمی کے چیئرمین چودھری کیف الوریٰ کو 'سرتاج اردو ایوارڈ'، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر مشیر احمد کو 'محمود الٰہی ایوارڈ' شاعر فاروق جائسی کو 'شبنم گورکھپوری' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقعے پر صدارتی کلمات میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ وفا گورکھپوری کے یہاں زبانوں کی ہم آہنگی اور اشتراک نے تلاش و جستجو کی ایک نئی دنیا بنائی ہے۔ فراق کے بعد گورکھپور کی تاریخ میں وفا صاحب کا نام سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کی مستحق ہے۔ مہمان خصوصی چودھری کیف الوریٰ نے کہا کہ ہمارا شہر گورکھپور وفا صاحب جیسے بڑے دل والے قلم کاروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں کی خوبی یہی ہے کہ مسلم شعرا کے ساتھ غیرمسلم شعرا کی تعداد بھی بھرپور ہے۔ مجنوں، فراق، پریم چند کے بعد ایک نمایاں نام وفا گورکھپوری کا ہے۔ مہمان اعزازی سابق میئر ڈاکٹر ستیہ پانڈے نے کہا کہ وفا صاحب نے اس شہر کے ساتھ ہندی اور ادو ادب کو بہت کچھ دیا۔ ان کی شاعری انسانی درد کا آئینہ ہے جس پر اب یونیورسٹی میں ریسرچ ہونا چاہیے۔ پروفیسر مشیر احمد نے کہا کہ وفا صاحب زندگی کی اعلیٰ قدروں کے شاعر و امین ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی اور شفافیت جابجا نظر آتی ہے۔ معروف ناظم مشاعرہ ڈاکٹر کلیم قیصر نے کہا کہ وفا صاحب سے میری قربت کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ اردو کے خادم ہیں اور اس پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں دیکھتا رہتا ہوں اور ضرورت پڑنے پر مفید مشورے بھی دیتا ہوں۔ وہ اردو کے شیدائی ہیں، ان کو سمجھنے اور ان پر لکھنے کی ضرورت ہے۔ فاروق جائسی نے کہا کہ ہمارے کانپور میں غیرمسلم اردو شاعروں کی تعداد بہت ہے مگر اپنی تہذیب کے لیے فنا ہوجانا یہ مجھے یہاں آکر دکھتا ہے۔ میں یاسمین شریف ویلفیئر سوسائٹی کے ذمہ داروں کو مبارکباد پیش کروں گا کہ انھوں نے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا۔ آخر میں سوسائٹی کے رکن ڈاکٹر اشفاق احمد عمر، ڈاکٹر امرناتھ جیسوال، ارشد راہی نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 26 جون 2022

کلیات نسیم

نئی دهلی: غالب اکادمی نئی دہلی میں یوگیندر اپادھیائے نسیم گورکھپوری کی رومن اور دیوناگری میں شائع کلیات نسیم کا اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے تقریب کی صدارت کی، پروفیسر اوم پرکاش سنگھ نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ عقیل احمد نے نسیم گورکھپوری کا تعارف پیش کیا۔ نسیم گورکھپوری نے کہا کہ اردو نہ ہندو کی زبان ہے نہ مسلمان کی زبان ہے، یہ ہندوستان کی زبان ہے۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے جواہرلعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئرمین پرفیسر اوم پرکاش

سنگھ نے کہا کہ رسم الخط پڑھنے کی سہولت دیتا ہے۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں اور بولیاں ہیں۔ پدماوت ملک محمد جائسی نے لکھی، رحیم نے دوہے لکھے، کبیر رحیم بھاشا کے کاریگر نہیں تھے اپنی بات کہتے تھے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ کلیات نسیم میں ہندوستانیت رچی بسی ہے۔ شاعری ادب کی ایک کائنات ہوتی ہے۔ ناول، افسانے میں تخلیق کار موجود ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ کلیات کو بھی باغیچۂ نسیم کہا جاسکتا ہے جو نسیم صاحب کا سرمایہ حیات ہے اس کلیات کی وجہ سے وہ بہت دنوں تک زندہ رہیں گے۔ دویا جین نے کہا کہ نسیم گورکھپوری نے پورے جذبے اور شوق کے ساتھ شاعری کی ہے۔ اشعار میں استعمال ہوئے الفاظ اور خیالات پر ان کی مکمل گرفت ہے۔ آخر میں بزم موسیقی کا انعقاد کیا گیا۔ انوشکا نے غالب کی دو غزلیں پیش کیں اور مدھومیتا بوس نے کلیات نسیم سے غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ بزم موسیقی کی نظامت کشفی شمائل نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 جولائی، 2022

جمال احمد جمال کی تین کتابوں کا اجرا

کامٹی: کامٹی اردو رائٹرس فورم کی جانب سے مورخہ 25/جون 2022 کو شب 9 بجے، ڈاکٹر خلیل اللہ لائبریری کامٹی میں، شہر کے کہنہ مشق شاعر جمال احمد جمال کی تین کتابوں کے اجرا کی شاندار تقریب انعقاد پذیر ہوئی۔ ان کے غزلوں کا مجموعہ 'لفظوں کا گلدان' جسے ان کی صاحب زادی روحینہ پروین نے ترتیب دیا تھا، کا اجرا مولوی روشن جعفری کربلائی نے کیا اور ڈاکٹر پروفیسر نصرت مینو نے مقالہ پیش کیا۔ باقی دو کتابیں بچوں کی نظموں پر مشتمل تھیں جن میں سے کتاب 'پارس' پر مقالہ عامر آفاق نے پڑھا اور اجرا محمد ایوب نے کیا۔ اسی طرح دوسری کتاب کا اجرا ڈاکٹر رفیق اے ایس نے کیا اور مقالہ پروفیسر اسرار احمد نے پیش کیا۔ ان میں سے دو کتابوں 'لفظوں کا گلدان' اور 'کل کا سورج' کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے مالی تعاون فراہم کیا ہے جب کہ تیسری کتاب 'پارس' کو مہاراشٹر اردو اکادمی ممبئی کی مالی مدد حاصل رہی۔

اس جلسے میں معروف محقق و نقاد اور متعدد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر ارشد جمال کا اعزاز کیا گیا۔ کامٹی اردو رائٹرس فورم کی جانب سے انھیں 'نقاشِ ادب' کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ فورم کے نائب صدر محمد ایوب صاحب نے ان کی تنقیدی بصیرت پر روشنی ڈالی۔ صدر فورم ڈاکٹر رفیق اے ایس نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور محمد ایوب صاحب نے شاعر جمال احمد جمال کو تہنیت نامہ پیش کیا۔ مختلف انجمنوں اور تنظیموں نے صاحب کتاب جمال احمد جمال اور صاحب اعزاز ڈاکٹر ارشد جمال کا استقبال کیا اور ان کی خدمت میں ہدیۂ گل پیش کیا۔ جن میں 'اشہر جعفری اکادمی'، 'بزم نیاز انجم' اور 'MMR – 87' گروپ پیش پیش رہے۔ گروپ کی طرف سے شاہد اجمل، ڈاکٹر صادق علی اور طلعت انصاری نے دونوں صاحبان کی خدمت میں یادگاری تختی بھی پیش کی۔ نقی جعفری صاحب نے اپنی شاندار نظامت سے ایک سماں باندھ دیا۔ آخر میں مدیر 'الفاظ ہند' اور فورم کے نائب سکریٹری و مشہور کہانی نگار ریحان کوثر نے مہمانان و شرکا کا شکریہ ادا کر کے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

پریس ریلیز: الفاظ، ہند، کامٹی، مہاراشٹر 28 جون 2022

ادب سلسلہ

وارانسی: اردو کا رسالہ ادب سلسلہ کے خصوصی شمارہ 'نئی نسل نئی فکر' کا اجرا بی ایچ یو کے اردو شعبہ میں کیا گیا۔ اس موقعے پر شعبہ اردو کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ سابقہ شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی معیاری ہے۔ اس کی ترتیب و تنظیم میں مدیر رسالہ نے خاص دلچسپی لی ہے۔ یہ رسالہ اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے۔ اس میں نئی نسل کی تخلیقی و تنقیدی بصیرت، نمائندہ فنکاروں کے علاوہ بعض جدید افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ 'گوشہ ساحر لدھیانوی' کے تحت ساحر کی تخلیقی نگارشات کا بھرپور جائزہ لیا گیا۔ اسی طرح اس میں شامل مضامین، افسانے، غزلیں، اور نظمیں، معاصر تخلیقی رویوں کا علم بہم پہنچاتی ہیں۔ اسی طرح 'یادرفتگاں' کے تحت لکھے گئے مضامین فراغ روہوی اور مشرف عالم ذوقی کی شخصیت اور فن کی مختلف جہتیں کھولتے ہیں۔ اس موقعے پر مدیر سہ ماہی 'ادب سلسلہ' محمد سلیم علیگ نے شعبہ اردو کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اس شعبے نے ادب سلسلہ کو معیاری بنانے میں اور اس کی ترویج واشاعت میں ہمیشہ دلچسپی لی ہے۔ اجرا کے موقعے پر شعبہ کے استاد ڈاکٹر مشرف علی اور دیگر ریسرچ اسکالر محمد سفیان، شمشیر علی، شاہنواز حسرت، محمد اعظم اور محمد عامر کے ساتھ دیگر طلبہ وطالبات بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جون 2022

دل کی گیتا

دیوبند: مہامنڈلیشور سوامی اسنگانند مہاراج کی پچاسویں برسی پر گولڈن جبلی تقریبات کے تحت پندرہ روزہ پروگرام کا انعقاد ہرے رام آشرم ہریدوار میں مہامنڈلیشور سوامی شری 1008 کپل منی مہاراج کی سرپرستی میں منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام کی آخری تقریب کے مہمان خصوصی پاکستان کی سپریم کورٹ کے سابق جج خلیل الرحمٰن رمدے رہے۔ اس موقعے پر مشہور صوفی خواجہ پیر محمد لاہوری مرحوم کی کتاب 'دل کی گیتا' (مقدس کتاب بھاگوت گیتا کا منظوم ترجمہ) کا ہندی زبان میں ترجمہ بذریعہ پنڈت لکشمن داس مہاراج کی رونمائی بدست سابق جج خلیل الرحمٰن رمدے، بابا رام دیو اور سوامی کپل دیو مہاراج کے کے ذریعہ عمل میں آئی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن نے کہا کہ ابتدائے آفرینش سے تمام مذاہب کا کام برائی کا خاتمہ اور سچائی کے ذریعے لوگوں کو خیر کے لیے جوڑنا اور قریب لانا رہا ہے اور یہی کام موجودہ دور میں زیادہ سنجیدگی سے ہونا چاہیے۔ پنڈت لکشمن داس مہاراج (مترجم ہندی) کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ آپ کا کام گیتا کے منظوم ترجمہ کو ہندی قارئین کے لیے عالم انسانیت کو گراں قدر تحفہ ہے جو دو بڑے مذاہب کے درمیان ایک پل کا کام کرے گا۔ یوگ گرو سوامی رام دیو نے بھی اس کتاب کی سراہنا کی اور کہا کہ یہ کتاب روحانی دنیا کے لیے واقعی ایک تحفہ ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 25 جون 2022

کہکشاں

پونہ: مشہور تعلیمی ادارہ اعظم کیمپس یونیورسٹی کے ہائی ٹیک ہال میں مورخہ 26 جون بروز اتوار صبح 11 بجے عادل

پبلیکیشن کے زیراہتمام مشہور ومعروف افسانہ نگار، کالم نویس، مصنف و ڈرامہ نگار ڈاکٹر جی ایم پٹیل کی تصنیف 'کہکشاں' کا شاندار اجرا مشہور ومعروف نقاد، محقق اور کالم نویس شمیم طارق و روزنامہ انقلاب کے مدیر اعلیٰ شاہد لطیف کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر شہر پونہ کی معزز علمی، ادبی، تعلیمی ہستیاں رشید چنیوار، ڈاکٹر انیس الدین شیخ، اطہر قریشی، عظمیٰ ناہید، کوثر جہاں، تنویر احمد، اقبال احمد پٹیل، بزم امدادیہ کے صدر اے آر ڈی خطیب وغیرہ کثیر تعداد میں تشریف فرما تھے۔ رفیق قاضی نے بطور ناظم پروگرام کے اغراض ومقاصد کو اپنے سلجھے ہوئے اور موثر انداز میں پیش کیا۔ رسم رونمائی پر اپنے زریں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے صدر جلسہ شمیم طارق صاحب نے کہا ''ڈاکٹر پٹیل صاحب ایم بی بی ایس کے بعد طبی ڈاکٹر ہیں مگر ادب سے ان کا رشتہ قابل رشک ہے۔ آئی اے ایس، آئی پی ایس میں خصوصی طور سے خواتین کو ترجیح دی ہے جو طالبات اور خواتین کے لیے مشعل راہ ہے۔ مہمان خصوصی مدیر اعلیٰ روزنامہ انقلاب نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''مصنف کی تحریر اور گفتگو سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ قوم کے تئیں بے چین دل رکھتے ہیں جو دوسروں کے لیے تڑپتا ہے۔ پٹیل صاحب سے تعلق خاطر ہے اور کئی برسوں سے ہے اور میری ان سے گفتگو بھی رہتی ہے۔ ان کی تخلیقات کو پڑھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ یہ اپنے ادبی لگاؤ اور اپنی اردو سے محبت کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ بطور طبیب پیشہ کی مصروفیت کے باوجود اردو ادب کی ترقی کے حصہ دار ہیں۔ عادل پبلی کیشن کے مالک جناب کامل کے اظہار تشکر پر جلسہ اختتام پزیر ہوا۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 29 جون 2022

وفیات

ابرار کرتپوری

نئی دہلی: حمد ونعت کے مشہور ومعروف شاعر ابرار کرتپوری کا طویل علالت کے بعد 18 جون کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 84 برس تھی۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ یہ اطلاع

مرحوم کے بھتیجے اور نوجوان شاعر فروغ الاسلام نے دی ہے۔ اطلاع کے مطابق ابرار کرتپوری کئی سال سے صاحب فراش تھے اور ان کو مختلف بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ زود گو شاعر تھے، حمد ونعت ان کا خاص میدان تھا اور اسی میں ایسی انفرادیت پیدا کی جس میں زبان وادب کو ناز رہے گا۔ ابرار مرحوم کے کم از کم پانچ حمدیہ مجموعے مقبول عام ہوئے۔ انھوں نے کئی اصناف سخن میں نعت کہی۔ ان کی تقریباً تین درجن کتابیں ہیں جو اردو دنیا میں اضافہ کہی جاسکتی ہیں۔

مرحوم ضلع بجنور کے قصبہ کرتپور میں واقع محلّہ قاضیان کے رہنے والے تھے۔ مسلم انٹر کالج سے بارہویں جماعت پاس کر کے مقامی میونسپلٹی میں ملازم ہوگئے۔ بعد میں وہ ایک عزیز کے ساتھ دہلی آگئے اور یہیں مزید تعلیم حاصل کر کے دیال سنگھ کالج میں ملازم ہوگئے۔ انھوں نے مکتبہ دانش اور حمد ونعت اکیڈمی کے نام سے دو تنظیمیں بنائی تھیں جن کے ذریعے حمد ونعت کے میدان میں نمایاں کارنامہ انجام دینے والوں اور نئے شاعروں کو ایوارڈ دیا جاتا تھا۔ ان کے انتقال پر معروف صحافی معصوم مرادآبادی نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی زندگی بہت پاکیزگی کے ساتھ گزاری، وہ کسی ایسی علت میں گرفتار نہیں تھے جو عام طور پر شاعروں کو اپنے نرغے میں لے لیتی ہے۔ وہ بہت منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے۔ لہجے اور کردار کی پاکیزگی نے ہی ان کی حمدیہ و نعتیہ شاعری میں سرور پیدا کیا تھا۔ ان کے انتقال سے ایک زبان داں، فن عروض کا ماہر اور قابل ترین و ذہین شاعر ہمارے درمیان سے چلا گیا۔ مشہور ناظم مشاعرہ اور شاعر معین شاداب نے کہا کہ ابرار کرتپوری ان ہستیوں میں تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، انھوں نے ادب میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن پر آنے والے زمانے ناز کریں گے۔ ارشد ندیم نے کہا کہ ابرار صاحب کئی زبانوں کے شاعر تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی، اردو، پنجابی اور ہندی میں بھی شاعری کی۔ وہ بہت سادہ و پرکار شاعر تھے۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہے جنھوں نے ان سے زبان وبیان کی باریکیاں سیکھیں۔

روزنامہ'میرا وطن' دہلی، 19 جون 2022

پروفیسر خورشید سمیع

پٹنہ: معروف ماہر تعلیم اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر خورشید سمیع کا مختصر علالت کے بعد مورخہ 15 جولائی جمعہ کی شام انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ 16 جولائی خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی کے احاطے میں ادا کی گئی۔ مرحوم ایم

آئی ٹی کے پروفیسر تھے۔ آپ نے اردو زبان وادب کی غیر معمولی خدمت کی۔ نئی سمتوں کا شعور، تنقید کے پیچ وخم، اردو ادب نفسیاتی تنقید اور نئی تنقید: ایک جائزہ وغیرہ آپ کی مشہور تخلیقات ہیں۔ ان کی رحلت پر ڈاکٹر اعجاز رسول نے اپنے گہرے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم ڈاکٹر خورشید سمیع کے انتقال سے مجھے ذاتی نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے سائنس اور ادب کی جو غیر معمولی خدمت کی ہے اسے علمی وادبی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔ ڈاکٹر خورشید سمیع کی رحلت پر قومی تنظیم کے مدیر اعلیٰ ایس ایم اشرف فرید، ایڈیٹر ایس ایم طارق فرید، پروفیسر محبوب ظفر، سید ظہور احمد، ارشاد امام، ڈاکٹر جمال سمیع، ڈاکٹر کمال سمیع، اقبال سمیع، ڈاکٹر مریخ، انجینئر ذیشان رسول، سید منور حسین، سید مقصود نظر، ذاکر بخش، فردوس عالم، سید شہباز الحسن اور سید مصباح الحسن کے علاوہ تمام عزیز واقارب نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔

روزنامہ'قومی تنظیم' پٹنہ، 16 جولائی 2022

خالد عابدی

ممبئی: بھوپال سے معروف شاعر اور ناظم بدر واسطی سے ملنے والی اطلاع کے مطابق دور حاضر میں اردو کی مثالی شخصیت 73 سالہ محمد خالد عابدی جنھیں ان کی کتاب دوستی

کے سبب 'بھوپال کا خدا بخش' کہا گیا، آج اس تاریخی شہر میں انتقال کرگئے۔ محمد خالد عابدی بھوپال ہی میں 7 اگست 1947 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم دینی درس سے ہوئی، انھوں نے اندور یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا، بعدہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی زیر نگرانی 'بیسویں صدی میں مکتوباتی ادب' جیسے موضوع پر مرحوم نے پی ایچ ڈی کی تیاری کی۔ کتاب سے ان کا عشق پورے بھوپال میں مشہور ہی نہیں بلکہ مثالی ہے۔ ان کا

'مکتبۂ عابدیہ' محض ایک ذاتی لائبریری نہیں وہ علمی تحقیقی جستجو کے حامل لوگوں کے لیے ایک معروف علمی و تحقیقی مرکز بن گیا ہے۔ محمد خالد عابدی کی پیشہ ورانہ زندگی ریڈیو میں گزری وہ آل انڈیا ریڈیو (بھوپال) میں ایک طویل ملازمت کے بعد مارچ 2010 میں پروگرام ایگزیکٹیو کے منصب سے سبکدوش ہوئے تھے۔ محمد خالد عابدی اپنی فلمی معلومات کے سبب بھی ایک انفراد کے حامل تھے، فلمی موضوع پر ان کی کئی کتابیں طبع ہوچکی ہیں۔

محمد خالد عابدی کی حیات، ان کے فن و ادبی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر رضیہ حامد اور رہبر جونپوری کی ترتیب کردہ ایک ضخیم کتاب 'محمد خالد عابدی: ایک مطالعہ' جو 416 صفحات پر مشتمل ہے، 2007 میں شائع ہوچکی ہے جس میں ان پر برصغیر کے مشاہیر کے تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ محمد خالد عابدی کو بھوپال اور بیرون بھوپال ڈیڑھ درجن سے زائد اداروں نے مختلف اعزامات سے بھی نوازا۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 2010 میں انھیں 'نواب صدیق حسن خاں' ریاستی اعزاز بھی دیا۔ خالد عابدی کی کتاب ریڈیو انٹرویوز مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے شائع کی تھی اور ان کی کتاب 'بازگشت' کے لیے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی جانب سے مالی تعاون بھی دیا گیا۔ ان کے مکتبے کو ہر سال مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی جانب سے مالی تعاون، کتابیں اور رسائل و جرائد بھی دیے جاتے تھے۔ محمد خالد عابدی کی مطبوعہ کتابوں کے نام اس طرح ہیں: آواز نما (ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ)، باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ (ترتیب و تدوین)، پیکر آواز (ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ)، زخموں کے دریچے (افسانوں کا مجموعہ)، شکایتاً عرض ہے (طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)، اردو انٹرویوز (اردو ادیبوں، شاعروں اور فلمی ہستیوں سے مراسلاتی انٹرویوز)، ٹیچر کے بغیر (بچوں کے ڈرامے)، مضامین خالد (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، اردو مراسلاتی انٹرویوز (اردو ادیبوں، شاعروں اور فلمی ہستیوں سے مراسلاتی انٹرویوز)، ہماری فلمیں اور اردو، نقطۂ نوگریز (منی افسانوں کا مجموعہ)، ریڈیو انٹرویوز (مشاہیر سے انٹرویوز)، فلمی انٹرویوز (فلمی ہستیوں سے مراسلاتی انٹرویوز)، نیک کے دو قطرے (بچوں کے لیے ڈراما اور کہانیاں)، مضامین فلم اور بازگشت (اردو انٹرویوز کا مجموعہ) خالد عابدی پر یونیورسٹی سطح پر تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے نیز ماہنامہ شاعر (ممبئی) نے کئی برس قبل ان کا گوشہ شائع کیا تھا۔

ندیم صدیقی ممبئی کی تعزیتی تحریر سے ماخوذ

جمیل نظام آبادی

نظام آباد: شہر میں گزشتہ پانچ چھ دہائیوں سے اردو شاعری، اردو زبان اور صحافت کی شبانہ روز خدمت کرنے والوں میں ایک اہم نام جمیل نظام آبادی کا تھا جن کا انتقال یکم جولائی بروز جمعہ کو ہوا۔ جمیل نظام آبادی ایک استاد شاعر کے علاوہ اچھے صحافی، افسانہ نگار، منتظم اور خادم اردو تھے۔ ان کی ادارت میں گزشتہ 47 سال سے رسالہ گونج پابندی سے شائع ہوتا رہا جس نے کئی نوجوان افسانہ نگاروں، شعرا اور ادیبوں کو ابھرنے

کا موقع دیا۔ جمیل نظام آبادی نے گونج کے رحمت للعالمین نمبر کے علاوہ کئی خاص نمبر جاری کیے اور شعرا کا البم شائع کیا۔ جمیل نظام آبادی ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کے چھ سے زائد شعری مجموعے شائع ہوئے۔ وہ اردو اکادمی مرکز نظام آباد کے نگراں بھی تھے۔ انھوں نے دائرہ ادب کے عنوان سے کئی مشاعرے منعقد کیے۔ گزشتہ چار پانچ سال سے نظام آباد کے ریسرچ اسکالرز کو پروان چڑھانے کے لیے قائم کردہ تنظیم اردو اسکالرس ایسوسی ایشن کی سرپرستی کی اور اجلاس منعقد کرنے میں تعاون کیا۔ جمیل صاحب نے ہر سال مشاعروں میں گونج ادبی ایوارڈ اردو کی نامور شخصیات کو دیے، انھیں حکومت تلنگانہ کی جانب سے ضلعی و ریاستی سطح پر کارنامہ حیات ایوارڈ عطا کیا گیا تھا۔

روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد، 2 جولائی 2022

پروین راجہ

کشمیر: کشمیر کی مشہور شاعرہ پروین راجہ کا 20 جون 2022 کو انتقال ہوگیا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھوں نے شعرگوئی کا آغاز کیا تھا اور مقتدر رسائل میں ان کی شعری تخلیقات شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ان کی شاعری میں تانیثی شعور کے ساتھ

ساتھ احتجاجی لے بھی ہے۔ پروین راجہ کی پیدائش 1956 میں سری نگر بٹا مالو باراں پتھر میں ہوئی۔ گورنمنٹ گرلس ہائی اسکول بٹا مالو سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ زنانہ کالج ایم اے روڈ سے انٹر اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ ان کی ملازمت محکمہ فائنانس میں تھی۔ انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے فاصلاتی طرزِ تعلیم کے تحت اردو میں ماسٹرس کی ڈگری حاصل کی۔ یہ بہ حیثیت اسسٹنٹ اکاؤنٹس آفیسر 2016 میں سبکدوش ہوئیں۔ ان کا شمار کشمیر کی معتبر شاعرات میں ہوتا تھا۔

روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' اور دیگر ذرائع سے 21 جون 2022

عبداللہ عثمانی

دیوبند: معروف ادیب و مشہور قلمکار اور اردو ٹیچر عبداللہ عثمانی کا گزشتہ شب محلّہ گدی واڑہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 52 سال کے تھے اور دیوبند بالک میں پرائمری اسکول میں ٹیچر تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف عبداللہ عثمانی کے ملک کے اکثر اخبارات میں

تحقیقاتی اور معلوماتی مضامین شائع ہوتے تھے، مرحوم شخصیات پر لکھنے میں خاص مہارت رکھتے تھے اور انھوں نے دیوبند کی متعدد شخصیات کو عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ مختلف عنوان پر تقریباً پانچ سو کے قریب مضامین عبداللہ عثمانی نے تحریر کیے جو ملک کے قومی سطح کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان کی چند مشاہیر، چند شخصیات اور چند نامور نامی کتابیں علمی اور ادبی حلقوں میں خوب پسند کی گئیں، مزید تین کتابوں پر کام چل رہا تھا۔ مرحوم اردو کی ترویج و ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے اور اکابرین دیوبند کی خدمات کے حوالہ سے درجنوں مضامین انھوں نے تحریر کیے ہیں، کتابوں کا بے پناہ شوق تھا اور گھر میں باضابطہ ایک لائبریری بنا رکھی تھی، جس میں نادر و نایاب کتب موجود ہیں۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ نماز جنازہ صبح دس بجے احاطہ مولسری میں دارالعلوم دیوبند کے استاذ مفتی سید سلمان منصور پوری نے ادا کرائی بعد ازاں قاسمی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ شہر کی سماجی، سیاسی، ادبی، صحافتی حلقوں سمیت

سرکردہ شخصیات اور اساتذہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ مرحوم کے انتقال پر دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم مولانا عبدالخالق مدراسی اور مفتی محمد راشد اعظمی نے مرحوم گھر پہنچ کر اہل خانہ سے تعزیت مسنونہ کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 19 جون 2022

ماسٹر ابن الحسن

دیوبند: روڑکی گورنمنٹ کالج کے مشہور و معروف استاذ ماسٹر ابن الحسن کا 95 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مرحوم نے اپنے گھر پر ہی اردو اور آرٹ کی مفت تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ ان کی تعلیمی خدمات آخری سانسوں تک جاری رہیں۔ وہ بہت سادہ مزاج، خدمت گزار اور خوش گفتار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے انتقال پر روڑکی اور قرب و جوار کے لوگوں نے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ اتراکھنڈ ٹیچر ایسوسی ایشن کے صوبائی صدر ڈاکٹر انل شرما نے کہا کہ ماسٹر ابن الحسن کی شخصیت سب سے جدا تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے آرٹ اور پینٹنگ کو صرف صوبے میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں قدر کی نگاہ دیکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر انل شرما نے بتایا کہ ان کا بنایا ہوا ہندوستان اور دنیا کا نقشہ آج بھی گورنمنٹ کالج روڑکی میں موجود ہے جو ان کی خدمات اور شخصیت کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ روڑکی کارپوریشن کے میئر گورو گوئل نے کہا کہ ماسٹر ابن الحسن کی شخصیت ایک سورج کی مانند تھی جس کی روشنی سے لاکھوں لوگ بلاتفریق مذہب وملت فیضیاب ہوئے۔ منگلور کے سابق ایم ایل اے قاضی نظام الدین نے ماسٹر ابن الحسن کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ان جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کے انتقال سے تعلیم کے میدان میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے جو تعلیمی اداروں کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ ماسٹر ابن حسن مرحوم کے صاحبزادے شکیل احمد صدیقی نے بتایا کہ بحیثیت ٹیچر ان کے والد کی پہلی پوسٹنگ جوالاپور میں ہوئی۔ بعدازاں 1964 میں ان کا تقرر بحیثیت ٹیچر روڑکی کے گورنمنٹ کالج میں ہوا جہاں وہ 1987 تک آرٹ اور اردو کے استاذ کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آخری سانسوں تک روڑکی میں ہی قیام پذیر رہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 23 جون 2022

ایم ایل گرگ

نئی دھلی: اردو ہندی کے مخلص قلمکار مشہور و معروف شاعر جناب ایم ایل گرگ کا طویل علالت کے بعد فرید آباد میں انتقال ہوگیا۔ وہ ایک طویل عرصہ سے کینسر سے متاثر تھے۔ وہ ایک زندہ دل انسان تھے اور تقریباً 22 کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی آخری رسومات ٹھہری پلیا اولڈ فرید آباد میں ادا کی گئیں جس میں بڑی تعداد میں اردو اور ہندی کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ دہلی اور ہریانہ کی اردو اور ہندی کی ادبی انجمنوں نے ایم ایل گرگ کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 24 جون 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شریمد بھگوت گیتا

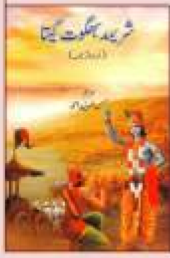

مترجم: حسن الدین احمد

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 105

قیمت 80 روپے

دارا شکوہ: آثار و افکار

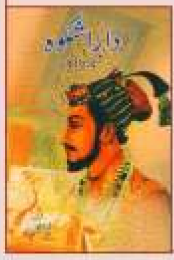

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 234

قیمت: 150 روپے

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 182

قیمت: 110 روپے

شاد عظیم آبادی

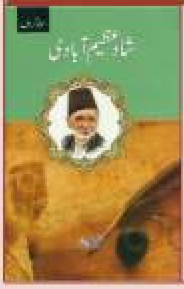

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 156

قیمت: 95 روپے

الف لیلہ و لیلہ (جلد اوّل تا ہفتم)

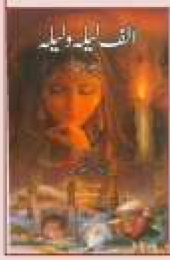

مترجم: ابوالحسن منصور احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 368 (جلد اوّل)، 455 (دوم) 429 (سوم)، 347 (چہارم)، 314 پنجم 313 (ششم)، 223 (ہفتم)

قیمت 1185 روپے (مکمل سیٹ)

اصول طب

مصنف: سید کمال الدین حسین ہمدانی

ساتویں طباعت: 2022

صفحات: 598

قیمت: 160 روپے

کلاسیکی اور عصری سماجیاتی نظریے

مصنف: عذرا عابدی

پہلی اشاعت:: 2021

صفحات: 446

قیمت: 205 روپے

خلجی خاندان

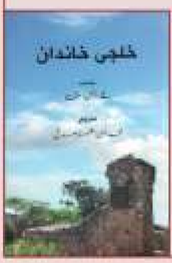

مصنف: کے ایس لال

مترجم: محمد یٰسین مظہر صدیقی

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 481، قیمت: 220 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अगस्त-२०२२,वर्ष:२४, अंक:८
URDU DUNIYA Monthly, August-2022, Vol.24, Issue:08
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/07/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

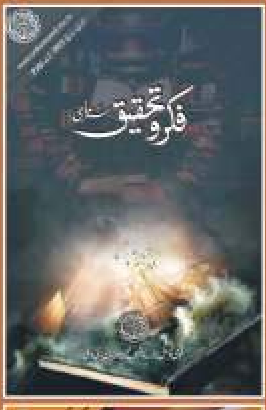

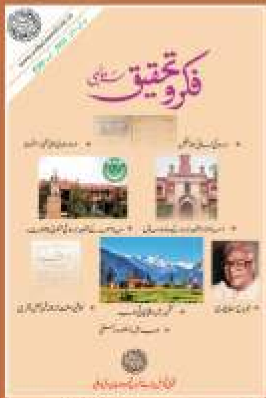

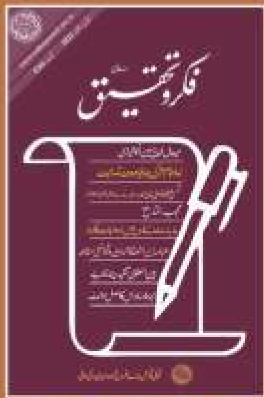

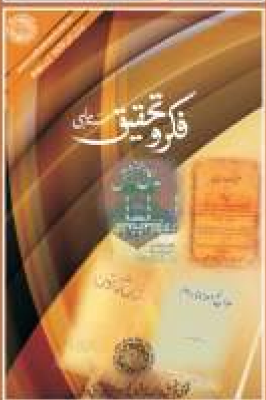

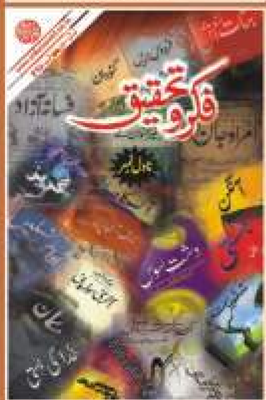

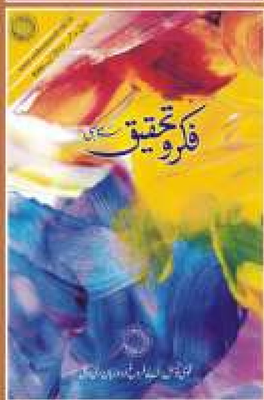

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in
شاخ : 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6